ما شاء الله لا قوة الا بالله

اصول تفسیر

از

مولانا محمد مالک

شیخ الحدیث دار العلوم ٹنڈو الہ یار۔

قرآن مجید اللہ کا نور اور کتاب ہدایت ہے اور یہی کتاب مقدس تمام دنیا کے لئے نظام حیات ہے اصول تفسیر اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ تالیف ہے جس میں اصول و قواعد تفسیر نہایت تحقیق و جستجو اور تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

قرآن محل ناشران و تاجران کتب مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

قال اللہ تعالیٰ

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (حم السجدہ)

اور بے شک یہ قرآن کریم ایک نہایت ہی بلند پایہ کتاب ہے کہ نہیں آ سکتا ہے باطل اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے نازل کی ہوئی ہے اس پروردگار کی طرف سے جو بڑی حکمتوں والا اور قابل ستائش ہے۔

قرآن کریم کی حقیقی عظمتوں اس کے مقاصد اعجاز و بلاغت اور اصول تفسیر کیلئے

رہنما کتاب

التحریر

فی

اصول التفسیر

از

حضرت مولانا محمد مالک شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار

باہتمام

محمد سعید اینڈ سنز

ناشر

قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

فہرست مضامین التحریر فی اصول التفسیر

باہتمام ——— محمد سعید اینڈ سنز

ناشر ——— قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی ۱

طابع ——— مطبع سعیدی۔ قرآن محل کراچی

قیمت ——— چھ روپے

تقاریظ

کلمات مبارکہ عالم ربانی استاذ المحدثین والمفسرین شیخ الحدیث حضرۃ مولانا ظفر احمد العثمانی التھانوی

متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ آمین

بعد الحمد والصلوٰۃ بندہ نے رسالہ مبارکہ "التحریر فی اصول التفسیر" کا مسودہ مقامات متفرقہ سے دیکھا جو میرے عزیز محترم مولانا **محمد مالک** صاحب مدرس دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد ٹنڈو الہ یار نے بڑی تحقیق اور محنت سے تالیف کیا ہے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا موصوف الولد سر لابیہ کا مصداق ہیں اور علوم قرآن وحدیث سے ان کو اپنے والد محترم مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور کی طرح خاص مناسبت ہے امید ہے کہ طالبانِ تحقیق اس رسالہ کے مطالعہ سے محظوظ و مسرور ہوں گے اور یہ رسالہ اس باب میں کافی وافی شافی ثابت ہوگا۔

اس زمانہ میں جبکہ ہر کس و ناکس علوم قرآن و حدیث میں اجتہاد کا مدعی ہے ایسے رسالہ کی بہت ضرورت تھی جو اصول تفسیر اور شرائط مفسر کو کھول کر بیان کر دے اس رسالہ کے مطالعہ سے علماء و طلبہ عربیہ کو تو فائدہ خاص ہو ہی گا۔ عام مسلمان بھی انشاء اللہ اس سے مستفید ہونگے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی عمر و صلاح و فلاح میں برکت مزید عطا فرمائیں اور اس تالیف کو مقبول و نافع خاص و عام بنائیں آمین۔

احقر **ظفر احمد** عثمانی عفا اللہ عنہ

۲۰ شوال ۱۳۸۰ھ

جامع الکمالات منبع الحسنات امام المتکلمین سید المفسرین والمحدثین حضرت العلامہ مولانا الحاج محمد ادریس صاحب کاندھلوی ادام فیوضہم

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم —— نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد مقدمہ تفسیر مؤلفہ عزیز القدر لخت جگرم مولوی حافظ محمد مالک سلمہ، مدرس دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار دیکھا جس کے دیکھنے سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوا بحمدہ تعالیٰ تفسیر اتقان کے اہم مباحث اور قرآن کریم کے متعلق ضروری افادات اور ہدایات پر مشتمل ہے اور دیگر اکابر مفسرین و محدثین کے افاضات اور افادات کو حاوی ہے۔ اور پھر مؤلف سلمہ کے خداداد ملکہ حسن تعبیر و تقریر و تحبیر نے جو ان مشکل مباحث کو دلپذیر بنا دیا ہے وہ مزید برآں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان. علم قرآن کے بعد حسن بیان کی نعمت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ خدا کی رحمت سے امید ہے کہ مقدمہ مذکورہ علوم قرآن اور حسن بیان دونوں ہی کا جامع ہو گا عیاں راچہ بیاں۔ حق تعالیٰ شانہ سے بصد عجز و نیاز یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تالیف مذکور کو قبول فرمائے اور مولف سلمہ اور اہل اسلام کے لئے اسکو موجب ہدایت و بصیرت بنائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

بندہ ناچیز **محمد ادریس** کان اللہ لہٗ

۶ صفر الخیر ۱۳۸۳ھ جامعہ اشرفیہ لاہور

حرفِ اوّل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

کائنات میں انسان کی ہستی سب سے زیادہ شرف اور فضیلت کے ساتھ سرفراز کی گئی ہے ۔ پروردگار عالم نے اس کے واسطے پیکر جسمانی ہی احسن تقویم مقدر فرمایا اور اسی احسن تقویم کے لباس میں نوع انسانی عالم میں جلوہ گر ہوئی جیسا کہ ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

یقیناً پیدا کیا ہے ہم نے انسان کو ایک بہترین مکمل صورت میں

اسی حد تک نہیں بلکہ فرمادیا گیا کہ نوع انسانی تمام کائنات کے لئے مقصد تخلیق ہے کہ موجودات میں ہر شے اسی کے واسطے پیدا کی گئی ۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا

(بقرہ)

وہی (ذات خداوندی ہے) جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے ہر اس چیز کو جو زمین میں ہے ۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي
الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ
وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ وَإِنْ
تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ

اللہ ہی کی ذات ہے جس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور برسایا آسمان سے پانی پھر اس کے ذریعہ پیدا کئے اللہ نے پھل رزق بنا کر تمہارے واسطے ۔ اور تابع کر دیا تمہارے لئے کشتیوں کو جو سمندر میں چلتی رہتی ہیں اللہ کے حکم سے اور مسخر کر دیا اللہ نے تمہارے لئے نہروں کو اور کام میں لگا دیا تمہارے لئے اللہ نے سورج اور چاند کو جو ایک نظام معین کے ساتھ برابر چل رہے ہیں اور مسخر کر دیا

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ (ابراہیم) تمہارے لئے رات اور دن کو اور دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے اللہ سے مانگی اور اگر گننے لگو تم اللہ کی نعمتوں کو تو (ہرگز) تم ان کا احاطہ کر سکو گے بیشک انسان بڑا ہی ناانصاف اور (اپنے رب کا) ناشکرا ہے۔

یعنی یہ تمام مخلوقات انسانی تدبیر اور تصرف کے تابع کر دی گئیں کہ وہ اپنے فہم اور ارادہ سے ان پر جیسا چاہتا ہے حکمرانی کرتا ہے اور ان کے منافع سے متمتع ہوتا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" میں انسان کی اسی سیادت اور فضیلت و برتری کا اعلان ہے۔

ادنیٰ غور و فکر سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ انسان کی برتری اور فضیلت صرف اس کے ظاہری پیکر کی خوبصورتی قد و قامت کی زیبائش اعضاء کے بہترین تناسب اور اس کی صورت و شکل کے حسن و جمال کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس نوع کی خوبیاں تو قدر مشترک انفرادی اور جزوی طور پر دوسرے حیوانات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مشاہدہ ہے کہ بعض حیوان دوسرے بعض حیوان سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں کسی کی گردن اور آنکھ حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی تو کوئی جسمانی نزاکت و لطافت میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ کسی کی آواز مسحور کن نغموں کو شرماتی ہے تو کسی کی جلد کی نرمی اور خوبی کے سامنے ریشم بھی ہیچ ہے۔ تو اگر انسانی کرامت اور برتری صرف اسی حد تک محدود ہوتی تو انسان بھی درحقیقت ایک خوبصورت یا سب سے زیادہ خوبصورت جانور ہی کی حیثیت سے بہتر اور قابل قدر سمجھا جا سکتا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں! بلکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی کرامت اور برتری کا حقیقی معیار اس کے وہ معنوی کمالات اور خوبیاں ہیں جن کے واسطے اللہ نے اس کو پیدا کیا۔ احسن تقویم کے ساتھ احسن خُلق کی مطابقت ہی انسان کو اشرف المخلوقات کا مصداق بناتی ہے اور خَلق و خُلق کی عدم مطابقت اس کو اعلیٰ علیین پر پہنچانے کے بجائے مقام اسفل السافلین میں گرا ڈالتی ہے جس کے بعد اس کا درجہ مخلوقات میں اشرف اور افضل ہونے کے بعد ارذل اور بدتر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ معنوی کمالات کے فقدان اور روحانی دناءت و کمینہ پن کی وجہ سے حیوانوں سے بھی بدتر شمار ہونے لگتا ہے۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ... ان کی تمام طرز زندگی اور خورد و نوش بھیمانہ زندگی کے لوازم قرار پاتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ۔

اور جو لوگ کافر ہیں وہ دنیوی منافع سے نفع اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں اس طرح جیسا کہ چوپائے کھاتے ہوں۔

غرض خَلق اور خُلق کی یکسانیت و مطابقت انسان کا حقیقی کمال ہے۔ امت کو اسی کی تعلیم دینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیہ کلمات میں یہ لفظ بھی وارد ہوئے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ

اے اللہ تو نے میرا ظاہری پیکر بہت اچھا بنایا ہے پس تو اسی طرح مرے باطنی خلق (عادات و خصائل) کو بھی حسین و پاکیزہ بنا دے۔

انسان کا دوسری مخلوقات سے امتیاز جس طرح صرف ظاہری خوبی اور زیبائش سے نہیں ہے اسی طرح ادراک حسی اور اس کا کمال بھی انسان کو حیوان پر برتری نہیں بخش سکتا کیونکہ مُدرِکات حسیہ میں حیوان بھی کسی نہ کسی حد تک نوعِ انسانی کے ساتھ شرکت رکھتا ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ انسانی کمال اور امتیاز صرف روحانی اور باطنی کمالات ہیں مضمر ہے۔

امام بیہقی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت تخریج کی ہے۔

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ قَالَ لَہٗ قُمْ فَقَامَ ثُمَّ قَالَ لَہٗ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ ثُمَّ قَالَ لَہٗ اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَہٗ اُقْعُدْ فَقَعَدَ ثُمَّ قَالَ لَہٗ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا ھُوَ خَیْرٌ مِّنْکَ وَلَا اَفْضَلَ مِنْکَ وَلَا اَحْسَنَ مِنْکَ۔ بِکَ اٰخُذُ وَبِکَ اُعْطِیْ وَبِکَ اُعْرَفُ وَبِکَ اُعَاتِبُ وَبِکَ الثَّوَابُ وَعَلَیْکَ الْعِقَابُ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالے نے جب عقل کو پیدا فرمایا تو اس کو خطاب فرمایا کھڑی ہو جا تو وہ کھڑی ہو گئی پھر اس کو فرمایا پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی پھر اس کو فرمایا آگے بڑھ تو وہ آگے بڑھ گئی پھر اس کو فرمایا بیٹھ جا تو وہ بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس سے فرمایا کہ نہیں پیدا کی میں نے کوئی مخلوق ایسی جو تجھ سے زیادہ خیر ہو اور نہ ایسی کہ جو تجھ سے زیادہ افضل ہو اور نہ ایسی کہ جو تجھ سے زیادہ خوبی والی ہو۔ اے عقل تیری ہی وجہ سے میں مواخذہ بھی کروں گا اور تیری ہی بدولت اپنی عطایئں عطا کروں گا۔ اور تیرے ہی ذریعہ میں پہچانا جاؤں گا، اور تیری ہی وجہ سے میں عتاب کروں گا اور تیری ہی وجہ سے ثواب ہے اور تجھ ہی پر عتاب ہے۔

اس حدیث میں انسان کی عملی زندگی کے ان چار پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے جو بالعموم اس میں پائے جاتے ہیں

ے حدیث کی اسنادی بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ اس کی سند پر اگرچہ بعض محدثین نے کلام کیا ہے۔ لیکن چونکہ دوسری صحیح الاسناد روایات کے مضمون کے عین مطابق حدیث مذکور کا مضمون ہے اس لئے اصولی طور پر قابل قبول ہونے میں کوئی تردد نہیں۔

کسی کام کی طرف رغبت اور کسی سے نفرت کسی کی جانب پیش قدمی اور کسی سے اجتناب و پرہیز۔ غرض یہ تمام عملی پہلو عقل انسانی اور اس کے تصرف کے تابع ہیں اسی مرحلہ سے ہدایت و گمراہی کی دو راہیں بٹ جاتی ہیں اگر ان جذبات کا مصرف اور رُخ صحیح ہے تو انسان کے یہ عملی پہلو اس کو فلاح و سعادت کی طرف لے چلیں گے اور اگر رُخ غلط ہے تو پھر اس کا منتہائے جدوجہد شقاوت و بدبختی ہے تو اس مرحلہ پر ضرورت داعی ہوئی کہ عقل کی رہنمائی کے لئے صحیح علم اور ہدایتِ خداوندی کی روشنی حاصل ہو۔ تاکہ وہ انسانیت کے صحیح مقام کو پہچانے اور مقصد انسانیت کے حصول اور اس کی تکمیل کی استعداد و صلاحیت حاصل کر سکے۔

عقلاً یہ بات ممکن نہیں کہ انسانوں کے فوز و فلاح کے امور انہی کے مدرکات اور عقول کے حوالہ کر دیئے جائیں اس لئے کہ عقلاء کے انظار و افکار کا اختلاف دنیا میں محتاج بیان نہیں۔ ایک ہی فعل ایک شخص مستحسن سمجھتا ہے اور اس کی خوبی پر دلیل و برہان پیش کرتا ہے اور دوسرا اسی فعل کے قبیح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کے لئے دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ نوع انسانی کا تمام دینی اور دنیوی نظام خود ان کی عقلوں کے حوالہ کر دیا جاتا جن کا باہمی تصادم اور کشمکش ہمہ وقت جاری ہے تو حق تعالےٰ شانہ، نے انسانی عقول کی صحیح اور کامل رہنمائی کے لئے اپنی طرف سے ایک نور کامل عظیم الشان ہدایت اور کتاب مبین اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرما دی تاکہ اس کی روشنی میں انسان انسانیت کے صحیح مقام کو پہچان لے۔ انسانی اور حیوانی شہوانی اور روحانی زندگی میں امتیاز محسوس کر لے۔ اور مقصد انسانیت کی تکمیل اور تکمیل اس کے لئے ممکن ہو دنیوی زندگی بھی خیر و رحمت اور عافیت و راحت بن جائے اور آخرت میں دائمی نعمتوں راحتوں اور رضائے خداوندی کا مستحق بنے

دین و دنیا کے لئے یہ جامع ہدایت اور نور کامل "قرآن مجید" ہے

جسکی تعلیم و تفہیم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے واسطے سراپا "رحمت" بنا کر مبعوث فرمائے گئے آپ نے اس کتاب الٰہی کی طرف تمام دنیا کے انسانوں کو اس عنوان سے دعوت دی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔

اے لوگو! آچکا تمہارے پاس ایک پیغام نصیحت تمہارے رب کی جانب سے اور شفا ان تمام عیوب اور امراض کے لئے جو سینوں میں ہوں اور بڑی عظیم ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے واسطے۔

اور بتا دیا گیا کہ دنیا اور آخرت میں سربلندی اور ہر نوع کی عزت سب اسی کتاب الٰہی کی بدولت ہے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے برسر منبر لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا۔

اما انّ نبیّکم صلے اللہ علیہ وسلم قد قال

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع

بہ آخرین۔

کہ اے لوگو! آگاہ ہوجاؤ بے شک تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یقیناً اللہ تعالےٰ سربلند فرماتا ہے اس کتاب کی بدولت بہت سی قوموں کو اور دوسری بہت سی قوموں کو اسی کی وجہ سے (جبکہ وہ اس کو نہ سیکھیں اور نہ اس پر عمل کریں) ذلیل و خوار اور پست ...... کر دیتا ہے۔

پیش نظر کتاب "التحریر فی اصول التفسیر" میں چند اہم مباحث اور ایسے اصول پیش کئے جا رہے ہیں جن سے ان شاء اللہ تعالےٰ اہل اسلام قرآن کریم کی حقیقی عظمت کو پہچان سکیں گے۔ اور یہ معلوم کر سکیں گے کہ کتاب اللہ کے علوم و معارف سے کیونکر استفادہ کیا جا سکتا ہے اور علوم الٰہیہ کی صحیح ترجمانی کس طرح ہے۔ اور ان کے ذریعہ کس طرح انسان اپنے اعتقاد و عمل معاشرت اخلاق اور معاملات کی اصلاح کر کے سعادت عظمیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی جان لیں گے کہ کونسے اسباب اور طریقے ایسے ہیں جن کے ذریعہ علوم الٰہیہ کی حقانیت اور کتاب الٰہی کے وصف خصوصی الفرقان (یعنی حق اور باطل کے درمیان فرق کر دینے والی کتاب) کو اوہام و شکوک اور باطل نظریات کی گندگی سے آلودہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ خواہشات نفسانیہ کی راہوں میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوسکے۔

اس مقصد کے لئے ناچیز نے چند اصول تفسیر اور فہم قرآن کے کچھ بنیادی قواعد اختصار کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔ ما استطعت وما توفیقی اِلّا باللہ۔

حق تعالےٰ شانہ اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرمائے۔ ناچیز اور حضرات اہل علم اور تمام مسلمانوں کے لئے نافع بنائے۔ اور اپنی رضا و خوشنودی کا ذریعہ بنائے

بضاعت نیا وردم الا امید

خدایا زعفوم مکن نا امید

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ

حصۂ اوّل

فضائل قرآن کریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ کلمات سے یہ بات معلوم ہو چکی کہ قرآن کریم اللہ کا کلام اور وہ مقدس کتاب ہے جو نوعِ انسانی کے جملہ کمالات علمیہ وعملیہ کے لئے ضامن ومتکفل اور حاوی ومشتمل ہے۔ حکمتِ عملیہ ونظریہ کے ان اصول کیطرف یہ کتاب الٰہی رہنمائی کرتی ہے جہاں تک نہ حواس کی رسائی ہے نہ مُدرکات عقلیہ وفکریہ کی پرواز ہے اور نہ وہاں تک فلاسفہ وحکماء کا فلسفہ وسائنس پہنچ سکتا ہے۔ انسانی سعادت کے جملہ علوم حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن میں جمع فرما دئے ہیں۔ طہارت سے لیکر تہذیب اخلاق، عبادت، معاملات، تمدن ومعاشرت، سیاست مملکت اور تزکیۂ نفوس تک تمام اسرار وحقائق اس طرح بیان فرما دیے گئے کہ ذرّہ برابر بھی وہم کی آمیزش نہ رہی۔

عالم دنیا میں جو گروہ (امت محمدیہ) یہ وحی ربّانی اور مقدس کتاب عطا کرنیکے واسطے منتخب کیا گیا یقیناً وہ بڑا ہی خوش نصیب اور سعادت مند گروہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۔

پھر وارث بنایا ہم نے (اپنی) کتاب کا ان لوگوں کو جن کو چھانٹ لیا ہم نے اپنے تمام، بندوں میں سے۔ (اب) اس کے بعد کچھ لوگ تو (ان وارثین میں سے) اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں (اس کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اور کچھ ان میں سے میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں اور کچھ ان میں سے خیر (فلاح وسعادت) کے کاموں میں سبقت لیجانے والے ہیں اللہ کے حکم سے (اور) یہی تو بس بڑی فضیلت (وکامیابی) ہے۔

معلوم ہوا کہ جن افراد کو اس انعام الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا وہ نوعِ بنی آدم میں برگزیدہ اور منتخب افراد ہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَۃُ الْقُرْاٰنِ عَنْ عثمان رضی اللہُ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ صلی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ۔ لہ

میری امت کے برگزیدہ اور معزز افراد حاملین قرآن ہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اے لوگو!) تم میں کا بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور اسے سکھائے۔

مسند دارمی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ قرء طٰہٰ ولیٰسٓ قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بالف عام فلما سمعت الملائکۃ القرآن قالت طوبیٰ لِاُمَّۃٍ یَنْزِلُ ھٰذا علیھا وطوبیٰ لاجواف تحمل ھٰذا وطوبیٰ لالسنۃ تتکلم بھٰذا۔ ٢ہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ رب العزت نے تلاوت فرمائی (جس طرح بھی اس کی شان کے لائق ہو) سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسٓ آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے سے (بھی) ایک ہزار سال قبل تو فرشتوں نے جب قرآن کریم سنا تو (بے خود ہوکر) کہنے لگے۔ مبارکباد ی ہے اس امت کیلئے جس پر یہ (کلام الٰہی) اترے گا اور مبارک ہیں وہ سینے جو اس کو (اپنے میں) محفوظ رکھیں گے۔ اور مبارک ہیں وہ زبانیں جو اس (کلام الٰہی) کے ساتھ بولیں گے۔

سلف صالحین اور علماء امت نے فضائل قرآن کے بیان کی طرف بڑا ہی اعتناء فرمایا اور اہتمام و خصوصیت سے اس موضوع پر مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔ شیخ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ ابوبکر ابن ابی شیبہ، امام نسائی، ابوعبید القاسم بن سلام، ابن الفریس اور دوسرے ائمۂ حدیث و تفسیر نے فضائل قرآن میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔

پیش نظر چند اوراق میں ان کا استیعاب یا تفصیل مشکل ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حارث اعور کی سند سے جو حدیث تخریج کی ہے اس کا ذکر کر دینا کافی ہے جو قرآن کے مختلف انواع اور وجوہ فضیلت کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کر رہی ہے۔

عَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ قَالَ مَرَرْتُ فِی الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ یَخُوْضُوْنَ فِی الْاَحَادِیْثِ فَدَخَلْتُ عَلٰی عَلِیٍّ رضی اللہُ عنہ فَاَخْبَرْتُہٗ فَقَالَ اَوَ قَدْ فَعَلُوْھَا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنِّیْ

حارث اعور بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں سے گذرا تو ناگہاں (دیکھا) لوگوں کو دیکھا کہ وہ منہمک ہیں کچھ (دنیوی) قصوں میں (اور ان ہی میں دلچسپی لے رہے ہیں) تو میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان کو اس صورت حال

لہ صحیح بخاری باب فضائل القرآن۔ ٢ہ مسند دارمی بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح باب فضائل القرآن۔

سمعتُ رسول الله صلے الله علیه وسلم یقولُ
الا انها ستکونُ فتنةٌ قلتُ ما المخرجُ منها
یا رسول الله قال کتابُ الله فیه نبأ ما قبلکم
وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم ھو الفصل
لیس بالھزل من ترکه من جبار قصمه الله
ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضله الله وھو
حبل الله المتین وھو الذکر الحکیم وھو
الصراط المستقیم ھو الذی لا تزیغ به
الاھواء ولا تلتبس به الالسنة ولا
یشبع منه العلماء ولا یخلق عن کثرة الرد
ولا ینقضی عجائبه۔ ھو الذی لم تنته
الجن اذ سمعته حتی قالوا انا سمعنا قرانا
عجبا یھدی الی الرشد فامنا به۔
من قال به صدق۔ ومن عمل به اجر ومن
حکم به عدل ومن دعا الیه ھدی
الی صراط مستقیم۔[۱]

سے آگاہ کیا تو فرمانے لگے کہ کیا وہ لوگ اس کے مرتکب ہو چکے ہیں میں نے عرض کیا جی ہاں! یہ سنکر فرمانے لگے آگاہ ہو جاؤ یقیناً میں نے سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ فرماتے تھے خبردار ہو جاؤ بے شک عنقریب رونما ہوگا عظیم فتنہ۔ میں نے عرض کیا (تو) کیا صورت ہوگی اس سے نجات پانے کی یا رسول اللہ۔ آپ نے ارشاد فرمایا کتاب اللہ کی پیروی جس میں خبریں ہیں تم سے پہلے والوں کی بھی اور احوال بھی ان کے بھی جو تم سے بعد والے ہیں اور (یہ کتاب الٰہی) فیصلہ ہے تمھارے درمیان (ہر معاملہ اور خصومت کیلئے) ایک قانون محکم ہے۔ نہیں ہے (یہ کتاب الٰہی) کوئی شی لغو اور مذاق جو شخص چھوڑے گا اس کو قساوت (قلبی اور تکبر) کی وجہ سے حق تعالےٰ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا اور جو شخص تلاش کرے گا ہدایت اس کے سوا کسی دوسری چیز میں اللہ اس کو گمراہ کردے گا اور یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے اور یہی اللہ کا محکم ذکر (و بیان) ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے یہ (قرآن اللہ کی) وہ ہدایت ہے کہ لوگوں کی خواہشات اس کو ٹیڑھا نہیں کرسکتیں (یا لوگوں کی خواہشات اس کی پیروی کرتے ہوئے بے راہ نہیں ہوسکتیں) اور نہ زبانیں اسکو ملتبس کرسکتی ہیں (کہ حق اور باطل کے درمیان امتیاز نہ رہے یا زبانیں قرآن کریم کا تکلم اور تلفظ کرنے کی صورت میں ملتبس نہیں ہوسکتیں کہ یہ نہ معلوم ہوسکے کہ یہ زبان حق بول رہی ہے یا باطل کا تلفظ کر رہی ہے بلکہ جو زبان ناطق ہے بمطابق قرآن وہ حق ہی ہے۔) اور نہ علماء اس سے سیر ہوسکتے ہیں۔ اور نہ وہ پرانا و بوسیدہ ہوسکتا ہے بار بار پڑھتے رہنے سے (بلکہ جس قدر کثرت سے پڑھا جائے گا ہر مرتبہ ایک نیا مزہ ارباب ذوق کو محسوس ہوتا ہوگا) اور نہ ہی اس کے عجائب (حقائق و معارف) ختم ہوں گے۔ یہ (قرآن) تو (اللہ کا) وہ (کلام) ہے کہ نہ باز رہے جن جبکہ سنا انھوں نے اس کو یہاں تک کہ بول اٹھے۔ بے شک سنا ہے ہم نے قرآن عجیب (جس کی فصاحت و بلاغت خوبی مضامین اور بلندی حقائق انسان کو حیرت و تعجب میں ڈالنے والی ہے) جو

---

[۱] جامع ترمذی باب فضائل القرآن ص۱۱۴

رہنمائی کرتا ہے حق اور سیدھے راستہ کی پس ہم (تو) ایمان لاچکے اس قرآن پر (فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے نطق کیا قرآن کریم کے ساتھ اس نے سچ بولا۔ اور جس نے اس پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس شخص نے دعوت دی اسکی جانب اس نے دعوت دی صراط مستقیم کی۔[ف]

ابن ابی شیبہ نے ابو شریح الخزاعی سے روایت کیا ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ سَبَبٌ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَضِلُّوْا وَلَنْ تَهْلِكُوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا۔

بے شک یہ قرآن ایک مضبوط رسی ہے جس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے اس لئے (بس) مضبوطی سے پکڑ لو اسکو پھر تم اس کے بعد نہ ہرگز گمراہ ہوگے اور نہ ہرگز ہلاک ہوگے

[ف] بعض ملحدین اس حدیث میں لفظ احادیث کو حدیث رسول کے معنی میں لیکر عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اشتغال بالحدیث۔ ایک فتنہ وگمراہی ہے العیاذ باللہ۔ یہ ایک کھلی ہوئی تحریف ہے۔ الفاظ روایت میں۔ ہم نے اسی واسطے احادیث کا ترجمہ میں قصوں کا لفظ ذکر کرکے اس پر آگاہ کر دیا۔ کیونکہ الاحادیث جمع کے ساتھ جب کبھی بھی قرآن و حدیث میں استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے معنی افسانے اور قصوں کے آتے ہیں نہ کہ معنی حدیث اصطلاحی (احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) جیسا کہ قوم سبا کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

فجعلنا هم احادیث و مزقنا هم کل ممزق — کر لپس بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو قصے اور افسانے (کہ لوگ بس ان کے بجائے ان کے افسانے اور ان کی تباہی و بربادی کے واقعات ہی بیان کیا کریں گے) اور پارہ پارہ کر ڈالا ہم نے ان کو پوری طرح پارہ پارہ کر دینا۔

علاوہ ازیں عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ اس روایت میں لفظ احادیث کو حدیث رسول کے معنی پر محمول کیا جائے جبکہ ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی سیرت طیبہ قرآن کریم کی عملی تشریح و تفسیر اور بیان ہے لقول اللہ عز وجل وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ تو جس ذات اور اس کے قول و فعل کو قرآن کی تشریح و تفسیر بنا دیا اس میں انہماک و اشتغال فتنہ قرار دیا جانا عقلاً کیسے قابل تصور ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ کچھ بھی عقل ان لوگوں کو عطا فرما دے تو انھیں اپنی اس حماقت اور بعید از عقل بات کا شعور ہو۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ یہ موقع اس موضوع کی تفصیل کا نہیں ہے تفصیل درکار ہو تو حجیت حدیث کے موضوع پر تالیف کردہ کتب کا ملاحظہ فرمایا جائے ۱۲

امام قرطبی رح اپنی تفسیر احکام القرآن میں حکیم ترمذی کا قول نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں ۔

فَمِنْ حُرْمَةِ الْقُرْاٰنِ اَنْ لَّا يَمَسَّهٗ اِلَّا طَاهِرًا وَمِنْ حُرْمَتِهٖ اَنْ يَّقْرَءَهٗ وَهُوَ عَلٰى طَهَارَةٍ وَاَنْ يَّسْتَاكَ وَيَتَخَلَّلَ فَيُطَيِّبَ فَاهُ اِذْ هُوَ طَرِيْقُهٗ۔

کہ قرآن کریم کے آداب احترام میں سے یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو بغیر طہارت کے چھوئے نہیں ۔ اور یہ بھی اس کے آداب عظمت میں سے ہے کہ تلاوت بھی اسکی طہارت و پاکی کے ساتھ کرے ۔ اور مسواک کرکے دانتوں کو صاف کرے حتی کہ اس کا منہ صاف اور خوشبودار ہو جائے کیونکہ اس کا منہ قرآن کا راستہ ہے ۔ ؎۱

یزید بن ابی مالک کا مقولہ ہے کہ

اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقٌ مِّنْ طُرُقِ الْقُرْاٰنِ فَطَهِّرُوْهَا وَنَظِّفُوْهَا مَا اسْتَطَعْتُمْ

تمہارے منہ راستے ہیں قرآن کریم کے راستوں میں سے اس لئے ان کو پاک اور صاف رکھو جہانتک تم سے ہوسکے

نیز قرآن کریم کے آداب عظمت میں سے یہ بھی ہے کہ ہر روز کم از کم ایک مرتبہ مصحف قرآن اپنی نظر سے دیکھ لینا چاہئے ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ دن میں ایک بار بھی میں اپنے رب کے عہد (صحیفہ) کو نہ دیکھوں ۔ اور فرمایا کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطُوْا اَعْيُنَكُمْ حَظَّهَا مِنَ الْعِبَادَةِ قَالُوْا وَمَا حَظُّهَا مِنَ الْعِبَادَةِ قَالَ النَّظَرُ فِي الْمُصْحَفِ وَالتَّفَكُّرُ فِيْهِ وَالْاِعْتِبَارُ عِنْدَ عَجَائِبِهٖ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آنکھوں کو انکی عبادت کا حصہ ادا کر دیا کرو ۔ لوگوں نے عرض کیا اور ان آنکھوں کا کیا حصۂ عبادت ہے یارسول اللہ آپ نے فرمایا دیکھنا مصحف قرآن میں اور اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائب واقعات سے عبرت و نصیحت قبول کرنا ۔

کیفیّت نزول قرآن

یہ بات تو اہل سنت والجماعت کے درمیان متفق علیہ اور یقینی ہے کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے جو بواسطۂ جبرئیل امین عالم بالا سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اترا ۔ لوح محفوظ سے بیت المعمور تک ایک بار اور پھر وہاں سے عالم دنیا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تئیس برس کی مدت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر حسب ضرورت نازل ہوتا رہا ۔ اسی وجہ سے جہاں نزول قرآن کا پہلی صورت کے پیش نظر

؎۱ تفسیر القرطبی احکام القرآن ج ۱ ص ۲۷

ذکر فرمایا گیا تو وہاں لفظ اَنزَلنَا "جس کے معنی بیک وقت کسی چیز کا اتارنا ہے" اختیار کیا گیا اور جس مقام پر عالم دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے کی نوعیت ملحوظ رکھی گئی تو اس جگہ نَزَّلَ اور تنزیل جس کے معنی "وقتاً فوقتاً کسی چیز کا تھوڑا تھوڑا اتارنے کے ہیں" کا عنوان رکھا گیا۔
لیکن مفسرین کے درمیان یہ چیز زیر بحث واقع ہوئی کہ نزول قرآن کی کیفیت کیا ہے اور جبریل امین یہ کلام کس طرح لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتے تھے کسی تختہ پر لکھا ہوا دیکھ کر یاد کر لیتے تھے یا غیبی اور باطنی طریق پر یہ کلام اللہ سے سن لیتے۔ علامہ طیبیؒ بیان کرتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ قرآن کریم کا نزول بایں طور ہو کہ فرشتہ اس کلام کو حق تعالےٰ سے روحانی طور پر تلقی اور اخذ کر لے یا لوح محفوظ سے اسکو یاد کرلے اور پھر اس کو لیکر اترے عالم دنیا میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کی تلاوت کرے۔ بہر حال دونوں کیفیتیں نزول وحی کی ممکن ہیں۔ پہلی صورت کا حاصل تو یہ ہوگا کہ جبریل اللہ کا کلام سنیں جس کیفیت کے ساتھ بھی اللہ کی مشیت ہو۔ اور دوسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالےٰ اپنا کلام لوح محفوظ میں جبرئیلؑ کے سامنے ظاہر فرمادے۔ اور جبریل اس کو محفوظ کرکے کسی بھی کیفیت کے ساتھ کیفیات وحی میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ادا کردیں۔ بعض ائمہ سلف نے تو اس مسئلہ میں سکوت و توقف اختیار کیا لیکن اکثر محققین اول قول ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ روایات میں وحی خداوندی کی نوعیت کچھ اسی طرح بیان کی گئی ہے کہ جب وقت حق تعالےٰ کسی امر وحی کا تکلم فرماتا ہے تو آسمانوں پر عظمت و ہیبت خداوندی کی وجہ سے ایک شدید لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور آسمان والے فرشتے مدہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ جب اس حالت وکیفیت سے افاقہ ہوتا ہے تو ایک دوسرے سے دریافت کرتا ہے کہ "ماذا قال ربکم" (کیا کہا تمہارے رب نے) تو اس پر بتایا جاتا ہے کہ فرمان خداوندی حق ہے۔
طبرانی نے نواس بن سمعان سے مرفوعاً روایت کی ہے۔

إِذَا تَكَلَّمَ اللهُ تَعَالَىٰ بِالْوَحْيِ أَخَذَتِ السَّمَاءَ رَجْفَةٌ شَدِيدَةٌ مِنْ خَوْفِ اللهِ تَعَالَىٰ فَإِذَا سَمِعَ بِذَٰلِكَ أَهْلُ السَّمَاءِ صَعِقُوا وَخَرُّوا سُجَّدًا فَيَكُونُ أَوَّلَهُمْ يَرْفَعُ رَأْسَهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيُكَلِّمُهُ اللهُ تَعَالَىٰ بِوَحْيِهِ بِمَا أَرَادَ فَيَنْتَهِي بِهِ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَكُلَّمَا مَرَّ

جب تکلم فرماتا ہے اللہ تعالےٰ وحی کے ساتھ تو طاری ہوجاتا ہے آسمان پر ایک شدید زلزلہ اللہ تعالےٰ کے خوف اور ہیبت کی وجہ سے پھر جب سنتے ہیں اس کو آسمان والے تو مدہوش ہوکر سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے سر اٹھانے والے جبرئیل ہوتے ہیں تو اللہ تعالےٰ ان سے تکلم فرماتا ہے اپنی وحی کا جو بھی

بِسَمَاءٍ سَأَلَهُ أَهْلُهَا مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقَّ فَيَنْتَهِي بِهِ حَيْثُ أُمِرَ۔[1]

اللہ ارادہ فرمائے تو جبرئیل وہ وحی الٰہی لیکر پہنچتے ہیں ملائکہ کے سامنے جس آسمان سے بھی گذرتے ہیں وہاں کے فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ "کیا فرمایا ہے ہمارے رب نے" تو جبرئیل کہتے ہیں اللہ نے حق فرمایا ہے یہانتک کہ اس وحی کو لیکر وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو حکم دیا گیا (لیجانے کا)

صحیح بخاری باب بدء الوحی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

أَنَّ الْحَارِثَ بن هشام سَأَلَ رَسُولَ اللهِ صلى الله عَلَيْهِ وسلم كيف يَأْتِيكَ الْوَحْيُ يا رسول الله فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيَفْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ۔ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا

حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کس طرح آپ پر وحی آتی ہے یا رسول اللہ، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کبھی کبھی تو وہ وحی مجھ پر نازل ہوتی ہے اس طرح جیسے کسی گھنٹہ کی جھنکار ہو۔ اور یہ وحی مجھ پر نہایت شدید ہوتی ہے۔ تو یہ کیفیت وحی مجھ سے جدا ہوجاتی ہے اور حال یہ کہ میں محفوظ کئے ہوئے ہوتا ہوں جو کچھ اس نے کہا۔ اور کبھی (وہ) فرشتہ ظاہر ہوتا ہے مرے سامنے کسی مرد کی شکل میں پھر مجھ سے گفتگو کرتا ہے تو میں یاد کرلیتا ہوں جو کچھ وہ مجھ سے کہتا ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ پر وحی اترتی تھی نہایت ہی شدید سردی کے دن اور پھر آپ سے وحی کی کیفیت جدا ہوتی تو حال یہ ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی پسینہ سے تر ہوتی۔

غرض طبرانی اور صحیح بخاری کی ہر دو روایات سے جبرئیل امین کے بارگاہ خداوندی سے وحی الٰہی کے اخذ کرنے کی کیفیت معلوم ہوگئی کہ وہ براہ راست رب العزت سے اس کا کلام اخذ کرتے اور پھر ان دو صورتوں میں (جو حدیث بخاری میں مذکور ہیں) سے کسی ایک شکل کے ساتھ اس وحی الٰہی کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر القاء فرماتے۔

---

[1] التبیان فی علوم القرآن للجزائری ص۲۵ - وفتح الباری ص۳ ج ۹

وحی اور الہام

وحی اور الہام دونوں لفظ لغت کے اعتبار سے قریب المعنی ہیں۔ الہام دل میں کسی چیز کا القاء کرنا۔ اور وحی اعلام خفی یعنی کسی امر پر مطلع کر دینا مخفی اور پوشیدہ طور پر امام راغب رحمہ اللہ مفردات میں وحی کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اشارۃ سریعۃ فی خفیۃ" یعنی آناً فاناً کسی امر پر اشارہ (و اطلاع) کر دینا مخفی طور پر کہ عرش الہٰی سے ایک ہی آن میں وہ اشارہ قلب نبی پر آ پہنچتا ہے۔ اور بسا اوقات آپ کے گرد صحابہ کا مجمع ہوتا لیکن کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ آپ پر کیا کلام نازل ہوا۔ بہر کیف لغۃً دونوں لفظ قریب المعنی ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں وحی خاص ہے انبیاء علیہم السلام کے لئے اور خدا کے اس پیغام کو کہا جاتا ہے جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف القاء کیا جائے تو وحی شریعت کا ایک اصطلاحی عنوان ہوا جو صرف نبی کی وحی ہی کیلئے بولا جائے گا۔ اگرچہ لفظ وحی کے بعض مشتقات غیر انبیاء کے لئے بھی اطلاق کئے گئے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارہ میں ہے۔

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ۔ (ہم نے کہا موسیٰ کی والدہ سے یہ کہ تو ہی موسیٰ کو دودھ پلا) اسی طرح لفظ ایحاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین کے حق میں بھی بولا گیا وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ۔ بلکہ غیر ذوی العقول کیلئے بھی استعمال کیا گیا واوحیٰ ربك الی النحل ان اتخذی اور حتیٰ کہ غیر ذی روح کے لئے قرآن کریم میں وارد ہوا ہے وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا یقیناً اس قسم کے تمام مواقع میں معنی لغوی ہی ملحوظ ہوں گے۔

اقسام وحی

خدا کا پیغام خواہ بتوسط جبریل ہو یا بلا توسط جبریل کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مضمون اور الفاظ دونوں نازل کئے جاتے ہیں جس کو وحی متلو کہتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صرف مضمون بلا تعبیر اور الفاظ کے القاء کیا جاتا ہے جس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ یہ تمام صورتیں وحی الہٰی کی ہیں جن کے ساتھ پیغام خداوندی اس کے پیغمبروں پر اترتا ہے۔ جیسے کہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (سورۂ شوریٰ)

اور کسی آدمی کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا بھیجے اللہ تعالیٰ کسی قاصد کو پھر وہ پیغام لیجانے والا پہنچا دے اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہے

حاصل یہ کہ کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اور قوائے انسانیہ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ خداوند عالم اس عالم دنیا میں اس کے سامنے ہو کر مشافہۃً کلام فرمائے اور وہ اس کو تحمل کر سکے۔ اس لئے کسی بھی بشر سے اس کے ہمکلام ہونے کی صرف تین ہی صورتیں ہیں۔ بلا واسطہ من وراء حجاب (از پس پردہ) کلام فرمائے یعنی نبی کی قوت سامعہ کا تو اس وحی کے اخذ اور تلقی میں واسطہ ہو لیکن قوت باصرہ دخیل نہ ہو۔ سامعہ کلام خداوندی سے لطف اندوز ہے مگر نگاہیں شرف دیدار سے متمتع نہیں جس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ کا کلام فرمانا ہے کہ کلام سنائی دے رہا تھا لیکن حضرت موسے اپنی آنکھوں سے کسی متکلم کو نہیں دیکھ رہے تھے اسی وجہ سے جب کلام خداوندی کی لذت سے کان آشنا اور لطف اندوز ہوئے تو معًا دیدار خداوندی کا اشتیاق قلب میں پیدا ہوا اور بول اٹھے رَبِّ أَرِنِیْ أَنْظُرْ إِلَیْكَ۔ دوسری صورت یہ کہ حق تعالےٰ کسی فرشتہ کے ذریعہ کلام فرمائے۔ لیکن فرشتہ کسی انسان کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے نہ آئے بلکہ براہ راست قلب نبی پر نزول کرے یعنی ظاہری باصرہ اور سامعہ کا درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ قلب ہی کے ذریعہ فرشتہ کا ادراک ہو اور قلب ہی کے مدرکات سے اللہ کا کلام سنے اور اخذ کرے۔ ارشاد خداوندی "نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ" اور فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بظاہر اسی شکل کی طرف اشارہ ہے اور غالباً یہی کیفیت وہ ہوتی ہوگی جس کو حدیث عائشہؓ میں مثل صَلْصَلَةِ الْجَرَس سے تعبیر کیا گیا اور آیۂ مذکورہ میں إِلَّا وَحْیًا کا مصداق یہی شکل ہے۔

تیسری صورت یہ کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں متمثل ہو کر نبی کے سامنے آئے اور وہ اس طرح خدا کا کلام و پیغام پہنچا دے جس طرح ایک آدمی دوسرے سے گفتگو کرتا ہو اس وقت آنکھیں بولنے والے کو دیکھتی ہیں اور کان آواز سنتے ہیں۔ اور بسا اوقات حاضرین مجلس بھی گفتگو سنتے اور سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر اوقات جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دحیۃ بن خلیفہ کلبی کی صورت میں رونما ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی کسی غیر معروف صورت میں کہ صحابہ پہچان نہ سکتے تھے کہ آنے والا شخص قاصد خداوندی ہے جیسے کہ حدیث جبریل کتاب الایمان میں ہے کہ

إِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ لَا یَعْرِفُهٗ مِنَّا أَحَدٌ الخ

کہ ناگہاں رونما ہوا ہمارے سامنے ایک شخص نہایت سیاہ بالوں والا اور بہت ہی سفید کپڑوں والا کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کو نہیں پہچانتا تھا۔

اسی تیسری صورت کو "أَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِإِذْنِهٖ مَا یَشَاءُ" میں بیان فرمایا گیا۔

الہام کا لغوی مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا کہ "دل میں کسی چیز کا القاء کرنا" ہے یعنی الہام اس علم کو کہا جاتا ہے جو قلب میں بغیر کسی اکتساب و استدلال کے حق تعالےٰ شانہ ملاء اعلیٰ کی جانب سے القا فرمائے۔ لفظ الہام اصطلاح شریعت میں اکثر غیر انبیاء کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پھر اللہ نے اس کے فجور اور تقوے کا الہام فرمایا)

شیخ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا الہام اس لئے فرمایا کہ نفس اس پر عمل کرے اور فجور کا الہام اس لئے تاکہ اس سے پرہیز کرے۔ الہام فجور کا اس مقام پر یہ مطلب نہیں کہ قلب میں یہ داعیہ پیدا فرما دیا کہ فسق و فجور کرے۔

الہام کی مختلف صورتیں ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ من جانب اللہ براہِ راست قلب پر کسی علم کا القاء ہوتا ہے جس کو علم لدُنی کہا جاتا ہے یہی وہ علم ہے جس کو حضرت خضر علیہ السلام کے حق میں فرمایا گیا۔

وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَالْعِلْمُ اللَّدُنِّيُّ هُوَ الَّذِي لَا وَاسِطَةَ فِي حُصُولِهِ بَيْنَ النَّفْسِ وَبَيْنَ الْبَارِيْ تَعَالٰى وَإِنَّمَا هُوَ كَالضَّوْءِ مِنْ سِرَاجِ الْغَيْبِ يَقَعُ عَلٰى قَلْبٍ صَافٍ فَارِغٍ لَطِيفٍ۔

علم لدنی وہ علم ہے کہ جس کے حاصل کرنے میں نفس اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو وہ تو اس روشنی کی طرح ہے جو شمع غیب سے صاف و شفاف قلب پر واقع ہوتی ہو۔ جو قلب کہ دنیوی لذتوں اور آلائشوں سے فارغ اور پاک ہو۔

حضرت بایزید بسطامی رح علم لدنی کے منکرین کو فرمایا کرتے تھے

قَدْ اَخَذْتُمْ عِلْمَكُمْ مَيِّتًا عَنْ مَيِّتٍ وَنَحْنُ اَخَذْنَا عِلْمَنَا عَنِ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ[1]

کہ اے علماء ظاہر تم نے اپنا علم مَیِّتًا عَنْ مَیِّت حاصل کیا ہے اور ہم نے اپنا علم حی لایموت سے لیا ہے۔

اور کبھی کوئی چیز ملک الہام کے توسط سے قلب میں القاء کی جاتی ہے اسی کو القاء فی القلب اور نفث فی الروع کہا جاتا ہے کہ وہ علم ملک الہام ملاء اعلیٰ کی طرف سے حاصل کر کے قلب میں القاء کر دیتا ہے مگر نظر نہیں آتا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد واعظ اللہ فی قلب کل مؤمن میں واعظ اللہ سے یہی الہام الٰہی مراد ہے جو فرشتہ کے واسطہ سے ہوتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ متمثل بشکل بشر ہو کر عیاناً اور رُو در رُو مخاطبت اور کلام کرتا ہے کما قال اللہ تعالےٰ

[1] الیواقیت والجواہر ج۲ ص۹۱ بحوالۂ علم الکلام ص۱۵۹

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۔

اور جس وقت کہ فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا ہے اور تجھ کو پاک بنایا ہے اور فضیلت دی ہے تجھ کو جہان کی عورتوں پر۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے اپنے خاص کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسٰی بن مریم ہوگا جو صاحب وجاہت ہوگا دنیا میں اور آخرت میں۔

غرض ان آیات میں حضرت مریم علیہا السلام کی جانب اللہ کے اس الہام کا ذکر ہے جو بواسطہ فرشتوں کے فرمایا گیا۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ قلب کے دو دروازے ہیں ایک عالم ملکوت اور ملاء اعلیٰ کی طرف ہے اور دوسرا عالم شہادت کی طرف ہے۔ ظاہری علوم اور معارف تو ظاہری دروازہ یعنی حواس خمسہ ظاہرہ کے ذریعہ قلب میں داخل ہوتے ہیں اور باطنی علوم عالم ملکوت اور ملاء اعلیٰ کے دروازہ سے قلب میں آتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ علم نافع وہی باطنی علم ہے جو قلب میں سرایت کئے ہو۔

حجۃ الاسلام قدس سرہٗ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ حوض میں پانی لانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نہر وغیرہ سے پانی لایا جائے اور وہ پانی حوض میں جمع کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسی حوض کو اس قدر کھودا جائے اور آلات کے ذریعہ اتنا صاف کیا جائے کہ اسی میں پانی کا چشمہ جاری ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی بہ نسبت پہلے پانی کے زائد صاف ہوگا۔ شیریں و لذیذ بھی اور شیئاً فشیئاً زائد بھی ہوتا رہیگا اور ہر آن و لمحہ پینے والوں کے واسطے یہ تازہ پانی بیش از بیش سیرابی اور تسکین کا باعث ہوگا۔ بالکل اسی طرح قلب انسانی بھی بمنزلہ حوض کے ہے کبھی اس میں علم حواس خمسہ کی نہروں اور گولوں کے ذریعہ سے لایا جاتا ہے اور کبھی خلوت و عزلت اور مجاہدہ و ریاضت سے قلب اس قدر صاف اور عمیق کر دیا جاتا ہے کہ خود اندرونِ قلب ہی سے علم کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔

بہت سوں کی ریاضت اور صفائی باطن تو اس درجہ ہوتی ہے کہ تحصیل علوم میں ان کو حواس ظاہرہ کی ضرورت بالکل ہی باقی نہیں رہتی

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انھوں نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ. الآیۃ

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر یہ کہ الخ

اور اس کے ساتھ لفظ " ولا محدث " بھی پڑھا اور محدث کی تفسیر بیان کی کہ

وَالْمُحَدَّثُ هُوَ الْمُلْهَمُ وَالْمُلْهَمُ هُوَ الَّذِي انْكَشَفَ لَهُ فِي بَاطِنِ قَلْبِهِ مِنْ جِهَةِ الدَّاخِلِ لَا مِنْ جِهَةِ الْمَحْسُوسَاتِ الْخَارِجَةِ. وَكَانَ أَبُو يَزِيدَ وَغَيْرُهُ يَقُولُ لَيْسَ الْعَالِمُ الَّذِي يَحْفَظُ مِنْ كِتَابٍ فَإِذَا نَسِيَ مَا حَفِظَهُ صَارَ جَاهِلًا إِنَّمَا الْعَالِمُ الَّذِي يَأْخُذُ عِلْمَهُ مِنْ رَبِّهِ أَيَّ وَقْتٍ شَاءَ بِلَا حِفْظٍ وَلَا دَرْسٍ وَهٰذَا هُوَ الْعِلْمُ الرَّبَّانِي وَإِلَيْهِ الْإِشَارَةُ بِقَوْلِهِ تَعَالَى وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا مَعَ أَنَّ كُلَّ عِلْمٍ مِنْ لَدُنْهُ وَلٰكِنْ بَعْضُهُ بِوَسَائِطِ تَعْلِيمِ الْخَلْقِ فَلَا يُسَمّٰى ذٰلِكَ عِلْمًا لَدُنِّيًّا بَلِ اللَّدُنِّيُّ هُوَ الَّذِي يَنْفَتِحُ فِي سِرِّ الْقَلْبِ مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ مَأْلُوفٍ مِنْ خَارِجٍ۔ ؎

محدث وہ ملہم من اللہ ہے کہ جس کے باطن قلب میں ان حواس ظاہرہ کے علاوہ علوم ومعارف کے لئے کوئی دوسرا راستہ کھل گیا ہو اور بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ شخص عالم نہیں ہے جو کوئی چیز کتاب سے حفظ کرلے اس لئے کہ وہ اگر اس کو بھول جائے تو جاہل رہ جائے گا۔ عالم تو حقیقۃً وہ ہے کہ جو اپنے رب سے جس وقت چاہے اپنا علم حاصل کرتا ہو بغیر حفظ اور تدریس کے یہی علم ربانی ہے اور اسی علم کی طرف "وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا" میں اشارہ ہے اگرچہ ہر علم اللہ ہی کی طرف سے ہے مگر بعض علم تعلیم خلق کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے تو اس کو علم لدنی نہیں کہتے علم لدنی وہ ہے جو بغیر کسی خارجی سبب کے خود بخود قلب میں منجانب اللہ آتا ہو۔

الہام انبیاء اور الہام اولیاء میں فرق

حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ المعتمد میں فرماتے ہیں کہ الہام انبیاء اور الہام اولیاء میں فرق ظاہر ہے انبیاء کا الہام قطعی ہوتا ہے جس طرح خود انبیاء کرام معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں اسی طرح ان کا الہام بھی خطاء و غلطی سے معصوم ومحفوظ ہوتا ہے۔ بخلاف الہام اولیاء کے کہ وہ ظنی ہوتا ہے اور خطاء سے معصوم نہیں ہوتا۔

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

؎ بحوالہ علم الکلام ص ۱۶۰

والہام کہ اولیاء را ہست مقتبس از انوار نبوت است واز برکات و فیوض متابعتِ انبیاء است علیہم الصلوات والسلام۔[1]

اور وہ الہام کہ جو اولیاء کو ہوتا ہے وہ انوارِ نبوت سے ماخوذ ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی پیروی کے فیوض و برکات سے حاصل ہوتا ہے۔

یعنی جس طرح کہ مؤمنین کا ایمان اور ان کا زہد و ورع رضا و تسلیم وغیرہ انبیاء علیہم السلام ہی کے ایمان اور ان کی صفاتِ کمالیہ کا عکس ہوتا ہے اسی طرح اولیاء کا الہام بھی انبیاء کے الہام کا ایک معمولی سا پرتو اور عکس ہوتا ہے۔ جو تفاوت ایمانِ مؤمنین اور ان کی صفات اور ایمانِ انبیاء اور صفاتِ انبیاء میں ہو سکتا ہے وہی تفاوت الہامِ اولیاء کو الہامِ انبیاء سے ہے۔

قرآن کریم حدیث قدسی اور حدیث نبوی کے درمیان فرق

قرآن کریم کی تعریف بالعموم اصولیین اس طرح فرماتے ہیں۔

اما الکتابُ فالقرآنُ المنزّلُ علی الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم المکتوب فی المصاحف المنقول عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم نقلاً متواتراً بلا شبہۃٍ وھو النّظمُ والمعنیٰ جمیعاً[2]

قرآن کریم اس .... کتاب الٰہی کا نام ہے جس کو نازل کیا گیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر، جو لکھا گیا صحیفوں میں (اور) جو نقل کیا گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نقل متواتر کے ساتھ بلا شبہ۔ اور قرآن نام ہے نظم (یعنی الفاظ کلام اللہ) اور معنی دونوں کا۔

یعنی قرآن کریم اللہ کا کلام صرف معانی و مضامین ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے ہیں جس طرح کہ اس کے معنی و مفہوم اللہ کی طرف سے ہونے پر قرآن کریم کی یہ آیت اِنَّآ اَنزَلْنٰہُ قُرْآنًا عَرَبِیًّا اسی طرح یہ بھی بتاتی ہے کہ دلالت کرتی ہے یہ تعبیر قرآنی بھی اللہ کی وحی ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے انہی کلمات کے مقابلہ کی تمام عالم کو دعوت دی کہ اگر کسی کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہ ہو تو وہ بھی اس جیسا کلام بنا لائے اور اس کے ساتھ آئندہ کے لئے اس کی بھی خبر دیدی گئی کہ

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ تو جو کچھ بھی دعوت مقابلہ دی گئی اس کا مدار کلمات قرآن پر تھا۔ اور یہ دیکھ لیا گیا کہ الفاظ کی مماثلت و مشابہت سے بھی تمام عالم عاجز رہا۔ تو اگر الفاظ منزل من اللہ نہ ہوتے تو امکان تھا کہ لفظی مشابہت کسی کے کلام میں محسوس کی جا سکتی۔[3]

---

[1] علم الکلام۔ [2] اصول بزدوی صـ۲۲ ج۱۔ [3] یہ مسئلہ متکلمین کے نزدیک طویل الذیل ہے۔ اس مختصر رسالہ میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اجمالاً اہل سنت والجماعت کے اس مسلک کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق (یعنی قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے) کی قدرے توضیح کے لئے یہ کلمات اشارۃً ذکر کر دیئے۔

وحی منزل من اللہ تورات و انجیل اور صحف ابراہیم بھی ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں قرآن خاص طور پر اسی وحی الٰہی کو کہا جاتا ہے جو بحیثیت متلو ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری۔ اس لئے لفظ قرآن انبیاء سابقین کی کتب سماویہ پر اطلاق نہیں کیا جاتا علامہ ابو البقا کلیات میں فرماتے ہیں قرآن وہ ہے جس کے لفظ اور معنی دونوں اللہ کی طرف سے ہوں وحی جلی کے ساتھ۔ اور حدیث قدسی[۱] وہ ہے جس کے الفاظ تو ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور معنی اس کے من جانب اللہ ہوں خواہ بذریعہ الہام یا بصورت خواب اور بعض ائمہ سے یہ منقول ہے کہ قرآن نظم معجز اور وہ کلام الٰہی ہے جو بواسطۂ جبریل علیہ السلام کے نازل کیا جائے اور حدیث قدسی وہ کلام الٰہی ہے جو نہ تو معجز ہو اور نہ بواسطۂ جبریل نازل ہو بلکہ بلا واسطہ وہ کلام ربانی قلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وارد ہو۔ اس قسم کے کلام کو حدیث قدسی اور الٰہی اور ربانی کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبی کے کلام سے بھی اسی نوع کا فرق قرآن اور حدیث قدسی کے درمیان مفہوم ہوتا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ قرآن وہ الفاظ منزلہ ہیں جو جبریل لیکر اترتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حدیث قدسی یہ ہے کہ حق تعالٰے کی طرف سے کسی معنی اور مضمون پر بذریعہ الہام مطلع کر دیا جاتا، پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی اور مضمون کو اپنی تعبیر میں امت کو بیان فرما دیتے[۲]

علامہ سید احمد بن المبارک رح کتاب الابریز میں اپنے شیخ نجم العرفان۔ سید عبد العزیز الدباغ قدس اللہ سرہٗ العزیز کی کرامات کا تذکرہ فرماتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ شیخ کی کرامات لا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی ہیں ہم اس فصل کو شیخ رحمہ اللہ کی ایک کرامت عظیم کے بیان پر ختم کرتے ہیں جو ان کی وسعت عرفان اور نورانیتِ باطن اور فیض ایمان کی کھلی ہوئی نشانی ہے شیخ کی باطنی معرفت اور لدنی علوم کی پرواز معلوم کرنے کے لئے ایک روز میں نے قصد کیا کہ شیخ سے حدیث صحیح اور غیر صحیح حدیث قدسی حدیث نبوی (جسکو غیر قدسی کہتے ہیں) اور قرآن کریم کے درمیان فرق و امتیاز معلوم کروں۔ میرے پاس شیخ جلال الدین السیوطی کی تالیف "الدرر المنتثرہ فی الاحادیث المشتہرۃ" موجود تھی جس میں سیوطی رح نے ان احادیث کو جمع کیا ہے، جو عام طور پر تو مشہور ہیں لیکن سند کے اعتبار سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو میں نے شیخ عبد العزیز الدباغ سے دریافت کرنا شروع کیا حالانکہ شیخ ظاہری علوم سے ناواقف اور امی تھے۔ نہ کسی درسگاہ کے

---

[۱] حدیث قدسی اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعنوان قال اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمائیں۔ مثلاً۔ قال اللہ تعالیٰ کَذَّبَنِیْ ابْنُ اٰدم ولم یکنْ لہ ذلک ؛ وشَتَمَنِیْ ابنُ اٰدَمَ ولم یکن لہ ذلک

[۲] قواعد التحدیث ص۶۶ وکلیات ابی البقاء ص۲۸۶

فارغ التحصیل عالم تھے لیکن مقام حیرت یہ امر تھا کہ ہر سوال کا جواب اس طرح دیا جیسا کہ ایک محدث و امام اور فن حدیث کا ماہر دیتا ہو۔ تو میں نے دریافت کیا حدیث ...... "اُمِرْتُ اَنْ اَحْکُمَ بِالظَّوَاہِرِ واللہُ یَتَوَلَّی السَّرَائِرَ" کے متعلق تو اس پر جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات نہیں ارشاد فرمائی۔ ادھر میں دیکھتا ہوں کہ شیخ سیوطی نے بھی ان الفاظ کو باطل فرمایا ہے پھر میں نے حدیث "کُنْتُ کَنْزًا لَا اُعْرَفُ" کے بارہ میں دریافت کیا تو اس کو بھی شیخ نے کہا کہ یہ حدیث نہیں ہے چنانچہ شیخ سیوطیؒ نے بھی اسی طرح اس کو باطل روایات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔ پھر میں نے اسی طرح ایک اور حدیث "مَا خَلَقَ اللہُ العَقْلَ" کے متعلق سوال کیا تو فرمایا یہ بھی نبی کریم نے نہیں فرمایا۔ اور چنانچہ احمد بن حنبل اور ابن الجوزی بھی اس کو موضوعات میں شمار فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا اے شیخ بے شک اسی طرح ائمہ محدثین ان روایات کو بے اصل اور موضوع بیان کرتے ہیں۔

پھر جب اس طرح میں متعدد روایات دریافت کر چکا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ شیخ نے روایات صحیحہ میں یہ تک بھی ظاہر کرنا شروع فرمایا کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے یا ان میں سے ایک کی ہے یا بخاری اور مسلم کے علاوہ دوسرے ائمہ نے تخریج کی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ اے شیخ کس طرح آپ اس فرق پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ فرمایا تم دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص شدید سردی کے زمانہ میں بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے دھواں سا نکلتا ہے اور جب موسم گرما میں وہ بولتا ہے اس طرح اس کے منہ سے کوئی بھاپ اور دھواں نہیں نکلتا اسی طرح جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات کے ساتھ تلفظ کرتا ہے تو اس کے منہ سے ایک نور نکلتا ہے الفاظ کے ساتھ۔ اور جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے علاوہ کچھ اور اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس کا کلام بے نور ہو کر اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ پھر ایک بار یہ بھی فرمایا کہ عارفین جب کلام نبوی سنتے ہیں تو عارفین کے قلبی انوار و معارف میں زیادتی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ جان لیتے ہیں کہ ہمارے کان کلمات پیغمبر سن رہے ہیں اور جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے علاوہ کسی اور کا کلام سنتے ہیں تو وہ اپنی سابق کیفیت ہی پر باقی رہتے ہیں اور باطنی انوار و قلبی معرفت میں از دیاد و ترقی نہیں محسوس ہوتی۔ اور دریائے معرفت میں کوئی خاص تموج نہیں پیدا ہوتا۔

بیان کرتے ہیں کہ جب مجھ کو یہ بات مشاہد و منکشف ہو گئی کہ شیخ رباطنی معرفت کے ایک عظیم پہاڑ ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے نکلے ہوئے کلمات میں ان کی معرفت کے مضبوط قدم قطعاً نہیں ڈگمگاتے تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے بعد میں شیخ کو آزماؤں۔ قرآن کریم اور حدیث کے درمیان فرق دریافت کر کے۔ چونکہ حافظ کلام اللہ نہ تھے تو میں ان کے روبرو کبھی کوئی آیت

تلاوت کرتا اور پوچھتا کہ یہ حدیث ہے یا قرآن ؟ تو جواب میں فرماتے قرآن کریم۔ پھر کبھی میں حدیث پڑھتا اور دریافت کرتا کہ یہ قرآن ہے یا حدیث۔ جواب دیتے کہ نہیں یہ تو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اسی طرح متعدد آیات و روایات کو میں ان کے سامنے پیش کرتا رہا۔ ہر ایک کا جواب شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنی بصیرت اور باطنی انوار کے ذریعہ ٹھیک ٹھیک دیتے رہے یہاں تک کہ میں نے ان کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت درمیان میں حدیث کا ایک تفسیری کلمہ ذکر کرتے ہوئے پیش کی حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وہی العصر وقوموا للہ قانتین (بقرہ) اس آیت میں لفظ "وھی العصر" حدیث میں صلوٰۃ وسطیٰ کی تفسیر کے طور پر وارد ہوا ہے۔ تو میں نے یہ پورے الفاظ پڑھ کر دریافت کیا کہ بتایئے کہ یہ قرآن ہے یا حدیث رسول۔ اس کو سنکر فرمایا۔ "فیہ قرآن وفیہ حدیث" (اس کلام میں قرآن بھی ہے اور حدیث بھی ہے۔ اور فرمایا کہ لفظ "وھی العصر" تو زبان رسالت سے نکلا ہوا کلمہ ہے اور باقی قرآن ہے۔

احمد بن المبارک بیان کرتے ہیں کہ میرے ساتھ مجلس میں فقہاء و محدثین کی ایک جماعت تھی شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس علمی تبحر اور باطنی معرفت پر نہایت ہی متعجب ہوئے۔

اب اس کے بعد میں نے چاہا کہ قرآن اور حدیث قدسی کے درمیان فرق معلوم کروں (میں خیال کرتا تھا کہ یہ فرق علوم رسمیہ اور حفظ قرآن کے بغیر شاید مشکل ہوگا کیونکہ احادیث قدسیہ کا عنوان بھی قال اللہ تبارک وتعالیٰ ہوتا ہے جیسے کہ کسی آیت قرآنیہ کو بیان کرتے ہوئے یہی عنوان زینت بیان ہوتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ یا ایھا الذین آمنوا اذا قمتم الآیۃ) تو میں شیخ کے سامنے احادیث قدسیہ اسی عنوان سے پڑھتا رہا اور عرض کرتا رہا کہ کیا یہ قرآن ہے ؟ شیخ فرماتے رہے نہ تو یہ (کلام) قرآن ہے اور نہ یہ اس طرح کی حدیث ہے جیسی حدیثیں تم پہلے دریافت کر رہے تھے۔ بلکہ یہ تو حدیث کی کچھ اور ہی قسم ہے جس کو حدیث ربانی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر شیخ کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کیا خدا کے لئے مجھے ان تینوں میں فرق سمجھا دیجئے (ایسا فرق جس کو دل اپنی باطنی نگاہوں سے محسوس کر لے) فرمایا۔ اگرچہ ہر ایک کلام ان میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک ہی کے ذریعہ سنا گیا اور نور ہر ایک کلام کے ساتھ موجود ہے لیکن تینوں میں فرق یہ ہے کہ وہ نور جو قرآن میں ہے وہ نور حق تعالیٰ شانہٗ کا نور ذاتی اور قدیم ہے۔ اور وہ نور جو حدیث قدسی میں ہے وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نورِ روح ہے اور وہ قرآن کریم جیسا نور (قدیم) نہیں ہے۔ اور وہ نور جو احادیث قدسیہ کے علاوہ دیگر احادیث نبویہ میں ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ذات (نور وجود) ہے تو قرآن حق تعالیٰ کا نور قدیم اور حدیث

قدسی نبی کریم کا نور روح ہے اور حدیث نبوی آنحضرت کا نور ذات۔

اس پر میں متحیر ہو کر) عرض کرنے لگا کہ نور ذات اور نور روح کا کیا مطلب ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ فرمایا ذات مٹی سے پیدا کی گئی اور مٹی ہی سے آدم اور تمام اولاد آدم کو پیدا کیا گیا۔ اور روح ملاء اعلیٰ کی طرف سے ہے (کما قال اللہ تعالیٰ قل الروح من امر ربی) اس لئے نور روح کا تعلق ذاتِ حق (سبحانہ وتعالیٰ) کے ساتھ ہوگا اور نور ذات خلق سے متعلق ہوگا۔ اسی وجہ سے احادیث قدسیہ حق تعالےٰ شانہ کی شئون وصفات اس کی وسعتِ رحمت ومعرفت اور اس کی بے پایاں قدرت اور کثرت عطاء ونوال کے بیان پر مشتمل ہوتی ہیں۔

مثلاً حدیث یا عبادی لو ان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم الخ اور حدیث اعددت لعبادی الصالحین الخ اور حدیث یدُ اللہ ملأیٰ الخ۔

اور وہ احادیث جو ان کے علاوہ ہوتی ہیں وہ احکام حلال وحرام سے متعلق ہوتی ہیں اور وعد وعید۔ ثواب وعقاب اور عالم دنیا کی صلاح وعافیت اور بندوں کی فلاح سے متعلق مضامین پر مشتمل ہیں گویا احادیث قدسیہ ملاء اعلیٰ کے مضامین اور صفات حق پر مشتمل ہوتی ہیں اور احادیث نبویہ احکام خلق پر احمد بن المبارک اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جو کچھ میں شیخ کے کلام سے سمجھ سکا اسکو نقل کر دیا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ کے معارفِ باطنی کی پرواز اسقدر بلند تھی کہ میری فہم واستعداد ان حقائق کا ادراک کرنے سے عاجز رہی جن کی طرف شیخ نے اشارہ فرمایا۔

علامہ احمد بن المبارک نے اس مسئلہ کے ماتحت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے جو معارف وحقائق بیان کئے دل تو چاہتا تھا کہ اس بحث کو بتمامہ ہدیۂ قارئین کر دیا جائے لیکن رسالہ پیش نظر کے محدود اوراق اس کی وسعت کو نہ سما سکیں گے۔ اس لئے اختصاراً اس میں سے چند کلمات نقل کر دئے۔ حضرات اہل علم اصل کی مراجعت فرمالیں۔ (کذا فی الابریز ص ۲۳)

نزول قرآن کریم

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

اول ما بدئ به من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم فكان لا يرى رؤيا الا جاء مثل فلق الصبح ثم حبب اليه الخلاء فكان يخلو بغار حراء يتحنث فيه وهو التعبد في الليالي ذوات العدد قبل ان ينزع الى اهله ويتزود لذلك ثم يرجع الى خديجة فيتزود لمثلها حتى فجئه الحق وهو في غار حراء فجاءه الملك فقال اقرء قلت ما انا بقارئ قال فاخذني فغطني حتى بلغ مني الجهد ثم ارسلني فقال اقرا قلت ما انا بقارئ قال فاخذني فغطني الثانية حتى بلغ مني الجهد ثم ارسلني فقال اقرء فقلت ما انا بقارئ قال فاخذني فغطني الثالثة حتى بلغ مني الجهد ثم ارسلني فقال اقرء باسم ربك الذي خلق خلق الانسان من علق اقرء وربك الاكرم الذي علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم فرجع بها رسول الله صلى الله عليه وسلم ترجف فؤاده الى آخر الحديث۔

کہ سب سے پہلے وحی کی ابتدا، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے) مبارک اور سچے خوابوں سے ہوئی۔ پس جو بھی کوئی خواب آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح (روشن ہوکر) ظاہر ہوتا۔ پھر آپ کو خلوت وتنہائی محبوب ہوئی تو آپ غار حراء میں خلوت اختیار فرمانے لگے۔ آپ وہاں (خلوت نشین ہوکر) عبادت فرمایا کرتے متعدد راتوں (اور دنوں تک) اپنے گھر واپس ہونے سے قبل اور توشہ لیجاتے آپ اس کے لئے۔ پھر لوٹتے خدیجہ کی طرف اور پھر اتنے ہی دنوں کے واسطے توشہ لیتے یہاں تک کہ ناگہاں آگیا آپ کے پاس حق (اور نبوت ورسالت سے آپ سرفراز فرما دیئے گئے) جبکہ آپ غار حرا میں تھے (جس کی صورت یہ ہوئی کہ) اللہ کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا پڑھئے آپ نے جواب دیا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں بیان فرمایا کہ اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور پھر دبایا مجھ کو اس قدر کہ تکلیف انتہا کو پہنچ گئی پھر مجھ کو چھوڑا اور کہا پڑھئے میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں بیان فرمایا کہ پھر اس نے مجھ کو پکڑا اور دوبارہ دبایا اس قدر کہ مشقت انتہا کو پہنچ گئی پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھئے میں نے کہا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر اس نے پھر مجھ کو پکڑا اور پھر مجھ کو بھینچا تیسری مرتبہ حتی کہ تکلیف انتہا کو پہنچ گئی پھر مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا

اقرء باسم ربك الذي خلق خلق الانسان من علق اقرء وربك الاكرم الذي علم بالقلم علم الانسان

مالم یعلم۔ تو ان آیات کو لیکر لوٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضہ کی جانب اور حال یہ کہ آپ کا قلب (وحی کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے) کانپ رہا تھا۔ الخ

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منصب نبوت ورسالت عطا ہونے کے ساتھ سب سے پہلے کون سی آیات نازل ہوئیں۔ حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے دلائل النبوت نے میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ

اوّل سورۃٍ نزلت فی القراٰن اقرءِ باسمِ ربک۔ سب سے پہلی سورت جو قرآن کریم میں نازل ہوئی وہ اقرء ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطی رح نے "الاتقان" میں طبرانی کی ایک روایت نقل کی ہے۔

عن ابی رجاء العطاردی قال کان ابو موسیٰ رضہ یقرء نا فیجلسنا حلقا وعلیہ ثوبانِ ابیضانِ فاذا تلا ھٰذہٖ السّورۃ اِقرءْ باسمِ ربّک الّذی خلق قال ھٰذہ اوّلُ سورۃٍ اُنزلت علیٰ محمّدٍ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم۔

ابورجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضہ ہمکو تعلیم قرآن دیا کرتے تھے اور ہم کو بٹھا دیتے حلقہ بناکر ان پر دو سفید کپڑے ہوتے۔ تو جب اقرء باسم ربک الذی خلق تلاوت کرتے تو فرماتے یہی سب سے پہلی وہ سورت ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی۔

وقال سعید بن منصور فی سننہٖ حدثنا سفیان عن عمرو بن دینارٍ عن عُبید بن عُمیرٍ قال جاءَ جبریلُ الی النّبیّ صلّی اللّٰہُ علیہِ وسلّم فقال لہٗ اِقرءْ قال وما اقرءُ فواللّٰہ ما انا بقارئٍ فقال اِقرءْ باسمِ ربّک الّذی خلق فکان یقولُ ھو اوّلُ ما نزل وعن مجاھدٍ انّ اوّل ما نزل من القراٰن اِقرءْ باسمِ ربک[۱]

اور سعید بن منصور نے بروایت سفیان عبید بن عمیر سے روایت کیا کہ جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے کہا پڑھیے آپ نے فرمایا اور میں کیا پڑھوں خدا کی قسم میں تو کچھ پڑھا ہوا نہیں ہوں جبریل نے کہا اقرء باسم ربک پڑھیے۔ تو بیان کرتے تھے کہ یہی سب سے پہلے قرآن کریم میں نازل ہونے والے الفاظ ہیں۔ اور مجاہد سے بھی منقول ہے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت اقرء باسم ربک ہے۔

حضرت جابر رضہ کی روایت کے بعض الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابر اس بات کے قائل ہیں کہ سب سے پہلے یا ایھا المدثر نازل ہوئی۔ چنانچہ ابوسلمہ رضہ[۲] سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے قرآن کا کون سا حصہ نازل ہوا فرمایا یا ایھا المدثر میں نے کہا یا ایھا المدثر یا اقرء باسم ربک۔ اس پر فرمانے لگے میں تو تم سے وہی بات بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن ص۲۴ ج۱ - [۲] صحیح بخاری و مسلم ۱۲

علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمائی۔

قال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم جَاوَرْتُ بِحِرَاءَ فَلَمَّا قَضَيْتُ جِوَارِي نَزَلْتُ فَاسْتَبْطَنْتُ الْوَادِيَ فَنَظَرْتُ أَمَامِي وَخَلْفِي وَعَنْ يَمِينِي وَشِمَالِي وَنَظَرْتُ إِلَى السَّمَاءِ فَإِذَا هُوَ يَعْنِي جِبْرِيلُ فَأَخَذَتْنِي رَجْفَةٌ فَأَتَيْتُ خَدِيجَةَ فَقُلْتُ دَثِّرُونِي فَدَثَّرُونِي فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے مجاورت (خلوت نشینی) اختیار کی غار حرا میں جب میں اپنی مدت خلوت نشینی پوری کر چکا تو میں (پہاڑ سے) اترا۔ اور بطن وادی (نشیب وادی) میں پہنچا تو میں نے اپنے سامنے دیکھا اور اپنے پیچھے اور دائیں بائیں پھر میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو ناگہاں دیکھا کہ جبریل ہیں (ان کو دیکھ کر مجھ پر بڑی ہیبت طاری ہوئی) حتیٰ کہ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں خدیجہ کے پاس واپس آیا اور کہا مجھ کو چادر (کمبل) اڑھاؤ۔ انھوں نے مجھ کو چادر اڑھا دی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا یاایھا المدثر قم فانذر۔

جمہور علمائے مفسرین نے اس روایت جابر کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ کسی نے بیان کیا کہ سوال یہ تھا کہ پوری سورت سب سے پہلی کونسی نازل ہوئی تو اسی حیثیت سے جواب دیا کہ سورت کاملہ یاایھا المدثر نازل ہوئی اور اقرء باسم ربك اگرچہ سب سے اول نازل ہوئی لیکن وہ صرف اول کی پانچ آیات نازل ہوئی تھیں۔ امام بخاری رح نے اس اشکال کو نہایت لطیف انداز میں حل فرمایا۔ ابن شہاب زہری کی تعلیق سے نقل کرتے ہوئے وھو یحدث عن فترۃ الوحی تو اس تعلیق کو ذکر کر کے یہ بات متعین فرما دی کہ جابر اس حدیث میں فترۃ وحی (یعنی وہ پورے تین سال کا زمانہ جو بعد اقرء باسم ربك کے نازل ہونے کے وحی کے نزول سے منقطع رہنے کا گذرا) کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ انقطاع وحی کے بعد سب سے پہلے یاایھا المدثر نازل ہوئی۔ بلکہ صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں اس کی تصریح مرفوعاً بھی موجود ہے۔ کتاب الادب میں ہے۔ قال جابرؓ سمعت رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ثم فتر الوحی فبینا انا امشی الخ

غرض معلوم ہوا کہ حضرت جابر یاایھا المدثر کی اوّلیت اسی حیثیت سے بیان کر رہے ہیں نہ اس حیثیت سے کہ حقیقی اولیت اقرء باسم ربك کو نہیں بلکہ یاایھا المدثر کو ہے۔

قرآن کریم کب نازل ہوا!

ابتدار وحی اور نزول قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بالاتفاق محدثین و مورخین اسی روز سے ہے جبکہ آپ کو خلعت نبوت و رسالت عطا کیا گیا وہ ماہ ربیع الاول میں دوشنبہ کا روز تھا۔ ابن عبد البر

۸۔ ربیع الاول کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ نزول عالم دنیا میں شروع ہوا۔ اور لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول بیک وقت رمضان المبارک میں ہوا۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ — رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں کہ نازل کیا گیا قرآن کریم

وقال تعالیٰ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ — اور فرمایا بے شک نازل کیا ہم نے قرآن لیلۃ القدر میں

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان ہی کے مہینہ میں تمام کتب سماویہ نازل کی گئیں۔

امام احمد اور بیہقی نے واثلہ بن الاسقع سے روایت کیا ہے کہ

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ لِسِتٍّ مَضَيْنَ مِنْ رَمَضَانَ وَالْإِنْجِيلُ لِثَلَاثَ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْهُ وَالزَّبُورُ لِثَمَانِ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْهُ وَالْقُرْآنُ لِأَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تورات نازل کی گئی جبکہ رمضان کی چھ تاریخ گذر چکی تھیں۔ اور انجیل تیرہ تاریخیں گذرنے پر اور زبور اٹھارہ تاریخ گذرنے پر اور قرآن نازل کیا گیا جبکہ رمضان کے چوبیس روز گذر چکے تھے۔ (یعنی پچیسویں شب میں)

جبریل امین اسی مناسبت سے رمضان ہی میں اتر کر قرآن کریم کا دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے تاکہ جس زمانہ میں حق تعالیٰ کے یہاں سے اس کا نزول ہوا اسی زمانہ میں اس کا تکرار و دور ہو جائے اور اس شکل سے اس کی حفاظت کی تجدید ہوتی رہے۔

کیفیت نزول قرآن

قرآن کریم کی کیفیت نزول میں مفسرین کے تین قول معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کریم آسمان دنیا کی طرف لیلۃ القدر میں بیک وقت تمام کا تمام نازل کر دیا گیا پھر اس کے بعد متفرق تیئیس ۲۳ برس کی مدت میں اترتا رہا۔ تیرہ سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں۔

(دوسرا قول) قرطبی مقاتل بن حبان سے نقل کرتے ہیں۔ قرآن کریم نازل کیا گیا آسمان دنیا کی طرف بیس سال کی بیس لیلۃ القدر میں یا تیئیس سال کی تیئیس لیلۃ القدر میں اس طرح کہ ہر سال کی لیلۃ القدر میں اس قدر حصہ کلام اللہ کا نازل کر دیا جاتا جتنا کہ اس سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا ہے۔

(تیسرا قول) یہ کہ ابتدا نزول تو لیلۃ القدر سے ہوئی اس کے بعد اوقات مختلفہ میں قرآن کی مختلف آیات اور سورتیں نازل ہوتی رہیں۔ قول اول مشہور ہے اور اسی کو جمہور مفسرین اور محدثین نے اختیار کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

---

[1] فتح الباری ج ۹ باب فضائل القرآن۔

انزل القرآن جملۃ واحدۃ الی السماء الدنیا فی لیلۃ القدر ثم نزل بعد ذلک فی عشرین سنۃ[1]۔

کہ قرآن کریم تمام کا تمام ایک ہی مرتبہ لیلۃ القدر میں آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا پھر اس کے بعد بیس سال کی مدت میں (کسور کو حذف کرتے ہوئے) نازل ہوتا رہا۔

علامہ ابوشامہ "المرشد الوجیز" میں بیان کرتے ہیں کہ روئے زمین پر قرآن کریم کو متفرق ٹکڑے ٹکڑے نازل کرنے کی حکمت خود حق تعالیٰ نے ظاہر فرما دی۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے کفار کا اعتراض نقل فرمایا۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ۔

کہ کافر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیوں نہ اتارا گیا قرآن کریم تمام کا تمام ایک ہی مرتبہ (کتب سابقہ کی طرح)

اور اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

کذلک لنثبت بہ فؤادک۔

ہم اسی طرح (نازل کرتے ہیں) تاکہ جما دیں اس وحی کے ساتھ آپ کے قلب کو۔

نیز قرآن کریم میں بہت سی جگہ مشرکین وکفار کے اعتراضات کا رد بھی کیا گیا۔ ان کے اعمال وعقائد کا ابطال بھی کیا گیا اور جو کچھ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور تدابیر کرتے قرآن میں ان کے تمام مکائد اور رازوں کو ظاہر فرمایا گیا اس وجہ سے حکمت اسی امر کو متقاضی ہوئی کہ مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا حصہ نازل ہوتا رہے۔ (واللہ اعلم)

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات اور سورتیں

بعض علماء مفسرین اور مؤرخین کے کلام سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قرآن میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ اس کا ثبوت کسی روایت صحیحہ اور سند متصل سے تو نہیں ملتا البتہ بعض مرسل روایتوں میں یہ مضمون آیا ہے کہ جبریل امین نے جس چیز کا سب سے پہلے پڑھنے کا امر کیا وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین الخ تھی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ مضمون نہ تو اپنی سند کے اعتبار سے صحیحین کی ان احادیث کے مقابل قابل ترجیح ہو سکتا ہے جن میں اقراء باسم ربک کی اولیت بیان کی گئی ہے اور نہ ہی تاریخی حیثیت سے جمہور کے مسلک اور مشہور قول سے متعارض ہو سکتا ہے۔ تاہم اگر کوئی صورت باہم تطبیق کی ہو سکے

[1] رواہ الحاکم فی مستدرکہ وقال صحیح علی شرط الشیخین (اتقان)

تو بہتر ہے۔ سیرت کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز ہر دور اور ہر زمانہ میں مقرر و ثابت رہی۔ معراج میں اگرچہ صلوات خمس کی فرضیت ہوئی۔ لیکن یہ امر ثابت ہے کہ قبل از معراج صبح و شام کی دو نمازیں مقرر تھیں اور کوئی نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ فاتحہ ام القرآن ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام قرآن کے لئے سورۂ فاتحہ اساس و بنیاد ہے۔ تو جس طرح تخم اپنے درخت کے لئے ایک وجود اجمالی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو تقدم ہے وجود شجرہ سے اسی طرح طبعی ترتیب کا اقتضا یہی ہو سکتا ہے۔ ام القرآن کو باعتبار نزول بھی تقدم ہو تمام قرآن پر تو بطور تاویل کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اسی مجلس میں نازل ہوئی ہو جس میں اقرء نازل ہوئی اس توجیہ کا قرینہ خود اسی مرسل روایت میں ہے۔ جب تیسری مرتبہ جبریل امین کے دبانے کے بعد اقرء باسم ربك کہنے پر آپ نے فرمایا ماذا اقرء کہ کیا پڑھوں میں؟ کیونکہ اقرار تو امر ہے انشاء اور ایجاد قرأت کے لئے تو آپ نے سوال فرمایا مقروؔ کا کہ کیا چیز پڑھی جائے تو اس پر جبریل نے کہا

قل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین الخ۔ — کہئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین ختم سورۃ تک۔

یہ تفصیل تو مطلق اولیت کے متعلق تھی۔ اصول تفسیر میں ائمہ مفسرین نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ قرآن کریم میں وارد شدہ مضامین و احکام میں کون سی آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں۔ مسئلہ جہاد و قتال میں سب سے پہلے آیۃ

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الخ نازل ہوئی۔ — اجازت دیدی گئی (جہاد کی) ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

حاکم مستدرک میں ابن عباس سے یہی نقل کرتے ہیں۔

اور ابن جریر ابو العالیہ سے یہی نقل کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مسئلہ جہاد کے متعلق مدینہ منورہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ — اور (اے مسلمانو) قتال کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے قتال (خونریزی) کرتے ہیں۔

اور مسئلہ تحریم خمر میں سب سے پہلے آیت يسئلونك عن الخمر والميسر قل فيهما إثم

الاتقان فی علوم القرآن ص ۲۷ ج ۱

کبیر و منافع للناس الخ نازل ہوئی۔ دریافت کرتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ منافع بھی ہیں لوگوں کے لئے۔ لیکن ان کا گناہ بالمقابل ان کے منافع کے بہت ہی بڑا ہے)

پھر اس کے بعد دوسری آیت

یا ایھا الذین امنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ۔ (نازل ہوئی) (اے ایمان والو! قریب بھی نہ جاؤ نماز کے اس حالت میں جبکہ تم نشہ میں ہو۔)

پھر تیسری مرتبہ حق تعالےٰ نے اس کی حرمت قطعیہ اور گندگی کا نہایت صاف اور واضح لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ شراب کی حرمت ناپاکی اور دین و دنیا کے اعتبار سے اس کی مضرتوں میں کسی کو ادنیٰ تردد بھی باقی نہ رہے

انما الخمر والمیسرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (جز- این نیست کہ شراب اور جوا اور بت اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطان کے کام ہیں سو ان باتوں سے بالکل دور رہو۔ امید ہے کہ تم فلاح و کامیابی حاصل کرلوگے۔)

اور مسئلہ قتل میں پہلی آیت

ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل۔ الخ ہے

حلت و حرمت طعام کے بارہ میں سب سے پہلے

قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ اودماً مسفوحاً اولحم خنزیر۔ الخ

پھر۔ فکلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیبا الخ (النحل)

اس کے بعد۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ المیتۃ والدَّم ولحم الخنزیر وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہ الخ (بقرہ)

اور آیۃ مائدہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ المیتۃُ والدَّمُ الخ۔ نازل ہوئی۔

امام بخاری نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ سب آیات قرآنیہ میں سب سے پہلے سجدہ سورۃ والنجم پر واجب ہوا[1] (اولیات قرآن کی تفصیل کے لئے کتب اصول تفسیر کی مراجعت فرمائی جائے)

قرآن کریم میں سب سے آخری آیت کونسی ہے ؟ اس بارہ میں روایات سے مختلف آیتوں کا علم ہوتا ہے صحیحین میں براء بن عازب سے مروی ہے کہ آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَکَ قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ ہے اور سورتوں میں سب سے آخری سورت "براءۃ" ہے۔

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آخری آیت جو نازل ہوئی وہ آیت "الربوا" ہے یعنی یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا الخ عکرمہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ ابن عباس فرمایا کرتے تھے قرآن میں جو سب سے آخری آیت نازل ہوئی وہ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ ہے اور اس آیت کے نازل ہونے اور آنحضرت کے رحلت فرمانے کے درمیان صرف اکیاسی دن کا فصل ہے۔ اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے بعد آنحضرت صرف نو راتیں حیات رہے۔

امام مسلمؒ نے ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا کہ آخری سورت جو نازل ہوئی وہ "اذا جاء نصر اللہ والفتح" ہے۔ اور ابن عمرؓ کی صحیح الاسناد روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت الیوم اکملت لکم دینکم ہے جو حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن شام کے وقت نازل ہوئی[2]۔

ان نقول اور حوالوں میں باہم اگرچہ اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ادنیٰ تامل اور فکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے آخریت کا بیان مختلف حیثیتوں سے ہو رہا ہے۔ کہ احکام دین۔ فرائض اسلام اور مسائل حلال وحرام کی تکمیل آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل کرکے فرمادی گئی اور یہ بتادیا گیا کہ اسلام عقائد عبادات معاملات اخلاق تمدن ومعاشرت اور سیاست کے اعتبار سے مکمل کردیا گیا۔ اور احکام بیع وشرا اور مسائل حرمت ربوا میں آخری آیت واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ نازل ہوئی اور طویل طویل سورتوں میں جو بیک وقت نازل ہوئیں ان میں آخری سورت "براۃ" ہے۔ اور وہ آخری سورت جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم دنیا سے کوچ فرمانے کی خبر ہے وہ سورۃ "اذا جاء نصر اللہ والفتح" ہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں واحدی کی سند سے علی بن الحسین کا اثر نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جو سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی وہ "اقرأ باسم ربک" ہے (جیسے کہ مشہور ہے) اور مکہ میں جو آخری سورت نازل ہوئی وہ سورۃ "مؤمنون" ہے۔ اور مدینہ منورہ میں سب سے پہلے "ویل للمطففین" اور سب سے آخر میں سورۃ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص۲۷ ج۱ [2] الاتقان فی علوم القرآن ص۲۹

"براءۃ" نازل ہوئی۔ لیکن حافظ ابن حجر شرح بخاری میں مدینہ میں پہلے نازل ہونے والی سورت "بقرہ" بیان کی ہے اور یہ کہ اس پر ائمہ تفسیر کا اتفاق ہے۔

مکّی اور مدنی آیات

ائمہ تفسیر رحمہم اللہ سے آیات مکّی اور مدنی کی تفسیر میں متعدد اقوال منقول ہیں۔

اول قول یہ کہ مکّی آیت وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اگرچہ بعد ہجرت نازل ہو۔ اور مدنی وہ آیت ہے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ اس تحقیق پر یہ بات لازم آئے گی کہ جو آیات دوران سفر نہ مکہ میں نازل ہوئیں اور نہ مدینہ منورہ میں تو وہ آیات نہ مکیہ ہوں اور نہ مدنیہ بلکہ مکی اور مدنی آیات کے درمیان واسطہ رہے گا۔ طبرانی ابوامامہ سے روایت کرتے ہیں کہ

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انزل القرآن فی ثلٰثۃ امکنۃ مکۃ والمدینۃ والشام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کریم تین جگہوں میں نازل ہوا مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور شام۔

حافظ ابن کثیر بیان فرماتے ہیں کہ شام سے مراد تبوک ہے۔ غزوہ تبوک میں دوران سفر بہت سی آیات نازل ہوئیں۔ اور مکہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کے نواحی واطراف شامل ہیں۔ جیسے منیٰ عرفات۔ حدیبیہ وغیرہ اور اسی طرح مدینہ کے ساتھ اس کے مضافات ملحق ہیں جیسے بدر، احد، سلع وغیرہ۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مکّی آیات ان کو کہا جائے گا جن میں اہل مکہ کو خطاب ہیں اور مدنی آیات وہ جن میں اہل مدینہ کو خطاب ہے (یہ قول غیر معروف ہے)

تیسرا قول جو ائمہ تفسیر کے نزدیک پسندیدہ اور مشہور ہے وہ یہ کہ مکی آیات وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں، خواہ مکہ سے باہر کسی دوسری جگہ نازل ہوئی ہوں۔ اور مدنی آیات وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں خواہ وہ مکہ مکرمہ ہی میں نازل ہوئی ہوں۔ تو اس تحقیق پر وہ آیات جو حدیبیہ سے واپسی پر یا فتح مکہ کے سال ۸ھ میں یا حجۃ الوداع میں مقام عرفات ومنیٰ میں نازل ہوئیں وہ سب مدنیہ ہوں گی۔ کیونکہ ان کا نزول ہجرت کے بعد ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر مفسرین ان تمام آیات اور سورتوں کو مدنی شمار کرتے ہیں۔

مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان مفسرین نے طرز بیان معانی اور مضامین کے اعتبار سے مختلف وجوہ فرق بیان کی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں بیشتر اصول اور کلیات دین کی تفصیل ہے۔ توحید ونبوت۔ حشر ونشر جزا، وسزا۔ انذار وتبشیر اور تذکیر وتحذیر سے متعلق مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ جگہ جگہ حق تعالےٰ کی عظمت وہیبت اور اس کے قہر وعذاب کی اہمیت بیان کی گئی اور اہل جہنم کے احوال سنائے گئے۔ بار بار عبرت ونصیحت کے انداز میں خدا اور خدا کے پیغمبروں اور آخرت پر ایمان لانے کے لئے حکم دیا گیا اور بار بار غور وفکر کی دعوت دی گئی

کہ یہ لوگ خود اپنی عقل اور بصیرت سے حق کو سمجھ سکیں۔ بت پرستی کی مذمت اور دلائل توحید ایسے عبرت آموز طریقہ سے بیان کئے کہ ادنیٰ سمجھ رکھنے والے پر بھی یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اپنے ہاتھوں سے گھڑے ہوئے بتوں کی عبادت کرنا یقیناً انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے۔

حقائق معنویہ کو کثرت سے امثال کے رنگ میں اس طرح بیان فرمایا گیا کہ وہ معنوی حقیقت اور باطنی امر مُشاہد و محسوس ہو کر نظروں کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ پھر ان تمام امور کے لئے تعبیر بھی ایسی اختیار کی گئی کہ ہر ہر کلمہ اور ہر ہر ترکیب اپنے انداز بیان سے دنیا کے مایۂ ناز فصحاء و بلغاء اور شعراء و خطباء کو مقابلہ سے عاجز کر رہی تھی۔ اس لئے کہ ان آیات میں بالخصوص خطاب اہل مکہ کو تھا اور وہ اپنی شاعری اور فصاحت و بلاغت پر اس قدر نازاں تھے کہ اپنے قصائد بیت اللہ کی دیواروں پر ہَل من مُبارز (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کے اعلان کے ساتھ لٹکایا کرتے

اس کے بالمقابل مدنی آیات میں مضامین نہایت سہل تعبیر اور واضح انداز میں بیان کئے گئے کیونکہ آیات مدنیہ میں اصل مخاطب اہل کتاب تھے اس وجہ سے حقائق کو بسط و تفصیل اور دلائل کے رنگ میں پیش کیا گیا۔ اور بہت سی آیات میں ان کو محاجہ اور مناظرہ کی دعوت دی گئی۔ ان کے حسد و عناد۔ غرور و تکبر تلبیس بین الحق والباطل۔ کتمانِ حق اور تحریف آیات اللہ کو ظاہر کیا گیا۔ تورات و انجیل کی بشارتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کی حقانیت ثابت کی گئی۔

نیز قرآن کریم کا تورات و انجیل کے لئے مؤید ہونا بیان کیا گیا۔ اور تمام کتب سماویہ کا اصول دین میں اتفاق ظاہر کرتے ہوئے اہل کتاب کو ایمان باللہ والرسول کی دعوت دی گئی۔ اور یہ کہ تورات و انجیل پر ایمان رکھنے کا مقتضیٰ رسول آخرالزماں پر ایمان لانا اور قرآن کو تسلیم کرنا ہے۔

اس کے علاوہ آیات مدنیہ کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ ان میں عبادات و معاملات سے متعلق احکام عملیہ حلال و حرام کے مسائل کثرت سے ذکر کئے گئے غزوات و غنائم احکام خراج و جزیہ مسائل فیٔ اور اس کے مصارف۔ اصول مملکت کی تحقیق و توضیح کی گئی۔

ابن سعد طبقات میں بروایت واقدی ابن عباس رضؓ کی روایت بیان کرتے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ میں نے ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا کہ مدینہ منورہ میں قرآن کی کتنی سورتیں نازل ہوئیں فرمایا ستائیس سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں باقی تمام قرآن مکہ مکرمہ میں نازل ہوا[1]۔

شیخ سیوطی ؒ اور اکثر مفسرین نے سورۂ فاتحہ کو ان سورتوں میں شمار کیا ہے جنکے مکی یا مدنی ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ گذشتہ اوراق میں یہ چیز قارئین کی نظر سے گذر چکی کہ بعض مرسل روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ جس مجلس میں اقرأ باسم ربک

---

[1] بحوالہ الاتقان فی علوم القرآن ص۹ ج۱

نازل ہوئی اسی مجلس میں سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔

آیۃ ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی والقراٰن العظیم سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ جمہور کے نزدیک سبعا من المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور یہ سورۂ حجر کی ایک آیت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی تو مکہ میں نازل شدہ سورت میں صیغہ ماضی کے ساتھ سورۂ فاتحہ کے دیے جانے کا انعام بیان فرمانا اسی کا قرینہ ہے کہ وہ مکی زندگی میں سورۂ حجر کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوچکی تھی۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے[۵۱]

نزلت فاتحۃ بمکۃ من کنز تحت العرش — کہ سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ایک ایسے خزانہ سے جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔

اس کے بالمقابل مجاہد سے یہ منقول ہے کہ سورۂ فاتحہ مدنیہ ہے[۵۲]۔ اور بعض ائمہ نے تکرار نزول کا قول اختیار کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ایک مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی پھر دوسری مرتبہ شرف و فضیلت کی بنا پر مدینہ منورہ میں بھی نازل کی گئی۔

(سورتوں کی ترتیب نزول)

ابن الفریس نے فضائل قرآن میں ابن عباس سے روایت تخریج کی جس میں سورتوں کی ترتیب باعتبار نزول اس طرح بیان کی ہے۔

اقرء باسم ربک[۱]۔ ن[۲]۔ یاایہا المزمل[۳]۔ یاایہا المدثر[۴]۔ تبت یدا ابی لہب[۵]۔ اذا الشمس کورت[۶]
سبح اسم ربک الاعلیٰ[۷]۔ واللیل[۸]۔ اذا یغشیٰ[۹]۔ والفجر[۱۰]۔ والضحیٰ[۱۱]۔ الم نشرح[۱۲]۔ والعصر[۱۳]۔ والعادیات[۱۴]
انا اعطیناک[۱۵]۔ الہاکم التکاثر[۱۶]۔ ارأیت[۱۷]۔ قل یاایہا الکافرون[۱۸]۔ الم ترکیف فعل[۱۹]۔ قل اعوذ برب الفلق[۲۰]
قل اعوذ برب الناس[۲۱]۔ قل ھو اللہ احد[۲۲]۔ والنجم[۲۳]۔ عبس[۲۴]۔ انا انزلنا[۲۵]۔ والشمس وضحاھا[۲۶]
والسماء ذات البروج[۲۷]۔ والتین[۲۸]۔ لایلاف قریش[۲۹]۔ القارعۃ[۳۰]۔ لا اقسم بیوم القیمۃ[۳۱]۔ ویل لکل ہمزۃ[۳۲]
والمرسلات[۳۳]۔ ق[۳۴]۔ لا اقسم بہذا البلد[۳۵]۔ والسماء والطارق[۳۶]۔ اقتربت الساعۃ[۳۷]۔ ص[۳۸]۔ الاعراف[۳۹]
قل اوحی الی[۴۰]۔ یٰس[۴۱]۔ الفرقان[۴۲]۔ سورۃ الملائکۃ[۴۳]۔ کھیعص[۴۴]۔ طہٰ[۴۵]۔ الواقعہ[۴۶]۔ الشعراء[۴۷]۔ طس
سلیمان (النمل)[۴۸]۔ طسم[۴۹]۔ القصص[۵۰]۔ بنی اسرائیل[۵۱]۔ یونس[۵۲]۔ ھود[۵۳]۔ یوسف[۵۴]۔ الحجر[۵۵]۔ الانعام[۵۶]
الصافات[۵۷]۔ لقمان[۵۸]۔ سبا[۵۹]۔ الزمر[۶۰]۔ حم المؤمن[۶۱]۔ حم السجدہ[۶۲]۔ حم عسق[۶۳]۔ حم الزخرف[۶۴]۔
الدخان[۶۵]۔ الجاثیہ[۶۶]۔ والذاریات[۶۷]۔ الغاشیۃ[۶۸]۔ الکہف[۶۹]۔ النحل[۷۰]۔ انا ارسلنا نوحا[۷۱]۔ سورۂ ابراہیم[۷۲]
الانبیاء[۷۳]۔ المؤمنون[۷۴]۔ الم تنزیل السجدہ[۷۵]۔ والطور[۷۶]۔ تبارک الذی بیدہ الملک[۷۷]۔ الحاقہ[۷۸]۔

---

۵۱ الاتقان ص۱۲ ج ۱۔ ۵۲ علامہ سید محمود الوسی اس قول کی تردید کرتے ہیں اور بیان فرماتے کہ جمہور صحابہ سے قول مکیہ اول مروی ہے اور یہی ابن عباس کا مسلک ہے" روح المعانی ج۱ ص۳۱۔

سأل سائل ۔ عمّ یتساءلون ۔ والنازعات ۔ اذا السماء انفطرت ۔ اذا السماء انشقت ۔ الروم
العنکبوت ۔ ویل للمطففین ۔

یہ وہ سورتیں ہیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں ۔ اور مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی ترتیب نزولی یہ ہے کہ

سورۂ بقرہ ۔ الانفال ۔ آل عمران ۔ الاحزاب ۔ ممتحنہ ۔ النساء ۔ اذا زلزلت ۔ حدید
القتال ۔ الرعد ۔ الرحمٰن ۔ الانسان ۔ الطلاق ۔ لم یکن ۔ الحشر ۔ اذا جاء نصر اللہ
الحج ۔ المنافقون ۔ المجادلہ ۔ الحجرات ۔ التحریم ۔ الجمعہ ۔ التغابن ۔ الصف
الفتح ۔ المائدۃ ۔ براءۃ ۔ [1]

مکی سورتوں کی کل تعداد ۸۷

مدنی سورتوں کی کل تعداد ۲۷

کل تعداد ۱۱۴

مجموعی تعداد قرآن کریم کی تمام سورتوں کی ایک سو چودہ (۱۱۴) ہے ۔ بروایت عبداللہ بن عباس رضؓ عبداللہ بن مسعود رضؓ حضرت عثمان رضؓ علی بن ابی طالب رضؓ اور عبداللہ بن عمر رضؓ ۔

بیہقی دلائل النبوۃ میں بیان کرتے ہیں کہ بعض سورتیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں ان میں چند آیات مدنیہ ہیں جو انہی کے ساتھ ملحق کردی گئیں ۔ بعض آیات کا استثناء تو نقل سے ثابت ہے اور بعض مواقع پر بعض مفسرین اجتہادی طور پر مکی سورتوں سے بعض آیات کا استثنا کرلیتے ہیں ۔ حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ ائمہ نے اس چیز کا تو اہتمام کیا ہے کہ مکی سورتوں کے درمیان آیات مدنیہ کو متعین کریں لیکن مدنی سورتوں میں آیات مکیہ کی تحقیق اور تفتیش کی طرف توجہ بہت کم کی ہے ۔ بطور مثال چند سورتیں مذکور ہیں

سورۃ الاعراف	مکیہ	بجز آیۃ	واسألهم عن القریۃ التی
سورۂ ابراہیم	مکیہ	بجز آیات	الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ تا وبئس القرار
سورۂ اسراء	مکیہ	بجز آیۃ	ویسئلونک عن الروح ۔

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج۱ ۔ یہ تفصیل سورتوں کی ترتیب نزولی کی و مدنی ہونے کی حیثیت سے ابن الغریس نے بروایت ابن عباس رضؓ بیان کی ہے ۔ بعض دوسری روایات میں بعض سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے ۔ اور ترتیب میں بھی قدرے اختلاف و فرق ہے ۔ ان چند اوراق کی محدود وسعت میں تفصیل و تحقیق کی گنجائش نہیں ۔ صرف ایک روایت سے ثابت شدہ تعداد بیان کردی گئی ۔

سورۂ انفال مدنیہ بجز آیۃ واذ یمکر بک الذین کفروا۔
سورۂ حج مدنیہ جس میں چند آیات علی حسب اختلاف الاقوال مکیہ ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امت محمدیہ (علی صاحبہا الف الف تحیۃ) کے واسطے قرآن کریم دین اور دنیا کا بہترین سرمایہ اور عظیم الشان دولت ہے۔ اور معارف وحقائق کا ایک ایسا ناپیداکنار سمندر ہے کہ اس کی حدود نہایت تصور وخیال میں بھی نہیں سما سکتی۔ اس لئے ہر دور میں ائمہ تفسیر اور علماء نے قرآن کریم کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ سمجھا۔ اور کلام اللہ کے الفاظ و معانی کی وہ خدمت کی کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال ناممکن ہے۔

چنانچہ مکی اور مدنی آیات کی تحقیق وتنقیح کے ساتھ روایات وآثار کا استیعاب کر کے یہ بھی تحقیق کی گئی کہ کلام اللہ کی کون کون سی آیات سفر میں نازل ہوئیں اور کون سی حضر میں اور کون سی آیات بیداری کے علاوہ بستر مبارک اور حالت نوم میں نازل ہوئیں اور کون سی آیات زمین وآسمان کے درمیان اور کون سی آسمانوں پر اور کونسی زمین کے نیچے کسی غار میں نازل ہوئیں۔ اور کون سی موسم سرما میں اور کونسی موسم گرما میں تفصیل کے لئے الاتقان شیخ جلال الدین سیوطی از صـ۱۵ تا صـ۲۹ جلد ۱ ملاحظہ فرمائیں)

بطور مثال چند آیات کا محل نزول تحریر ہے۔

آیت۔ یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ۔ الخ	حذیفہ رضہ سے سند بزار میں مروی ہے کہ دوران سفر نازل ہوئی۔
" فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا (آیۃ تیمم)	عائشہ سے صحیحین میں مروی ہے کہ غزوہ مریسیع سے واپسی پر دوران سفر نازل ہوئی۔
آیات انا فتحنا لک فَتْحًا مبینا۔	حدیبیہ سے صلح کے بعد واپسی پر سفر میں نازل ہوئیں۔
" الیوم اکملت لکم دینکم۔	ابن عمر سے منقول ہے کہ جمعہ کے روز عرفات کے میدان میں نازل ہوئی۔
" اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ۔	بروایت بیہقی ایام تشریق کے درمیان نازل ہوئی جبکہ آپ ناقہ قصواء پر سوار تھے جس سے آپ نے سمجھا کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے۔
" وما منا الا لہ مقام معلوم اور واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا۔	لیلۃ المعراج میں نازل ہوئیں۔ ابن العربی بیان کرتے ہیں کہ شاید آسمان وزمین وزمین کے درمیان فضا میں نازل ہوئیں۔

آیات آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ ختم سورۂ بقرہ کی دو آیتیں ۔	لیلۃ المعراج میں سدرۃ المنتہیٰ سے بلندی پر جانے کے بعد کسی ایسے مقام پر نازل ہوئیں جہاں حق تعالیٰ کی خصوصی تجلیات کا ورود و نزول ہو رہا تھا
؍؍ سورۂ والمرسلات	ابن مسعود سے مروی ہے کہ غار میں نازل ہوئی ۔
؍؍ واللہ یعصمک من الناس ۔	آپ بستر پر اپنی چادر میں تھے کہ نازل ہوئی ۔
؍؍ انّا اعطیناك الکوثر ۔	آپ بحالتِ نوم تھے بیدار ہوئے تو مسکرا رہے تھے اور فرمایا کہ مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی تو معلوم ہوا کہ سونے کی حالت میں نازل ہوئی اور بیداری کے بعد اسکی تلاوت فرما کر سنایا ۔
؍؍ کلالۃ (اولیٰ سورۂ نسا)	موسم سرما ۔
؍؍ کلالۃ (ثانیہ سورۂ نسا)	موسم گرما ۔

اسماءِ قرآنِ کریم

فَاِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ

قرآن کریم حق تعالیٰ کا کلام اور وہ کتاب عزیز ہے "لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ" کہ باطل نہ آسکتا ہے اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے ۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت قدیمہ اور ازلیہ ہے ۔ اس لئے حق تعالیٰ کی ذات جس عظمت و برتری کی مستحق ہے اس کا کلام بھی اسی عظمت اور برتری کا مستحق ہوگا ۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جن سے کلام الٰہی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے جس کو ہر انسان اپنے اندازِ فہم و استعداد کے مطابق سمجھ سکتا ہے ۔ اسی لئے اللہ رب العزت نے قرآن کریم کو بہت سے ناموں کے ساتھ موسوم کیا ۔ جیسے اللہ نے اپنی ذات بابرکت کے لئے بہت سے نام تجویز کئے اس لئے اپنی کتاب کے بھی متعدد نام متعین فرمائے تا کہ ان عنوانات کو دیکھ کر ہی اس کی عظمتوں کی طرف ذہن متوجہ ہو جائے ۔

ابوالعالی عزیز بن عبدالملک بیان کرتے ہیں[1] ۔ کہ قرآن کریم کے پچپن نام ہیں جو آیات قرآنیہ سے مستفاد ہیں جاحظ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنی کتاب کا نام "قرآن" ایسا نرالا اور بے مثال نام رکھا ہے کہ نہ عرب کے لوگ اپنے کلام کے مجموعوں کا یہ نام رکھتے تھے ۔ اور نہ ہی دنیا میں کسی کتاب کا یہ نام کبھی رکھا گیا[2] ۔

قرآن

ائمہ لغت اور مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ لفظ قرآن اسم علم غیر مشتق ہے یا اسم مشتق ۔ امام شافعیؒ

---

[1] کتاب البرہان بحوالہ الاتقان شیخ سیوطیؒ [2] الاتقان ص ۱۱۵ ج ۱

اور دوسرے بعض ائمہ سے یہ منقول ہے کہ قرآن علم غیر مشتق ہے اور یہ لفظ خاص ہے اللہ کے اس کلام کے لئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ اس تقدیر پر لفظ قرآن غیر مہموز پڑھا جائے گا۔ بیہقی نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور شیخ اشعری سے بھی یہی منقول ہے۔ ائمہ تفسیر کی ایک جماعت اشتقاق کا قول اختیار کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ یہ ماخوذ ہے "قَرَنْتُ الشيیٔ بِالشیئِ" سے جس کے معنی ہیں کہ ایک شئی کو دوسری کے ساتھ جمع کر دیا۔ تو اس اعتبار سے قرآن کو قرآن آیات اور سورتوں کے باہمی اقتران اور انضمام کی وجہ سے کہا جائے گا۔ اس قول کی بنا پر اصل مادہ قَرْن ہوگا اور لفظ قرآن بلا ہمزہ ہی کے پڑھا جائے گا۔ زجاج کہتے ہیں کہ اشتقاق قرآن قَرْءٌ سے ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں "قَرأتُ المَاءَ فِی الحوضِ" محاورہ حوض میں پانی جمع کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور قرآن کو قرآن سورتوں اور آیات کے جامع ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اصل کلمہ اگرچہ مہموز ہے لیکن تخفیف کی وجہ سے ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ امام راغبؒ وجہ تسمیہ میں یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن چونکہ تمام کتب سابقہ کے ثمرات اور تمام انواع علوم کو جامع ہے اس لئے قرآن کہا جاتا ہے۔

اللحیانی اور بعض ائمہ کے نزدیک قرآن مصدر ہے غفران کی طرح مقرو (قرآت کردہ) کو مصدر سے تعبیر کرتے ہوئے قرآن عنوان اختیار کیا گیا۔[1]

وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا	وجہ تسمیہ	اسماء قرآن
		۱ القرآن العظیم (ظاہر)
ولقد اتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم۔		۲ السبع[2] المثانی
یٰس والقرآن الحکیم		۳ القرآن الحکیم
وانزلنا التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان۔ نزل الفرقان علی عبدہ۔	اس لئے کہ حق و باطل میں فارق ہے۔	۴و۵ الفرقان
حٰم والکتاب المبین۔	ظاہر۔	۶-۷ کتاب و مبین
انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون۔	اس لئے کہ کرامت اور بزرگی والی کتاب ہے	۸ - کریم
حتی یسمع کلام اللہ	ظاہر	۹ - کلام اللہ
وانزلنا الیکم نورا مبینا	اس لئے کہ اللہ کا نور ہے۔	۱۰- نور

[1] روح المعانی ص ۸ ج ۱۔ الاتقان ص ۵۰ ج ۱

[2] اس لئے کہ یہ سات آیتیں وہ ہیں جن کو نماز میں دوبارہ دوبارہ پڑھا جاتا ہے۔

۱۱-۱۲ ھدی و رحمۃ	اس لئے کہ ہدایت و رحمت ہے۔	ھدی و رحمۃ للمؤمنین۔
۱۳-۱۴ شفاء۔ موعظۃ	" روحانی شفا اور نصیحت ہے۔	قد جاء تکم موعظۃ من ربکم وشفا لما فی الصدور۔
۱۵-۱۶ ذکر۔ مبارک	" بابرکت ہے اور ذکر ہے۔	ھٰذا ذِکرٌ مُبارَکٌ اَنزَلنٰاہُ۔
۱۷ عَلِیؐ	" برتری اور بلندی والا ہے۔	وَاِنَّہٗ فِی اُمِّ الکِتَابِ لَدَینَا لَعَلِیٌّ حَکِیمٌ۔
۱۸ حِکمۃ	" سراپا حکمت ہے۔	حِکمَۃٌ بَالِغَۃٌ فَمَا تُغنِ النُّذُر۔
۱۹ حکیم	" " " "	تِلکَ آیات الکتاب الحکیم۔
۲۰ مُہَیمِن	" وہ نگہبان و گواہ اور برتر ہے عالم کے لئے	مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومہیمنا علیہ
۲۱ صراط مستقیم	" تمام عالم کے واسطے سیدھا راستہ ہے۔	اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُستَقِیماً۔
۲۲ قَیِّم	" اس کی تعلیم نگراں ہے عالم کے لئے	ولم یجعل لہٗ عِوَجًا قَیِّمًا لینذر
۲۳ قول فصل	" اس کی ہر بات قول فیصل ہے۔	انہٗ لقول فصل وما ھو بالھزل
۲۴ نبأٌ عظیم	" اس کی ہر بات عظیم خبر ہے	قل ھو نبأٌ عظیم عن النباء العظیم الذی ھم فیہ مختلفون۔
۲۵-۲۶ احسن الحدیث مثانی متشابھا۔	اس کی ہر بات بہترین ہے۔ عبرت کیلئے بار بار لوٹا کر بیان کیا گیا اور بلاغت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہے۔	اللہ نزل احسن الحدیث کتابًا متشابھا مثانی۔
۲۷ تَنزِیل	" آسمان سے اتارا گیا۔	وانہٗ لتنزیل رب العالمین۔
۲۸ روح۔	اس لئے کہ حیات ہے انسانوں کے قلوب کیلئے	اوحینا الیک روحًا من امرنا۔
۲۹ وحی		انما انذرکم بالوحی۔
۳۰ عربی	اس لئے کہ عربی زبان میں ہے۔	قرآنا عربیاً۔
۳۱ بصائر	" اس کی ہر بات بصیرت ہے	ھٰذا بصائر للناس۔
۳۲ بیان	" اس کی ہر تعلیم ظاہر ہے۔	ھٰذا بیان للناس وھدی وموعظۃ۔
۳۳ العلم	" سراپا علم ہے۔	من بعد ما جاءک من العلم۔
۳۴ الحق	" " حق ہے۔	ان ھٰذا لھو القصص الحق۔
۳۵ ھادی	" عالم کے لئے رہنما ہے۔	اِنَّ ھٰذا القرآن یھدی۔

اسماء قرآن	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا
۳۶ عَجَبٌ	اس لئے کہ وہ دنیا کو اپنے حقائق و معارف سے حیرت و تعجب میں ڈالنے والا ہے۔	انا سمعنا قرآنا عجبًا۔
۳۷-۳۸ تبصرۃ۔ ذکریٰ۔	اس لئے کہ نصیحت ہے۔	تبصرۃ وذکریٰ لکل عبد منیب۔
۳۹ العروۃ الوثقیٰ	" ہدایت اور عمل کیلئے ایک مضبوط حلقہ ہے	فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ۔
۴۰ صدق	" سراپا صداقت ہے۔	والذی جاء بالصدق۔
۴۱ عدل	" سراپا انصاف ہے۔	وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا۔
۴۲ اَمْر	" اللہ کا حکم ہے	ذٰلک امر اللہ انزلہ الیکم۔
۴۳ مُنادی	" پکارنے والا ہے حق کی طرف	سمعنا منادیا ینادی للایمان۔
۴۴-۴۵ ھدی۔ بشریٰ	" ہدایت ہے اور اہل ایمان کیلئے بشارت ہے	ھدی وبشریٰ للمؤمنین۔
۴۶ مجید	" مجد اور بزرگی والا ہے۔	بل ھو قرآن مجید۔
۴۷ الزبور	" اس میں علوم ہدایت جمع کردئے گئے	ولقد کتبنا فی الزبور (بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق)
۴۸-۴۹ بشیر و نذیر	" مؤمنین کو بشارت ہے اور کافروں کو دھمکی	قرآنا عربیا لقوم یعلمون بشیرا ونذیرا۔
۵۰ عزیز	" عزت و مرتبہ والا ہے	انہ لکتاب عزیز۔
۵۱ بلاغ	" پیغام نصیحت ہے۔	ھٰذا بلاغ للناس۔
۵۲ قصص	" اس میں واقعات ہیں امم سابقہ کے	ان ھٰذا لھو القصص الحق۔
۵۳-۵۴ صحف مکرمہ، " مرفوعہ، مطہرہ	" قرآن عزت والے، پاکیزہ اور بلند مرتبہ والے صحیفے ہیں۔	فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ۔
۵۵ الکتاب	" دنیا کی کتابوں میں درحقیقت قرآن ہی کتاب کہلانے کا مستحق ہے۔	ذٰلک الکتاب لاریب فیہ۔

تعداد آیات وحروف اور حرکات وسکنات

معجزات اسلام میں سے یہ چیز عظیم ترین معجزہ ہے کہ علماء امت نے قرآن کریم کے علوم ومعارف میں سے کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں چھوڑا کہ اس پر مستقل مستقل تصنیفیں نہ فرمائی ہوں۔ چنانچہ رسم الخط اور سورتوں اور آیات وحروف وکلمات کے اعداد کے عنوان پر بہت سے کتابیں لکھی گئیں۔ اور متقدمین ومتاخرین مستقل تصنیفیں فرماتے رہے۔ حافظ ابن کثیر اور شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں ابوعمرو الدانی۔ نے "البیان" اور ابوالعباس راکشی نے "الدلیل فی مرسوم خط التنزیل" لکھی جس میں قرآن مجید کی سورتیں، آیات، کلمات حروف، اعراب اور حتیٰ کہ لفظوں کو بھی شمار کرلیا ہے۔ اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے۔

جمہور قرأ کے نزدیک قرآن کریم کی سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) ہے باعتبار شمار حضرت عثمان۔ عبداللہ بن مسعود۔ علی بن طالب۔ ابن عباس۔ عبداللہ بن عمر۔ انس بن مالک۔ عائشہ رضی اللہ عنہم

تعداد رکوعات	پانچسو چالیس	۵۴۰
تعداد آیات کلام اللہ	چھ ہزار	۶۰۰۰
" " دیگر بعض ائمہ کے نزدیک	چھ ہزار دوسو چار	۶۲۰۴
" " " " "	چھ ہزار دوسو انیس	۶۲۱۹
" " " " "	چھ ہزار دوسو پچیس	۶۲۲۵
" " ابوعمرو الدانی کے نزدیک	چھ ہزار دوسو چھتیس	۶۲۳۶

جمہور کا یہی قول ہے اور امام کسائی نے اسی عدد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے [1]

کل تعداد کلمات قرآن۔	بروایۃ فضل بن شاذان	۷۷۴۳۹
" حروف قرآن	" عبداللہ بن کثیر عن مجاہد	۳۲۱۱۸۰
" حروف قرآن	" فضل بن عطار	۳۲۳۰۱۵
" حروف قرآن	" ابومحمد الحمانی عن الحجاج	۳۴۰۷۴۰

تعداد فتحات	۵۳۲۴۲	تعداد ضمات	۸۸۰۴
" کسرات	۳۹۵۸۲	" مدات	۱۷۷۱
" تشدیدات	۱۲۵۲	" نقاط	۱۰۵۶۸۴

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد اول۔ الاتقان فی علوم القرآن احکام القرآن للقرطبی ص۶۵ ج۱

تعداد مقامات حروف ہجائیہ در قرآن کریم

حرف	تعداد مقام	حرف	تعداد مقام	حرف	تعداد مقام
الف	۴۸۸۷۲	ز	۱۵۹۰	ق	۶۸۱۳
ب	۱۱۲۲۸	س	۵۸۹۱	ک	۹۵۲۲
ت	۱۱۹۹	ش	۲۲۵۳	ل	۳۴۳۲
ث	۱۲۷۶	ص	۲۰۱۳	م	۲۶۵۳۵
ج	۳۲۷۳	ض	۱۶۰۷	ن	۲۶۵۶۰
ح	۹۷۳	ط	۱۲۷۴	و	۲۵۵۳۶
خ	۲۴۱۶	ظ	۸۴۲	ہ	۱۹۰۷۰
د	۵۶۴۲	ع	۹۲۲۰۰	لا	۳۷۲۰
ذ	۴۶۹۷	غ	۲۲۰۸	ء	۴۱۱۵
ر	۱۱۷۹۳	ف	۸۴۹۹	ی	۲۵۹۱۹

(بروایۃ عبدالعزیز بن عبداللہ کذانی البستان)

احادیث سے چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

من قرء حرفاً من کتاب اللہ فلہ عشر حسنۃ۔ لا اقول الم حرفٌ بل الف حرفٌ ولامٌ حرفٌ ومیمٌ حرفٌ

جس شخص نے ایک حرف کلام اللہ سے پڑھا اس کو دس نیکیاں حاصل ہوں گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الم (مثلاً) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف اور لام علیحدہ حرف اور میم علیحدہ حرف ہے۔

اس لئے اس فرمان کے پیش نظر قرآن کریم کے تمام حروف کا اجر و ثواب اصل عدد حروف سے دس گونہ زائد حاصل ہوگا۔ کل تعداد حروف قرآن ۳۴۰۷۴۰

تو حق تعالیٰ کے فضل سے ایک مرتبہ ختم پر کل اعداد حروف قرآن کا اجر و ثواب (۳۴۰۷۴۰۰) چونتیس لاکھ سات ہزار چار سو ہوگا۔

(تقسیم حصص قرآن کریم)

ائمہ تفسیر نے قرآن کریم کے مختلف حصوں کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

نصف قرآن سورۂ کہف میں لفظ وَلْیَتَلَطَّفْ (سورۂ کہف)

تین حصوں پر تقسیم

ثلث اول قرآن ________ سورۂ برارۃ کی ۱۰۰ آیتوں پر
ثلث ثانی ،، ________ سورۂ شعرار کی ۱۰۱ آیتوں پر
ثلث آخر ،، ________ ختم قرآن۔

سات حصوں پر تقسیم

سبع اول (پہلا ساتواں حصہ قرآن) آیۃ ومنھم من صدّ عنہ کی دال پر (سورۂ نسار)
سبع ثانی (دوسرا ساتواں حصہ قرآن) ،، اولٰئک حبطت اعمالھم کی ت پر (سورۂ اعراف)
سبع ثالث (تیسرا ،، ،،) ،، اُکُلُھَا دَائِمٌ کے دوسرے الف پر (سورۂ الرعد)
سبع رابع (چوتھا ،، ،،) ،، ولکل امۃ جعلنا مَنْسَکًا کے جعلنا کے الف پر (،، حج)
سبع خامس (پانچواں ،، ،،) ،، وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ کی ۃ پر (،، احزاب)
سبع سادس (چھٹا ،، ،،) ،، الظانین باللہ ظن السوء کے واو پر (،، الفتح)
سبع سابع (ساتواں ،، ،،) حرف آخر قرآن کریم [1]

امام قرطبی بروایت ابو محمد الحمانی بیان کرتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے حفاظ وقرار کو جمع کیا اور کہا کہ مجھے بتاؤ کہ قرآن کے کل کتنے حروف ہیں۔ ابو محمد کہتے ہیں کہ میں بھی اس جماعت میں شامل تھا۔ ہم نے حروف قرآن شمار کئے تو تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس ہوئے۔ اور یہ تفصیل سابق اجزاء کی تقسیم بیان کی۔ اور فرمایا کہ ہم نے چار ماہ کی مدت میں اس کام سے فراغت حاصل کی۔

علمار اور قرأ کے نزدیک قرآن کریم کے اجزاء کی تقسیم اس طرح بھی کی جاتی ہے۔
سبع طوال [1]، مئین [2]، مثانی [3]، مفصل [4]۔

(۱) سبع طوال سے قرآن کی سات بڑی سورتیں۔ بقرہ [1]، آل عمران [2]، نسار [3]، مائدہ [4]، انعام [5]، اعراف [6]، انفال مع برارۃ مراد ہیں۔

(۲) مئین ۔ وہ سورتیں جن میں کم وبیش سو آیات ہیں۔ سورۂ یونس سے سورۂ فاطر تک۔

(۳) مثانی وہ سورتیں جن میں واقعات وقصص اور نصائح مکرر بیان کئے گئے۔ سورۂ یٰس سے سورۂ قاف تک۔

(۴) مفصل (جدا جدا اور علیحدہ مضمون والی سورتیں) سورۂ قٓ سے ختم قرآن تک

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد اول

مفصل کی تین قسمیں ہیں طوال مفصل سورۂ ق سے والبروج تک اور اوساط مفصل سورۂ بروج سے سورۂ لم یکن الذین تک۔ اور قصار مفصل لم یکن الذین کفروا سے ختم قرآن تک۔ محیط میں اسی طرح تصریح ہے۔ اور بالعموم فقہاء بھی اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔ شیخ سیوطیؒ نے ابن معین کا قول نقل کیا ہے۔ طوال مفصل سورۂ عم یتساءلون تک اور اوساط مفصل سورۂ والضحیٰ تک اور قصار مفصل الم نشرح سے ختم قرآن تک۔ (اتقان ص ۶۵ ج ۱ ۱۲)

جمع و تدوین قرآن | قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر متفرق اوقات میں تھوڑا تھوڑا اترتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس قدر اترتا اس کو لکھنے کا حکم کاتبین وحی کو فرمادیتے۔ کاتبین وحی آپ کے حکم سے جو آیت نازل ہوتی اسکو کتابت کرلیتے لیکن یہ کتابت مرتب طریقہ سے کسی ایک صحیفہ یا مجموعہ میں نہیں ہوتی تھی بلکہ متفرق اوراق کھجور کی چھالیں چمڑے کے ٹکڑے اور بکری کے شانوں پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اور حضرات صحابہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دی ہوئی اور یاد کرائی ہوئی ترتیب سے یاد کرلیتے تھے اور اپنے الواح قلوب پر کلام اللہ کو محفوظ و نقش کرتے۔

حافظ ابن حجرؒ شرح بخاری میں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں احکام کا نسخ ہوتا رہتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر قرآن ایک مجموعہ میں مرتب جمع کردیا جاتا جس کے بعد اس مجموعہ کا مختلف بلاد میں پہنچ جانا ضروری تھا۔ پھر اگر کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوتی تو ایسی صورت میں بڑا اختلاف رونما ہوتا۔ اور مصاحف قرآنیہ میں سے اس آیت کو نکالنے میں بڑی دشواری پیش آتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے کلام کو اس سے محفوظ رکھا حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء کے زمانہ میں قرآن کی جمع و ترتیب مقدر فرمائی۔ تاکہ تمام صحابہؓ بالاتفاق کلام اللہ ایک مجموعہ میں مرتب کرلیں۔ اور حضور کی وفات کے بعد کسی آیت کے منسوخ التلاوت ہونے کا بھی امکان نہ تھا۔

حاکم بیان کرتے ہیں کہ قرآن کریم تین مرتبہ جمع ہوا۔ ایک بار تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جیسا کہ زید بن ثابتؓ سے بسند صحیح کے ساتھ مروی ہے۔

قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع | کہ ہم نبی کریمؐ کے سامنے قرآن کریم جمع کرتے تھے جسکو لکھ لیا کرتے تھے ہم کپڑوں کے ٹکڑوں اور کھجور کی چھالوں وغیرہ پر۔

لے بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم عہد رسالت ہی میں قرآن کریم کے حفاظ بکثرت تھے جس کا قرینہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک بستی اور قریہ میں ستر ستر اور چالیس چالیس قراء و حفاظ بھیجا کرتے۔ بیر معونہ کا واقعہ جو سنہ ۴ھ میں پیش آیا اس میں آپ نے ستر قراء روانہ فرمائے تھے جن کو بڑی سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ کفار نے شہید کر ڈالا تھا۔ علامہ ذہبی طبقات القراء میں بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت تھی کہ اس نے پورا قرآن حفظ کیا تھا حضرات صحابہ میں سات قراء و حفاظ وہ ہیں جن کی سند تمام عالم میں مسلم ہے۔

(۱) عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ (۲) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ (۳) ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۴) زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔

(۵) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۶) ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (۷) ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ (طبقات القراء للذہبی)

پھر انہی کے شاگرد مشہور شہروں میں پھیلے اور ہر ایک نے اپنے شیخ کی روش اختیار کرتے ہوئے اشاعت قرآن میں اپنی اپنی زندگیاں صرف کیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں سعید بن المسیب عروۃ بن الزبیر۔ سالم بن عبداللہ بن عمر سلیمان عطاء عمر بن عبدالعزیز۔ اور محمد بن شہاب زہری وغیرہ۔ مکہ مکرمہ میں عطاء بن رباح طاؤس مجاہد اور عکرمہ وغیرہ کوفہ میں علقمہ، اسود، مسروق، عمر بن شرحبیل وغیرہ۔ بصرہ میں ابوالعالیۃ یحییٰ بن یعمر حسن بصری محمد بن سیرین اور قتادہ

لے فتح الباری۔ باب فضائل القرآن ۱۲

دوسری مرتبہ جمع قرآن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔ عمر فاروق کے دل میں ابتداءً اس امر کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور ابوبکر رضؓ سے عرض کیا کہ مصلحت اور ضرورت اس کی متقاضی ہے کہ آپ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کا حکم فرما دیں فاروق اعظم کی اس رائے اور مشورہ پر ابوبکر کو کچھ تردد تو ہوا مگر مراجعت و گفتگو کے بعد قلب اسی پر منشرح ہوگیا اور حضرت زید بن ثابت کو اس کے لئے

(حاشیہ بقیہ ص۲۶) وغیرہ۔ شام میں مغیرۃ بن ابی شہاب المخزومی۔ حضرت عثمان رضؓ کے شاگرد اور ان کے سوا اور بہت سے قراء تھے۔ پھر انہی مقامات میں اس فن کے زائد مشہور یہ امام تھے۔ مدینہ میں ابوجعفر اور نافع۔ مکہ میں عبداللہ بن کثیر۔ کوفہ میں عاصم بن ابی النجود سلیمان اعمش حمزہ کسائی۔ بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحٰق اور عاصم۔ شام میں عبداللہ بن عامر یحییٰ بن الحارث اور شریح بن یزید الحضرمی ہیں۔ انہی حضرات میں وہ سات قراء ہیں جن کی طرف سبع قرأت منسوب ہیں (البیان فی علوم القرآن ص۲۷)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استقرؤا القرآن من اربعة من عبد اللہ بن مسعود وسالم مولی ابی حذیفة۔ وابی بن کعب ومعاذ بن جبل۔ وابی بن کعب اقرأھم لکتاب اللہ۔ سند صحیح سے ثابت ہے کہ ابی بن کعب سید القراء اور اقرء الصحابہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام قرآن کریم من اولہ الی آخرہ سنایا۔ اسی طرح ابوموسیٰ اشعری اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حفظ کرکے قرآن سنایا۔ (صرح ابوالحسن الاشعری رح مفتاح السعادۃ) مجموعی طور پر تتبع اور تلاش سے حفاظ صحابہ کی تعداد دس ہزار معلوم ہوتی ہے جن کے درمیان ۳۷ حضرات کو خصوصی امتیاز ہے۔

طبقۂ صحابہ میں پورا قرآن حفظ کرنے والی عورتیں

(۱) ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۲) ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا
(۳) " " ام سلمہ " (۴) ام ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہا (ابوداؤد)

کاتبان وحی

روضۃ الاحباب میں ہے کہ چالیس صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے کتابت وحی پر مامور و مقرر تھے۔ ان میں مشہور حضرات یہ ہیں۔

ابوبکر صدیق رضؓ، عمر فاروق رضؓ، عثمان بن عفان رضؓ علی بن ابی طالب رضؓ، زید بن ثابت رضؓ عبداللہ بن مسعود رضؓ، زبیر بن العوام، خالد بن سعید رضؓ، حنظلۃ بن ربیع رضؓ، علاء رضؓ، خالد بن الولید عبداللہ بن رواحہ، محمد بن مسلم۔ عبداللہ بن عبداللہ بن سلول، مغیرۃ بن شعبۃ۔ عمرو بن العاص، معاویۃ بن ابی سفیان۔ جہم بن الصلت۔ معیقیب بن فاطمہ۔ عبداللہ بن ارقم الزہری۔ ثابت بن قیس بن شماس۔ حذیفۃ بن الیمان۔ عامر بن فہیرۃ۔ عبداللہ بن ابی سرح۔ سعید بن جبیر۔ ابان بن سعید رضی اللہ عنہم اجمعین۔
(تاریخ طبری۔ طبقات ابن سعد)

مامور فرمایا۔ صحیح بخاری میں زید بن ثابت کی حدیث سے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ اَرْسَلَ اِلَیَّ اَبُوْ بَکْرٍ مَقْتَلَ اَھْلِ الْیَمَامَۃِ فَاِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَہٗ قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِیْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَۃِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَ اِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ فِی الْمَوَاطِنِ فَیَذْھَبُ کَثِیْرٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَ اِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ قُلْتُ لِعُمَرَ کَیْفَ نَفْعَلُ شَیْئًا لَمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمَرُ ھٰذَا وَاللہِ خَیْرٌ فَلَمْ یَزَلْ عُمَرُ یُرَاجِعُنِیْ حَتّٰی شَرَحَ اللہُ صَدْرِیْ لِذٰلِكَ وَرَأَیْتُ فِیْ ذٰلِكَ الَّذِیْ رَاٰی عُمَرُ قَالَ زَیْدٌ قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ اِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَا نَتَّھِمُكَ فِیْ دِیْنِكَ وَقَدْ کُنْتَ تَکْتُبُ الْوَحْیَ لِرَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَتَبَّعِ الْقُرْاٰنَ فَاجْمَعْہُ ....
قَالَ فَوَاللہِ لَوْ کَلَّفُوْنِیْ نَقْلَ جَبَلٍ مِّنَ الْجِبَالِ مَا کَانَ اَثْقَلَ عَلَیَّ مِمَّا اَمَرَنِیْ بِہٖ مِنْ جَمْعِ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْتُ کَیْفَ تَفْعَلُوْنَ شَیْئًا لَمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھُوَ خَیْرٌ فَلَمْ یَزَلْ اَبُوْ بَکْرٍ یُرَاجِعُنِیْ حَتّٰی شَرَحَ اللہُ صَدْرِیْ لِلَّذِیْ شَرَحَ صَدْرَ اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ رضی اللہ عنہما فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْاٰنَ اَجْمَعُہٗ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰی وَجَدْتُّ اٰخِرَ سُوْرَۃِ

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ پیغام بھیجا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری طرف (حاضری کے لئے) اہل یمامہ کے ساتھ قتال کے زمانہ میں (جبکہ مسیلمہ کذاب مدعی نبوت کی ساتھ قبیلہ بنو حنیفہ ہو گیا تھا اور بھی کچھ لوگ اس کی پیروی کرنے لگے تھے تو ابوبکر رضہ نے ان لوگوں سے جہاد کے لئے لشکر روانہ فرمایا دوران مقابلہ سات سو قرأ و حفاظ قرآن شہید ہوئے) ناگہاں دیکھا کہ عمر بن الخطاب ابوبکر رضہ کے پاس موجود ہیں ابوبکر رضہ نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور انھوں نے کہا کہ بے شک قتل و خونریزی بہت ہی شدید ہو چکی ہے۔ معرکہ یمامہ میں قرأ قرآن کے لئے اور میں خوف کرتا ہوں اس بات کا کہ قتل و خونریزی مختلف جگہوں میں اگر (اسی طرح) شدید رہی قرآن کے قاریوں (اور حافظوں) کے لئے تو ضائع ہو جائے گا بہت سا حصہ قرآن کا۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ حکم فرمائیں قرآن کے جمع کرنے کا (اس پر) میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کیسے کریں ہم وہ چیز جو نہیں کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ عمر رضہ نے کہا یہ چیز خدا کی قسم بہتر رہی ہے تو عمر بار بار مجھ سے (یہی) گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس کے لئے کھول دیا اور میں نے (بھی) اس بارہ میں وہی چیز بہتر سمجھی جس کو عمر نے سمجھا تھا۔ زید بیان کرتے ہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا یقیناً تم نوجوان سمجھدار شخص ہو ایسے کہ ہم کسی تہمت سے تمہارے دین (و تقویٰ) میں تم کو متہم نہیں کر سکتے اور بے شک تم کتابت کرتے تھے وحی (قرآن) کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس لئے تم تلاش کرو قرآن کو (جہاں جہاں

التَّوْبَةِ مَعَ اَبِیْ خُزَیْمَةَ الْاَنْصَارِیْ لَمْ اَجِدْهَا مَعَ اَحَدٍ غَیْرِهٖ لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ حَتّٰی خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ فَکَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ اَبِیْ بَکْرٍ رض حَتّٰی تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ رض حَیَاتَهٗ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ رضی اللہ عنہا

اس کی آیات لکھی ہوئی ملیں) اور اس کو جمع و مرتب کرو۔ زید بن ثابت بیان کرتے ہیں خدا کی قسم اگر یہ حضرات مجھ کو مامور کرتے پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کے منتقل کرنے کا (ایک جگہ سے دوسری جگہ) تو وہ مجھ پر زیادہ گراں نہ ہوتا بہ نسبت اس امر کے کہ جس کا مجھے حکم کیا۔ میں نے عرض کیا کیونکر کریں گے آپ اس چیز کو کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔ ابو بکر نے کہا (نہیں) وہ خیر (ہی) ہے۔ تو ابو بکر رض مجھ سے اس بارہ میں بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا قلب بھی اسی امر کے لئے منشرح کر دیا جس کے لئے ابو بکر اور عمر کا قلب منشرح کیا تھا۔ پس تلاش کرنا شروع کیا میں نے قرآن کو در آنحالیکہ میں جمع کرتا تھا (آیات قرآن) کھجور کی چھالوں اور سفید پتھر کے ٹکڑوں (جن پر وہ آیات زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھ لی جاتی تھیں) اور لوگوں (حفاظ صحابہ) کے سینوں سے یہاں تک کہ پایا میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیت کو ابو خزیمہ انصاری کے پاس سے کہ بجز ان کے وہ آیت مجھ کو کسی اور کے پاس نہیں ملی۔ آیت لَقَدْ جَاءَکُمْ رسول مِنْ اَنْفُسِکُمْ ختم سورۂ تک۔

تو یہ صحیفے لکھے ہوئے ابو بکر کے پاس رہے ان کے زمانہ حیات میں یہاں تک اللہ نے ان کو اس عالم سے اٹھا لیا۔ پھر عمر فاروق رض کے پاس ان کی زندگی میں رہے۔ پھر اس کے بعد حضرت حفصہ (عمر فاروق کی صاحبزادی) کے پاس رہے۔

ابن ابی داؤد نے ہشام بن عروہ کی سند سے ایک روایت تخریج کی ہے کہ عروۃ بن الزبیر رض نے اپنے والد سے یہ نقل کیا کہ ابو بکر رض نے عمر رض اور زید بن ثابت رض کو فرمایا کہ تم دونوں مسجد (نبوی) کے دروازے پر بیٹھ جاؤ جو شخص قرآن کی کسی آیت پر دو شاہد (گواہ) پیش کرے اس کی کتابت کرو یعنی اگر دو شاہد نہ پیش کر سکے تو پھر اس کو مصحف کلام اللہ میں نہ لکھنا۔

سخاوی جمال القراء میں دو شاہدوں کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ جو دو گواہ اس بات پر گواہی دینے والے ہوں کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی جس سے مقصد یہ تھا کہ اس مصحف میں بعینہ وہی لکھا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رو برو کاتبین وحی نے لکھ لیا تھا۔ محض زبانی حفظ اور تلفظ پر قرآن جمع نہ کیا جائے۔ اسی وجہ سے زید بن ثابت یہ کہتے ہیں کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیت صرف ابو خزیمہ کے پاس لکھی ہوئی پائی جو کسی دوسرے کے پاس نہ تھی (لکھی ہوئی) یعنی یہ آیت تلاوت تو تمام حفاظ اور قراء صحابہ کرتے

لہ الاتقان ج ۱ ص ۶۰ -

تھے۔ اور جانتے تھے کہ سورۂ توبہ لقد جاء کم رسول آیۃ پر ختم ہوئی ہے لیکن تلاش یہ تھی کہ لکھی ہوئی مل جائے تو پھر صحیفۂ کلام اللہ میں درج کی جائے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں حافظ ابن حجر نے دو شاہدوں کی مراد یہ بیان کی ہے کہ ایک حافظ اور دوسرا شاہد کتابت۔

معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی جمع و تدوین جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی اس کی حقیقت یہ تھی کہ آیات قرآن جو متفرق اور منتشر طور پر کھجور کی چھالوں پتھروں اور شانے کی ہڈیوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے حکم سے آپ کے رو برو کتابت کرلی گئی ہیں ان کو ایک مجموعی صحیفہ میں جمع کر دیا جائے۔ اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرماتے تھے، صحابہ کو پڑھاتے اور پھر اس کے مطابق قراء و حفاظ صحابہ پڑھتے تھے۔

قرآن کریم کا یہ صحیفہ (نسخہ) ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانۂ حیات میں رہا۔ اس کے بعد یہی نسخہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ عمر فاروق کی شہادت کے بعد ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔ عہد صدیقی میں جمع قرآن سے غرض یہ تھی کہ قرآن محفوظ ہو جائے اور اس طرح سے ضیاع کا اندیشہ نہ رہے۔

عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں کثرت فتوحات سے اسلام دور دراز ملکوں میں جا پہنچا۔ عراق، مصر، شام اور ایران فتح ہو چکا تھا۔ ان بلاد میں لوگ بکثرت مسلمان ہوئے۔ اور حفاظ و قراء کی آمد و رفت سے قرآن کی تعلیم اور حفظ و قرأت کا سلسلہ پھیلتا گیا لیکن چونکہ ابتداء اسلام میں ایک ہی لغت قریش (جس پر اصل کلام اللہ کا نزول ہوا) پر تمام قبائل و اقوام کو کلام اللہ پڑھانا موجب صعوبت تھا۔ اس لئے حق تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت و اجازت دی تھی کہ ایسے لوگوں کو جو لغت قریش پر بعض آیات کو تلاوت کرنے سے معذور ہوں آپ دوسرے لغات پر انھیں وہ آیات پڑھا دیں۔ اسی بناء پر خود زمانۂ نبوت میں بعض صحابہ دوسرے بعض صحابہ کو کچھ مختلف طور پر پڑھتے ہوئے دیکھ کر تعجب کیا کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معاملہ پیش کیا جاتا تو آپ ہر دو صورتوں کی تصدیق فرما دیتے کہ ھکذا اُنْزِلَتْ ھکذا اُنْزِلَتْ۔ (اس طرح بھی نازل ہوا اُس طرح بھی نازل ہوا) اور ارشاد فرما دیتے کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اے پروردگار میری امت پر آسانی فرمایئے تو مجھ کو اجازت دی گئی کہ میں قرآن سات حرفوں پر پڑھا کروں[۵] صحیح مسلم میں عمر بن الخطاب سے روایت ہے۔

---

[۵] حدیث ابی بن کعب رضی صحیح مسلم ابواب فضائل القرآن ملاحظہ فرمائیں۔

عَنْ عُمَرَ بنِ الخطابؓ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بنَ حَکِیْمِ
بنِ حِزَامٍ یَقْرَءُ سُوْرَةَ الفُرْقَانِ عَلٰی غَیْرِ مَا
اَقْرَأُهَا وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ
سَلَّمَ اَقْرَأَنِیْہَا فَکِدْتُ اَنْ اَعْجَلَ عَلَیْہِ
ثُمَّ اَمْهَلْتُہٗ حَتّٰی اَنْصَرَفَ ثُمَّ لَبَّبْتُہٗ بِرِدَائِہٖ
فَجِئْتُ بِہٖ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ سَمِعْتُ ھٰذَا یَقْرَءُ
سُوْرَةَ الفُرْقَانِ عَلٰی غَیْرِ مَا اَقْرَأْتَنِیْهَا۔ فَقَالَ
رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرْسِلْہُ
اِقْرَءْ فَقَرَءَ القِرَاءَةَ الَّتِیْ سَمِعْتُہٗ یَقْرَءُ
فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰکَذَا
اُنْزِلَتْ۔ ثُمَّ قَالَ لِیْ اِقْرَءْ فَقَرَأْتُ فَقَالَ
ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ اِنَّ ھٰذَا القُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی
سَبْعَةِ اَحْرُفٍؔ فَاقْرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ

بیان کرتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سُنا کہ وہ سورۂ فرقان پڑھ رہے ہیں اس طریقہ کے خلاف کہ جس پر میں اسکو پڑھتا تھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۂ فرقان پڑھائی تھی۔ تو قریب تھا کہ میں انپر لپک پڑوں مگر پھر میں نے ان کو مہلت دی حتیٰ کہ وہ نماز (یا تلاوت) سے فارغ ہوگئے تو میں نے ان کی گردن میں ان کی چادر کا بل دے کر ان کو گھسیٹے ہوئے چلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور (حاضر خدمت ہو کر) عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اس کو سُنا ہے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس کے برخلاف جو آپ نے مجھ کو پڑھایا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور آپ نے ان کو فرمایا۔ پڑھو۔ ہشام نے پڑھا اسی طرح جس طرح کہ میں نے ان کو پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح (بھی) قرآن نازل کیا گیا ہے۔ پھر مجھ سے فرمایا پڑھو میں نے پڑھا تو فرمایا اس طرح بھی نازل کیا گیا (اور فرمایا) بے شک یہ قرآن نازل کیا گیا ہے سات حرفوں پر تو پڑھ لیا کرو جو آسان ہو قرآن میں سے

لہ قرآن کریم کے سات حرفوں پر نازل ہونے کے معنی کیا ہیں۔ یہ ایک تفصیلی بحث ہے۔ مقالہ پیش نظر میں مسئلہ کے تفصیلی پہلوؤں پر کلام مشکل ہے تفصیل کے لئے شروح حدیث کی مراجعت فرمائی جائے۔ خلاصہ یہ کہ جمہور کے نزدیک سبع لغات سے قبائل مختلفہ کے وہ سات لغات مراد ہیں جو متقارب المعنی ہوں جیسے اَقْبِلْ تَعَالَ اور ھَلُمَّ وغیرہ کہ الفاظ مترادف ایک ہی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن وہب، طبری اور امام طحاوی سے یہی منقول ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں سب سے زائد صریح اور واضح چیز اس باب میں حدیث ابوبکرہ سے ثابت ہے

قال جاء جبریل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال اقرء علی حرف فقال میکائیل استزدہ فقال اقرء علی حرفین فقال میکائیل استزدہ حتی بلغ الی سبعة احرف فقال اقرء فکل شاف وکان

کہ جبریل نبی کریم کی خدمت میں آئے اور کہا پڑھئے ایک حرف پر میکائیل نے کہا ان کے لئے اضافہ کرو۔ تو کہا پڑھئے دو حرفوں پر یہاں تک کہ سات حرفوں تک پہنچ گئے اور کہا کہ ان پر پڑھئے۔ (یعنی امت کے ان افراد کو پڑھا دیجئے

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ)

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اجازت کے بعد بہت سی آیات متعدد لغات اور مختلف قرأت کے ساتھ پڑھی جانے لگیں۔ فتح الباری میں حافظ بروایت ابوشامہ بعض مشائخ سے نقل کرتے ہیں۔

قال انزل القرآن اوّلاً بلسان قریش ومَنْ جاورھم من العرب الفصحاء ثم ابیح للعرب ان یقرؤہ بلغاتھم التی جرت عادتھم

کہ قرآن تو پہلے قریش اور ان کے پڑوس جو فصحاء عرب تھے انہی کی زبان اور لغت پر نازل ہوا تھا مگر بعد میں اہل عرب کو اجازت دیدی گئی وہ اپنے مروج لغات میں تلاوت کریں

(بقیہ حاشیہ صفحہ) الا ان تخلط آیة رحمة بآیة عذاب او آیة عذاب بآیة رحمة علی نحو ھلم وتعال واقبل واذھب واسرع وعجّل وروی ورقاء عن ابن ابی نجیح عن مجاھد عن ابن عباس عن ابی بن کعب انہ کان یَقرءُ للذین اٰمنوا انظرونا للذین اٰمنوا امھلونا للذین اٰمنوا اخرونا للذین اٰمنوا ارقبونا۔

جو ایک لغت سے عاجز ہوں) ہر ایک شافی وکافی ہے بجز اس کے کہ مخلوط ہو جائے کوئی آیۃ رحمت آیت عذاب سے یا آیت عذاب آیت رحمت سے مثل ھلم تعال اور اقبل کے (جنکے معنی ایک ہی ہیں یعنی آجاؤ) اور مثل اَذْھب اَسْرِع وعجّل کے (جن کے معنی عجلت کرو کے ہیں) ورقاء ابن ابی نجیح سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس ابی بن کعبؓ سے نقل کرتے تھے کہ وہ للذین اٰمنوا انظرونا کو اَمْھِلونا اور اَخِّرُونَا جیسے لفظوں سے پڑھنے کی اجازت دیدیتے تھے (اس بنا پر کہ یہ اجازت انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کی ہوگی۔ کیونکہ کسی قبیلہ والے کو از خود اس کی اجازت نہ تھی بلکہ یہ اجازت آنحضرت کی تعیین پر موقوف تھی)

امام طحاوی رح فرماتے ہیں کہ ان مختلف لغات میں پڑھنے کی وسعت ابتداءً ہیں اس لئے دی گئی تھی کہ لوگ اپنے لغت کے سوا دوسرے لغت پر قرآن پڑھنے سے عاجز تھے (مثلاً ہذیل کو لغت یمن دشوار تھا اور اہل یمن کو ہذیل کا لغت) تو اس مشقت کے پیش نظر ان کو اختلاف الفاظ کی وسعت دی گئی جبکہ معنی متحد اور متفق رہیں۔ یہ رخصت واجازت کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ لوگ باہمی میل و جول کی وجہ سے دوسرے لغات کی تلاوت پر قادر ہو گئے۔ اور تمام قبائل کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لغت یعنی لغت قریش بن گیا (جس پر قرآن کا اصل نزول تھا) تو سب کو لغت قریش کا پابند کر دیا گیا۔ اور سابق رخصت و اجازت کو ختم کر دیا گیا۔ جو آنحضرت نے اپنی جانب سے ان لوگوں کو دے رکھی تھی جو دوسرے لغت سے عاجز تھے۔ اور اس کی گنجائش نہ رہی کہ کوئی شخص لغت قریش کے خلاف پڑھ سکے۔ ابن عبدالبر بیان کرتے ہیں کہ بہرحال یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ سات حرفوں کی اجازت ایک مخصوص وقت اور خاص ضرورت ومجبوری کے باعث تھی۔ ظاہر ہے کہ جب وہ ضرورت ختم ہو گئی تو اس وسعت وگنجائش کا حکم بھی اٹھ جانا چاہیے تھا۔ (کذا فی التفسیر القرطبی صفحہ ۴۳ ج ۱)

تو جمع عثمانی یہی ہے کہ سابق وسعت وگنجائش کی بنا پر جن لغات مختلفہ کی قرآن میں اجازت تھی اس کو ختم کرکے صرف لغت قریش پر قرآن کو جمع کر دیا جس پر کہ نازل ہوا اور جس پر بالعموم قرآن کی تلاوت ہوتی تھی

بِاِسْتِعْمَالِهَا عَلٰى اِخْتِلَافِهِمْ فِي الْاَلْفَاظِ وَالْاِعْرَابِ وَلَمْ یکلف احد منھم الانتقال من لغتہ الی لغۃ اخریٰ للمشقۃ۔

اور مجبور نہیں کیا گیا کسی ایک قبیلہ کو اپنے لغت سے دوسرے قبیلہ کے لغت کی طرف منتقل ہونے کے لئے مشقت و دشواری کے خیال سے

توجب اسی کیفیت کے ساتھ مختلف بلاد اور علاقوں میں قرآن پہنچا اور مسلمانوں کے درمیان قرآن کی بعض آیات اس اختلاف و فرق کے ساتھ حضرت حذیفہ نے تلاوت ہوتی ہوئی سنیں اور دیکھا کہ یہ چیز باہمی اختلاف کا موجب ہورہی ہے تو حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا ایسا نہ ہو کہ یہ اختلاف شدشدہ توراۃ وانجیل میں یہود ونصاریٰ جیسا اختلاف ہو جائے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اس اختلاف سے امت کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی تردید وتضلیل پر آمادہ ہو جائے جو یقیناً ایک عظیم فتنہ ہوگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے صورت حال بیان کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کے زیر اہتمام ایک جماعت کو مامور فرمایا کہ قرآن کریم لغت قریش پر جمع کیا جاوے۔ کیونکہ قرآن دراصل لغت قریش ہی پر نازل ہوا ہے۔

صحیح بخاری میں انس بن مالک رضہ سے روایت ہے۔

اَنَّ حُذَیْفَۃَ بْنَ الْیَمَانِ رضہ قَدِمَ عَلٰی عُثْمَانَ وَکَانَ یُغَازِیْ اَھْلَ الشَّامِ فِیْ فَتْحِ اِرْمِیْنِیَّۃَ وَاٰذَرْبِیْجَانَ مَعَ اَھْلِ الْعِرَاقِ۔ فَاَفْزَعَ حُذَیْفَۃَ اِخْتِلَافُھُمْ فِی الْقِرَاءَۃِ۔ فَقَالَ حُذَیْفَۃُ رضہ لِعُثْمَانَ رضہ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَدْرِکْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَبْلَ اَنْ یَّخْتَلِفُوْا فِی الْکِتَابِ اخْتِلَافَ الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی۔ فَاَرْسَلَ عُثْمَانُ رضہ اِلٰی حَفْصَۃَ اَنْ اَرْسِلِیْ اِلَیْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُھَا فِی الْمَصَاحِفِ

کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور وہ غزوہ کر رہے تھے اہل شام اور عراق کے ساتھ فتح آرمینیہ کے اور آذربیجان کے زمانہ میں[1] تو حذیفہ رضہ کو بیچین کیا ان کے باہمی اختلاف نے قرأت (قرآن) میں حذیفہ رضہ نے حضرت عثمان رضہ سے عرض کیا اے امیر المؤمنین خبر لیجئے اس امت کی اس سے قبل کہ یہ اختلاف کرنے لگیں (اپنی) کتاب میں یہود ونصاریٰ جیسا اختلاف تو عثمان رضی اللہ عنہ نے حفصہ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ بھیجدیں ہمارے پاس صحیفے (قرآن کریم کے نوشتہ اوراق) ہم ان کو

---

[1] علامہ کرمانی شارح صحیح بخاری یغازی کا فاعل عثمان کو قرار دیتے ہیں۔ تو اس صورت میں لفظ یغازی یغزی کے معنی میں ہوگا۔ مراد یہ کہ جہاد کی تیاری کر رہے تھے۔

دوسرے بعض شارحین حدیث اور ملا علی قاری "کان یغازی" کا فاعل حذیفہ کو بیان کرتے ہیں تو اس تقدیر پر مراد یہ ہوگی کہ اس غزوہ کی شرکت کے بعد جب حذیفہ رضہ حضرت عثمان کے پاس واپس پہنچے تو یہ صورت حال جو انھوں نے اختلاف قرأۃ کی مختلف علاقوں میں دیکھی تھی بیان کی اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین اس امت کی خبر گیری فرمایئے ایسا نہ ہو کہ الخ ۱۲

ثُمَّ نَرُدُّهَا إِلَيْكِ فَأَرْسَلَتْ بِهَا حَفْصَةُ
إِلَى عُثْمَانَ رض فَأَمَرَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ وَعَبْدَ اللهِ
ابْنَ الزُّبَيْرِ وَسَعِيدَ بْنَ الْعَاصِ وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ
ابْنَ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ فَنَسَخُوهَا فِي الْمَصَاحِفِ
وَقَالَ عُثْمَانُ رض لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّينَ الثَّلٰثَةِ إِذَا
اخْتَلَفْتُمْ أَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِي شَيْءٍ
مِنَ الْقُرْآنِ فَاكْتُبُوهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَإِنَّمَا
أُنْزِلَ بِلِسَانِهِمْ. فَفَعَلُوا حَتَّى إِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ
فِي الْمَصَاحِفِ رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ إِلَى حَفْصَةَ
وَأَرْسَلَ إِلَى كُلِّ أُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوا
وَأَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ صَحِيفَةٍ
أَوْ مُصْحَفٍ أَنْ يُحْرَقَ. قَالَ ابْنُ شِهَابٍ
فَأَخْبَرَنِي خَارِجَةُ بْنُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّهُ سَمِعَ
زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْتُ آيَةً مِنَ الْأَحْزَابِ
حِينَ نَسَخْنَا الْمُصْحَفَ وَقَدْ كُنْتُ أَسْمَعُ
رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهَا
فَالْتَمَسْنَاهَا فَوَجَدْنَاهَا مَعَ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ
الْأَنْصَارِي - مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا
مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ فَأَلْحَقْنَاهَا فِي سُورَتِهَا
فِي الْمُصْحَفِ ؏ (حاشیہ صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجئے)

نقل کرلیں گے (دوسرے) صحیفوں میں پھر ان کو لوٹا دیں گے آپ کی جانب۔ حضرت حفصہ نے وہ صحیفے عثمان غنی رض کے پاس بھیج دیئے۔ تو انھوں نے مأمور فرمایا زید بن ثابت عبداللہ بن الزبیر سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث ابن ہشام کو کہ نقل کریں ان صحیفوں کو (جو ابوبکر رض کے زمانہ میں کتابت کئے گئے تھے) دوسرے صحیفوں میں۔ اور عثمان رض نے جماعت قریش کے تینوں افراد (یعنی عبداللہ بن الزبیر سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث) کو فرمایا کہ جب تم اور زید بن ثابت انصاری اختلاف کرو کسی جگہ قرآن میں سے (یعنی لغات میں) تو پھر اس کو لکھنا لغت قریش پر کیونکہ قرآن تو انہی کی زبان پر نازل ہوا ہے چنانچہ ان چاروں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ جب نقل کر چکے (ابوبکر رض کے زمانہ میں لکھے ہوئے) صحیفے دوسرے مصاحف میں تو حضرت عثمان رض نے صحیفے واپس کردئے حفصہ کی جانب (یعنی جو ان سے منگائے تھے اور ابوبکر رض نے ان کو کتابت کرایا تھا) اور بھیجا ہر علاقہ میں ایک مصحف (نسخۂ قرآن کریم) ان مصاحف میں سے جو نقل کئے ان لوگوں نے (اصل مصحف سے) اور حکم کیا اس کے علاوہ قرآن کے ہر صحیفہ یا مجموعہ اوراق کے جلا دئے جانے کا (تاکہ اختلاف نہ پیدا ہو سکے)

؏ ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے یہ بتایا کہ انھوں نے (اپنے والد) زید بن ثابت سے یہ سنا کہتے تھے کہ (جمع قرآن کے وقت) میں نے ایک آیت سورۂ احزاب کی نہ پائی جس وقت کہ ہم نقل کر رہے تھے مصحف (قرآن) اور حال یہ کہ میں سنا کرتا تھا وہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ اسے تلاوت فرماتے تھے۔ تو ہم نے اس کو تلاش کیا (کہ اصل وہ آیت کس کے پاس لکھی ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں) تو وہ آیت ہم نے پائی (لکھی ہوئی) خزیمہ بن ثابت (باقی ترجمہ صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ ہو)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قرآن کریم کا یہ جمع ۲۴ھ ہجری کے اواخر اور ۲۵ھ کے اوائل میں تھا اور یہی وہ وقت تھا کہ آرمینیہ فتح ہوا۔ حضرت عثمان کے قرآن کریم کے یہ مصاحف بلادِ مفتوحہ کے مختلف اور اہم علاقوں میں روانہ فرما دیے۔ مشہور یہ ہے کہ پانچ نسخے نقل کرا کر بھیجے۔ ابن ابی داؤد بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو حاتم السجستانی سے سنا سات نسخے لکھوا کر ان بلاد میں روانہ فرمائے۔ مکہ مکرمہ۔ شام۔ یمن۔ بحرین۔ بصرہ۔ کوفہ اور ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا۔ [1]

ابو بکر صدیق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جمع قرآن کی نوعیت اور فرق تو ظاہر ہے کہ متفرق اور منتشر آیات کو مختلف مواقع سے ابو بکر صدیق نے بالترتیب مصاحف قرآن میں جمع کیا۔ اب اس کے بعد ابو بکر اور عثمان غنی کے جمع میں کیا فرق ہے؟ علامہ ابن التین اور اکثر ائمہ تفسیر بیان کرتے ہیں کہ ابو بکرؓ نے تو قرآن کریم جمع فرمایا تھا اس اندیشہ سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کا کچھ حصہ قرّاء و حفاظ کے اس عالم سے گذر جانے کی وجہ سے ضائع ہو جائے لیکن عثمان غنیؓ نے جب دیکھا کہ بعض آیات کی تلاوت میں اختلاف زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور ابتداء اسلام میں مجبوری کے باعث جو لغات کا توسع کیا گیا تھا اب اس کی ضرورت

(ترجمہ بقیہ صفحہ ۵۵) انصاری کے پاس آیۃ من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ الخ تو اس آیت کو لاحق کر دیا ہم نے اس کی ہی سورت کے ساتھ مصحف قرآن میں۔

(حاشیہ متعلق صفحہ ۵۵) مصحف اور صحیفہ یہ الفاظ مفسرین کے درمیان جب استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کا ایک مفہوم اصطلاحی معتبر ہوتا ہے انہی کی جمع مصاحف اور صحائف ہے۔ مصحف وہ کتاب یا مجموعہ ہے جس میں متعدد رسائل اور اوراق (صحیفے) جمع ہوں جس کی جمع مصاحف آتی ہے صحیفہ بمعنی ورق اور رسالہ اس کی جمع صُحُف ہے۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ہے۔ فِی صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ مَّرْفُوْعَۃٍ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ۔ مفسرین کی اصطلاح میں لفظ مصحف کا اطلاق قرآن کریم کے لئے مخصوص ہے۔ شیخ سیوطیؒ بحوالہ "کتاب المصاحف" فرماتے ہیں کہ ابو بکر صدیق کے زمانہ میں جب قرآن کریم جمع کیا گیا تو اس کے نام کی تجویز و تعیین میں اختلاف ہوا کسی نے کہا سِفر (کتاب) نام مناسب ہے لیکن یہ نام اور عنوان چونکہ یہودیوں کی کتاب توراۃ کے حصوں کے لئے مستعمل تھا اس لئے پسند نہ کیا گیا۔ پھر عبداللہ بن مسعود یا سالم مولیٰ ابی حذیفہ نے فرمایا کہ میں نے حبشہ میں اہل حبشہ کو اسی کے مانند کتاب کو مصحف کہتے ہوئے سنا ہے اس کو سب حضرات نے پسند کیا اور مجموعہ قرآن کا نام مصحف قرار پایا لیکن بہتر اور مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو توجیہ کیلئے اصل لغت عربی ہی سے اس کا اشتقاق قرار دیتے ہوئے کہا جائے کہ یہ لفظ اِصحاف کا اسم مفعول۔ اور صحیفہ اصحاف کا ماخذ ہے۔ صحیفہ کے معنی چونکہ ورق کے ہیں تو اصحاف کے معنی اوراق منتشرہ کو یکجا جمع کرنے کے ہوں گے۔ اور قرآن کو مصحف اس اعتبار سے کہا جائیگا کہ وہ تمام سورتوں اور منتشر اوراق قرآنیہ کو جامع ہے۔ چنانچہ لغویین کا مقولہ ہے اور صاحب لسان العرب کہتے ہیں المصحف الجامع

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۱۶ الاتقان ج ۱

نہیں رہی اور یہ اختلاف کتاب اللہ میں یقیناً امت کے حق میں ایک فتنہ ہے اس لئے تمام لغات کو منسوخ کر کے صرف لغت قریش پر جمع فرمایا۔ کیونکہ اصل قرآن اسی لغت پر نازل ہوا تھا[1]۔

ابن ابی داؤد نے سوید بن غفلہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ (اے لوگو) تم عثمان رضی اللہ عنہ کے بارہ میں خیر کے سوا کچھ مت کہو (جمع قرآن کے مسئلہ میں) خدا کی قسم جو بھی کچھ انہوں نے کیا یعنی قرآن کو مصاحف میں جمع کر دینا وہ ہم سب کے مشورہ اور رائے ہی سے کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کیا کہتے ہو اس (اختلاف) قرأۃ کے بارہ میں کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ میری قرأۃ تیری قرأۃ سے بہتر ہے اور اس طرح ایک دوسرے کی تردید پر آمادہ ہے یہ فتنہ تو قریب ہے کہ کہیں کفر تک نہ پہنچا دے۔ ہم نے عرض کیا تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا اگر لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے تو کوئی اختلاف و تفریق نہ رہے گی۔ ہم نے کہا بہت ہی بہتر ہے یہ خیال جو آپ نے قائم کیا[2]۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عثمان نے لغت قریش کے سوا تمام لغات کو منسوخ کر کے نہایت اہتمام و انتظام سے ایک جماعت کی نگرانی میں اصل لغت قریش پر قرآن جمع کرایا اور متعدد صحیفے نقل کرانے کے بعد تمام بلاد میں بھیجے گئے[3]۔ اس اہتمام و اشاعت کی بنا پر حضرت عثمان امت کے درمیان جامع القرآن کے لقب سے مشہور

---

[1] الاتقان ج۱ ص۶۱ [2] الاتقان ج۱ ص۶۱۔ [3] حافظ بدر الدین عینی نے شرح بخاری باب جمع القرآن میں ج ۹ ص۳۰۱ عمارہ بن غزیہ کی روایت بیان کی ہے۔

ان حذیفۃ قدم من غزوۃ فلم یدخل بیتہ حتی اتی عثمان فقال یا امیر المؤمنین ادرک الناس قال وما ذاک۔ قال غزوت فرج ارمینیۃ فاذا اھل الشام یقرؤن بقرأۃ ابی بن کعبؓ فیاتون بما لم یسمع اھل العراق واذا اھل العراق یقرؤن بقرأۃ عبد اللہ بن مسعود فیأتون بما لم یسمع اھل الشام فیکفر بعضھم بعضاً (انتھی)

کہ حذیفہ ایک غزوہ سے واپس آئے تو اپنے گھر میں (بھی) داخل نہ ہوئے تا آنکہ حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے امیر المؤمنین لوگوں کی خبر لیجیے۔ عثمانؓ نے فرمایا اور کیا بات ہے یہ؟ تو کہا کہ میں نے غزوہ کیا فتح ارمینیہ کے لئے تو دیکھتا ہوں اہل شام ابی بن کعب کی قرأت پڑھتے ہیں اور ایسی تلاوت کرتے ہیں کہ جس کو اہل عراق نے نہیں سنا ہوتا اور اہل عراق عبد اللہ بن مسعود کی قرأت کو اختیار کر کے ایسی تلاوت کرتے ہیں جس کو اہل شام نے ہوئے نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں ایک دوسرے کی تردید اور تکفیر کرتا ہے (الخ)

حافظ عینی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں کہ یہی سبب تھا جمع عثمانی کا۔ اور فرق حضرت عثمان غنی کے جمع میں اور ان صحیفوں کے درمیان جو ابو بکر صدیق کے عہد میں جمع کئے گئے تھے کہ وہ صحیفے اوراق منتشرہ تھے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا عثمان غنیؓ نے ترتیب وار تمام قرآن ایک مصحف (مجلد مجموعہ) میں جمع کیا اور لغت قریش کے علاوہ دوسرے لغات کو منسوخ کر دیا (بقیہ صفحہ ۵

(معروف ہوئے ورنہ نفس جمع تو صدیق اکبر کے زمانہ میں ہو چکا تھا (واللہ اعلم)

(بقیہ حاشیہ ص۵۵) عمارۃ بن غزیہ کی روایت میں حضرت حذیفہ بن الیمان کی ..... اس تصریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم جو جمع فرمایا تھا وہ جمع ان تمام حروف اور وجوہ کے ساتھ تھا جن پر قرآن کا نزول ہوا اور ان وجوہ پر اس کی تلاوت کی اجازت دی گئی تھی) اب عثمان غنی رض نے ارادہ کیا کہ ان وجوہ اور لغات سے علیحدہ کر کے قرآن صرف لغت قریش پر جمع کر لیا جائے باقی تمام لغات منسوخ کر دیئے جائیں جو مصحف صدیقی میں مکتوب ہیں۔ چنانچہ حافظ عینی عمدۃ القاری جلد ۸ صفحہ ۶۵۵ میں فرماتے ہیں۔

وانما فعل عثمان هذا ولم يفعله الصديق رضی اللہ عنہ لان غرض ابی بکر کان جمع القرآن بجميع حروفه ووجوهه التی نزل بها وهی علی لغة قريش وغيرها وکان غرض عثمان رض تجريد لغة قريش من تلك القرأت وقد جاء ذلك مصرحا به فی قول عثمان لهؤلاء الكتاب فجمع ابوبکر غير جمع عثمان - یعنی یہ جو کچھ عثمان غنی نے کیا کہ لغت قریش کے علاوہ دیگر لغات قرآن سے حذف کردئے اور یہ صورت ابوبکر رضی نے نہیں کی تھی کیونکہ ابوبکر رض کی غرض تو قرآن کا جمع کرنا تھا۔ ان تمام حروف اور وجوہ کے ساتھ جن پر قرآن نازل ہوا اور وہ لغت قریش اور اس کے علاوہ دوسرے لغات تھے۔ اور حضرت عثمان کی غرض یہ تھی کہ لغت قریش کو جدا کر دیا جائے بقیہ تمام لغات اور قرأت سے چنانچہ اسی امر کی تصریح ہے عثمان رض کے قول میں جو انھوں نے کاتبین وحی کو فرمایا تو ابوبکر کا جمع کرنا اور تھا اور حضرت عثمان کا جمع اور تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے ازالۃ الخفاء میں ایک مہتم بالشان مقدمہ بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کی جمع و ترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ لیکن اس وعدۂ الٰہیہ کے ظہور اور حفاظت الٰہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح کہ انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ اس طرح کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہو جاتا جو مٹانے سے نہ مٹ سکے بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع و تدوین کی خدمت انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہٗ قرآنی پر متفق اور مجتمع ہو جاویں اور ہمیشہ جماعات عظیمہ اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں تاکہ سلسلۂ تواتر نہ ٹوٹ جائے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں بمشورہ و اجماع صحابہ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا جس میں قرأۃ شاذہ نہیں لی گئی بلکہ قرأۃ متواترہ لی گئی اور قبائل عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل ہوا تھا (یعنی اس کے پڑھنے کی ان زبانوں پر اجازت دی گئی تھی) ایک قریش کا لغت لے لیا گیا اور باقی لغات کے مصاحف متروک کر دیئے گئے۔

(ازالۃ الخفاء ج ۱)

قرآن کریم کا رسم خط اور اس کے اجزا کی تقسیم

حروف ہجا کی ہیئت ترکیبیہ ہی الفاظ و کلمات کی خاص خاص صورتیں بلکہ نفس حقیقت ہے جن پر بلحاظ کتابت مختلف کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔ اسی ترکیب اور انہی کیفیات کا نام رسم الخط ہے۔ اور اسی کی معرفت کو علم رسم الخط کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ قدرتِ خداوندی نے تمام علوم کی نشر و اشاعت اور ایک نسل سے دوسری نسل تک علوم کے منتقل ہونے کا ذریعہ قلم جیسی ناتوان اور حقیر چیز کو بنا دیا جیسا کہ ارشاد ہے

اِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ

بعض محققین علم رسم الخط کی ایجاد ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعض حضرت شیث علیہ السلام اور بعض حضرت ادریسؑ کی طرف۔ کتاب " نفائس الفنون" کے مؤلف نے عروۃ بن الزبیر اور عبد اللہ بن عمرو کی سند سے ایک حکایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم نے اپنے فرزندوں کے لئے جداگانہ (مختلف) تختیاں بنائی تھیں جن پر خاص خاص خطوط میں ان لغات کے کچھ اصول تحریر تھے جو ان کے واسطے مقرر و تجویز کئے تھے وہ تختی جس پر لغت عرب کے اصول لکھے ہوئے تھے طوفان نوح میں ضائع ہو گئی تھی مدتوں کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ تختی کوہِ ابو قبیس کے ایک مدفون خزانہ میں محفوظ ہے بڑی محنت اور تلاش کے بعد وہ مل گئی۔ مگر نقوش مندرجہ کے سمجھنے میں دقت ہوئی تو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور التجا کی کہ حقیقت منکشف کی جائے۔ جبریل امین آئے اور اس نقش کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا اور لغات عرب کے اصول بتائے۔ اسی مؤلف نے دوسری روایت بھی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف کی صورتیں مرام بن مرہ نے ایجاد کی۔ اور وصل و فصل کا ضابطہ اسلم بن سدرہ نے اور نقطوں کی صنعت عامر بن حدرہ نے۔ بعض تاریخی روایات[۱] یہ بتاتی ہیں کہ اہل مدین عربی خط کے موجد ہیں۔ ابجد۔ ہوز۔ حطی۔ وغیرہ ان کے سرداروں کے نام تھے۔ بہر کیف اس دھندلی سی روشنی کے ذریعہ عربی رسم خط کی ابتدائی تاریخ کی طرف کچھ رہنمائی ہوتی ہے (تفصیل کے لئے مقدمہ ابن خلدون کی مراجعت کی جائے)

زمانۂ جاہلیت میں بھی اہل عرب کم و بیش کتابت کا سلیقہ رکھتے تھے اور ان میں جو خط مروج تھا اس کو خط معقلی کہا جاتا تھا۔ پھر خطۂ عرب میں خط کو فی رواج پذیر ہوا۔ اب جو خط عرب میں مروج ہے وہ ابن مقلہ کا ایجاد کردہ ہے۔ بعد کے زمانوں میں اسی کی تزیین و تنویع ہوتی رہی اور دوسرے فنون کی طرح مسلمانوں نے اس فن کو

---

[۱] بحوالہ حدائق البیان۔

بھی مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔

قرآن کریم جب نازل ہوا اور اس کے الفاظ و کلمات کو کتابت کا لباس پہنایا گیا تو بالعموم اسی طرز اور رسم خط پر کتابت کیا گیا جو عرب میں مروج تھا۔ البتہ بہت سے کلمات اور مواقع میں عام رسم خط اور قواعد کی مطابقت کا اتباع نہیں کیا گیا بلکہ قرآنی رسم الخط ایک امتیازی نوعیت کے ساتھ متعین و مقرر رہا۔ وہ مصحف عثمانی کا رسم خط ہے۔ تقریباً چودہ صدیاں گذر گئیں لیکن قرآنی رسم الخط اسی طرح محفوظ ہے جیسا کہ جامع القرآن حضرت عثمانؓ کے مصحف میں تھا۔ ان مختصر کلمات میں اس کی گنجائش نہیں کہ بالاستیعاب قرآنی رسم الخط کی خصوصیات بیان کی جائیں بطور مثال چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) اسم منادی یا متکلم کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بغیر یٰ کے کتابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً یاعباد فاتقُوْنِ۔ اسی طرح اکثر مواقع میں یائے متکلم کتابت سے ترک کردی جاتی ہے جبکہ فواصل آیات پر واقع ہو۔ مثلاً فَلَا تفضحُوْنِ اور وَلَا تخزُوْنِ۔ اور اسم منقوص سے حذف کثرت کے ساتھ ہے جیسے عادٍ، باغٍ، قاضٍ۔

(۲) لفظ صلوٰۃ، زکوٰۃ، ربٰوا اور حیٰوۃ ہمیشہ واؤ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔

(۳) یا حرف ندا اور اس کے بعد کا الف اکثر حذف ہوتا ہے مثلاً یاَیُّھَا الذین۔ یاٰدم یعبادی۔ یموسیٰ اسی طرح ضمیر جمع متکلم نا کے الف کو بھی نہیں لکھا جاتا۔ مثلاً انجینٰکم۔ حشرنٰھم۔ انزلنٰہ۔

قرآن کے اس خصوصی رسم خط کا تحفظ ضروری ہے۔ تمام ائمہ اس بات پر متفق ہیں مصحف "الامام" کے رسم خط کے خلاف الفاظ قرآن کی کتابت کرنا درست نہیں۔

امام مالکؒ سے مصحف "امام" کے اس رسم الخط کے متعلق جو بظاہر قواعد عربیہ اور علماء نحو کے مقرر کردہ اصول کے خلاف ہے۔ دریافت کیا گیا کہ آیا وہ الفاظ قواعد عامہ کے مطابق کتابت کئے جائیں یا مصحف امام کی اتباع کی جائے۔ امام رحؒ نے فرمایا ہرگز نہیں اس کو چاہئے کہ قرآنی رسم خط کی پیروی کرے۔ امام احمدؒ سے منقول ہے کہ واو، الف، ی وغیرہ کی کتابت میں مصحف عثمانی کی رسم خط کی مخالفت حرام ہے۔

بیہقی، شعب الایمان میں بیان کرتے ہیں جو شخص مصحف لکھے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انہی حروف تہجی کی حفاظت کرے جس کے ساتھ صحابہ نے ان مصاحف کو لکھا ہے اور ان کی لکھی ہوئی چیز میں سے کسی شئی کو متغیر نہ کرے۔ اس لئے کہ وہ لوگ بہ نسبت ہمارے بہت زیادہ علم رکھتے تھے۔ ان کے قلب اور ان کی زبانیں صادق تھیں وہ امانت میں ہم سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان کی کمی پورا کرنے والا گمان کریں۔[۱]

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن۔

حضرت عمرؓ نے بسم اللہ الرحمٰن کے سین کو طویل اور ظاہر طور پر نہ لکھنے پر ایک درہ کی سزا دی۔ کوئی تعجب نہیں کہ قدرت الٰہی نے قرآنی رسم خط کا یہ اہتمام اس وجہ سے فرمایا ہو کہ وہ شکل بعینہ لوح محفوظ کی ہو۔ اسی لئے حضرات صحابہ اور ائمہ نے اس کے تحفظ کا اہتمام فرمایا اور ظاہر ہی وہ حکمت اور راز ہے کہ بعض مواقع میں یہ دیکھا گیا کہ ایک لفظ دو مختلف جگہوں میں مختلف صورتوں میں لکھا ہوا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی ؒ نے قرآنی رسم الخط کو چھ اصول میں منحصر فرمایا ہے۔

حذف، زیادۃ، ہمزہ، بدل، وصل، فصل[1]

شیخ جلال الدین سیوطی ؒ الاتقان فی علوم القرآن میں قرآنی رسم الخط اور کتابت قرآن کے آداب پر ایک مستقل فصل میں بیان فرماتے ہیں۔

وھل یجوز کتابتہ بقلم غیر العربی قال الزرکشی لم ار فیہ کلاما لاحد من العلماء قال ویحتمل الجواز لانہ قد یحسنہ من یقرءہ بالعربیۃ والاقرب المنع کما تحرم قرأتہ بغیر لسان العرب ولقولھم القلم احد اللسانین والعرب لا تعرف قلما غیر العربی وقد قال تعالیٰ بلسان عربی مبین (اتقان ص۱۷۱ ج ۲)

اور کیا قرآن کریم کی کتابت غیر عربی رسم الخط میں جائز ہے؟ (تو) علامہ زرکشی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس متعلق علماء میں کسی سے کچھ نہیں دیکھا (کہ کیا تصریح کی ہے) اور یہ فرمایا ہاں) امکان ہے جواز کا کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص جو عربی میں پڑھ سکتا ہے وہ بہتر کتابت کر لیتا ہے غیر عربی میں (یعنی عربی رسم الخط صرف پڑھ سکتا ہے اس کی کتابت پر قدرت نہیں ہوتی) مگر حق سے قریب امر یہی ہے کہ (غیر عربی کتابت) ممنوع ہے جیسا کہ قرآن کی قرأت غیر عربی زبان میں حرام ہے۔ اور اس لئے بھی کہ مشہور ہے قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے۔ اور اہل عرب تو کوئی قلم جانتے ہی نہ تھے سوائے عربی (رسم الخط) کے اور حال یہ کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے۔ ہم نے قرآن اتارا ہے زبان عربی مبین کے ساتھ۔

تو معلوم ہوا کہ جس طرح لفظاً وقرأۃً قرآن عربی ہے اسی طرح کتابۃً بھی قرآن عربی مبین ہے تو کیسے درست ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے رسم الخط کے ساتھ قرآن کریم کی کتابت کی جائے۔

علامہ حسن شرنبلانی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی کے مشہور فقیہ محقق اور فقہ حنفی کے مفتی ہیں ان کا اسی موضوع پر ایک مستقل رسالہ "النفحۃ القدسیہ فی احکام قرأۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ" ہے۔ اس میں علامہ ؒ نے ائمہ اربعہ کا اتفاق اور اجماع امت اس بات پر نقل کیا ہے کہ کتابت قرآن میں مصحف امام (مصحف عثمانی) کے رسم خط کا اتباع ضروری ہے۔ غیر عربی رسم الخط میں اس کا لکھنا ممنوع ہے۔

---

[1] اہل علم حضرات تفصیل کے لئے الاتقان ص۱۶۱ ج ۲ کی مراجعت فرمائیں)

اسی رسالہ میں علامہ رح نے شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی رح سے نقل کیا ہے۔

وقد افاد شیخ الاسلام العلامۃ ابن حجر العسقلانی رح فی فتاواہ تحریم الکتابۃ وقد سئل ھل تحرم کتابۃ القرآن الکریم بالعجمیۃ کقرأتہ فاجاب بقولہ قضیۃ ما فی المجموع الاجماع علی التحریم۔

کہ شیخ الاسلام علامہ ابن حجر رح نے اپنے فتاوٰی میں تحریر فرمایا ہے جب کہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن کریم کی کتابت عجمی (رسم خط) میں حرام ہے جیسا کہ اس کی قرأت عجمی زبان میں حرام ہے تو فرمایا کہ مجموع کتاب کا فیصلہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اس کی حرمت پر اجماع۔

حنابلہ کے مشہور امام ابن قدامہ رح کی کتاب "مغنی" کے حواشی میں اس کو اور بھی زائد واضح کر دیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں نازل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں بھی ایک واقعہ ایسا ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی رعایت سے اس کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو یا عجمی رسم خط میں اس کے لکھنے کی اجازت دی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب مبارکہ جو شاہان عجم کسرٰی وقیصر اور مقوقس وغیرہ کے نام روانہ کئے گئے ان سب کے عکس دنیا کے سامنے آج بھی موجود ہیں کہ نہ ان میں عجمی زبان اختیار کی گئی اور نہ ان کا رسم خط غیر عربی رکھا گیا۔ بلکہ خط کوفی میں لکھے گئے جو عربی رسم خط ہی کی ایک شکل[1] ہے

اہل عرب اپنی مادری زبان عربی ہونے کی وجہ سے اس بات کے محتاج نہ تھے کہ قرآن کریم پر اعراب لگائے جائیں۔ چنانچہ وہ مصحف جو عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے امر سے کتابت کیا گیا تھا اس پر اعراب نہ تھے لیکن کثرت فتوحات کی وجہ سے جب اسلام عجم میں پہنچا اور لوگ اعراب میں غلطیاں کرنے لگے تو اس کا اندیشہ ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت غلط اعراب کے ساتھ ہونے لگے تو زیاد بن امیہ (جو والی عراق تھا) نے ابوالاسود[2] کو پیغام بھیجا کہ اعراب وضع کریں تاکہ اس کے مطابق لوگ قرآن کی تلاوت کر سکیں۔ تو ابوالاسود نے فتحہ کے لئے علامت حرف کے اوپر ایک نقطہ تجویز کیا اور کسرہ کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ اور ضمہ کیلئے حرف کی جانب اور تنوین کے لئے دو نقطے متعین کئے۔ شیخ سیوطی فرماتے ہیں کہ اعراب کی کارروائی ابوالاسود نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے کی تھی۔

---

[1] مغنی مع الشرح الکبیر ص ۵۳ / ج ۱ بحوالہ تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط عن مصحف الامام

[2] ابوالاسود دئلی کبار تابعین میں سے ہیں۔ حافظ نے تقریب التہذیب میں ان کو مخضرمین یعنی ان حضرات میں شمار فرمایا ہے جن کی زندگی کا ایک حصہ جاہلیت میں گذرا اور دوسرا حصہ اسلام میں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکے۔ تاریخی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت علی نے ان کو اعراب اور قواعد نحویہ کے مرتب کرنے پر مامور فرمایا تھا بہرکیف اکثر محققین کی یہی رائے ہے کہ ابوالاسود اعراب کے موجد اول ہیں بعض حسن بصری اور بعض نصر بن عاصم اللیثی اور بعض یحیٰی بن یعمر کو کہتے ہیں۔

اعراب قرآن شریعت کی ایک اہم بنیاد اور صحت قرآن کے لئے مدار تھا اللہ نے امت کے برگزیدہ افراد کو اس کی توفیق دی کہ وہ اس عظیم خدمت کی طرف متوجہ ہوں۔

ابن ابی ملیکہ سے منقول ہے کہ ایک اعرابی عمر فاروق کے زمانہ میں آیا اور کہا کہ کوئی شخص ایسا ہے کہ جو مجھے قرآن پڑھادے ایک شخص نے اس کو سورۂ براۃ پڑھائی تو اس میں آیت اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْءٌ مِنَ المُشرِکِینَ وَرَسُولُہٗ کو جر (وَرَسُولِہٖ) کے ساتھ پڑھایا۔ اس تغیر سے معنی یہ ہوگئے کہ اللہ مشرکین اور (العیاذ باللہ) اپنے رسول سے بری ہے۔ وہ اعرابی یہ سن کر کہنے لگا کہ جب اللہ ہی اپنے رسول سے بری ہے تو میں اس سے پہلے بری ہوں۔ اور عمر فاروق کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ صورت بیان کی حضرت عمرؓ فرمانے لگے، آیۃ اس طرح نہیں ہے۔ آیت کلام اللہ یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْءٌ مِنَ المُشرِکِینَ وَرَسُولُہٗ۔ کہ اللہ بری ہے مشرکین سے اور اس کا رسول بھی بری ہے (مشرکین سے) اس پر عمرؓ نے حکم دیا کہ کوئی شخص بجز عالم لغت کے قرآن نہ پڑھائے اور ابوالاسود کو علم نحو وضع کرنے کیلئے حکم دیا۔

قرآن کریم کو اعراب سے مزین کرنا خود منشار نبوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق ہے سلفی نے ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ

اَعرِبُوا القُراٰن یدلکم علی تاویلہ[1] — آنحضرت کا ارشاد ہے قرآن پر اعراب لگاؤ۔ اعراب قرآنی اس کی مراد پر رہنمائی کرے گا۔

ابوبکر اور عمر فاروق رضہ سے منقول ہے فرمایا کرتے تھے کہ اعراب قرآن ہم کو اس کے حروف کی حفاظت سے زائد محبوب ہے۔

ابن خلکان بیان کرتے ہیں کہ ابوالاسود نے جب ایک شخص کو آیت اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْءٌ مِنَ المُشرِکِینَ وَرَسُولُہٗ غلط پڑھتے ہوئے سنا کہ وہ بجائے وَرَسُولُہٗ کے کسرۂ لام کے ساتھ وَرَسُولِہٖ پڑھ رہا ہے جس سے معنی کا فساد ظاہر ہے تو ابوالاسود کو یہ چیز نہایت ہی ناگوار گذری۔ عزم کیا کہ قرآن پر اعراب لگاؤں چنانچہ ابوالاسود نے دس اشخاص کو منتخب کر کے آیات قرآنیہ پر اعراب لگانے شروع کر دیئے۔

ابتدائی مرحلہ پر اعراب کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ آیات قرآنیہ کی سیاہی سے مختلف ایک رنگ سے نقطے قائم کئے کہ فتح کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ اور ضمہ کے لئے حرف کے کنارہ پر اور کسرہ کے لئے حرف کے نیچے اور تنوین کے لئے دو نقطوں کو مقرر کیا گیا۔ اس شکل سے قرآن از اول تا آخر معرب کر لیا گیا۔

کچھ عرصہ تک یہ صنعت ابوالاسود کے ایجاد کردہ طریقہ پر چلتی رہی بعد میں علم نحو کے مشہور امام

---

[1] الاتقان صفحہ ۱۷۵ ج ۲

ابو عبدالرحمن خلیل کے زمانہ میں اس صنعت کو ترقی ہوئی اور فتح کے لئے حرف کے اوپر شکل مستطیل اور کسرہ کے لئے حرف کے نیچے اور ضمہ کے لئے چھوٹے واؤ کی شکل تجویز کی گئی۔ اور اس ایجاد نے ایسی ترقی اور مقبولیت اختیار کی کہ اعراب کی سابق علامتیں کالعدم ہو گئیں۔

قرطبی فرماتے ہیں کہ مصحف قرآنی پر اعراب اور نقطوں کی تعیین عبدالملک بن مروان کے حکم سے ہوئی اس کام کے واسطے حجاج بن یوسف مقام واسط میں فارغ و یکسو ہو کر بیٹھا اور اس عظیم الشان مقصد کے لئے جد وجہد کی۔ اعراب و نقط کی مہم کے ساتھ حجاج نے قرآن کے اجزاء کا تجزیہ اور تیس پاروں پر تقسیم بھی کی تاریخی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حجاج ہی کے زمانہ میں اعشار اور رکوع مقرر کئے گئے۔

عبدالملک بن مروان نے اسی خدمت کے لئے حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کو بھی مقرر کیا۔ زبیدی "کتاب الطبقات" میں بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مصحف پر نقطے ابوالاسود نے قائم کئے یحییٰ بن ابی کثیر بیان کرتے ہیں کہ ابتداء قرن میں مصحف قرآنی نقطوں اور اعراب سے خالی تھا سب سے اول امت کے علماء نے ب ت ث نقطے قائم کئے۔ اور جمہور کی رائے یہی ہوئی کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور فرمانے لگے کہ یہ تو "نورٌ علیٰ نور" ہے۔ پھر ختم آیات پر علامت کے طور پر نقطے لگائے۔ [۵۱]

بہر حال اس طرح امت نے کتاب الٰہی کی حفاظت اور اس کی خدمت کا اہتمام کیا کہ تاریخ عالم اس کی مثال سے عاجز ہے۔ روئے زمین کے مسلمانوں نے مصاحف قرآنیہ کے لئے اس طرز کو پسند کیا اور مشرق و مغرب کے تمام بلاد میں مصاحف قرآن اسی طرح طبع ہونے لگے۔ اور انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون میں کتاب اللہ کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ بحمد اللہ پورا ہو کر رہا اور انشاء اللہ قیامت تک اسی طرح قرآن کریم محفوظ رہے گا کہ اس کے کسی زبر زیر میں کوئی تغیر و تبدیلی پر قادر نہ ہو سکے گا۔

آیات اور سورتوں کی ترتیب

آیات کی ترتیب بلاشبہ توقیفی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین کردہ) ہے جس میں کسی کے اجتہاد اور قیاس کو ادنیٰ دخل نہیں اسی پر اجماع ہے نصوص و روایات کثرت سے آیات قرآنیہ کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ علامہ زرکشی [۵۲] نے "برہان" میں اور جعفر بن الزبیر اس پر اجماع نقل کرتے ہیں۔ علامہ آلوسی [۵۳] فرماتے ہیں جن بعض آثار سے ترتیب کے اجتہادی ہونے کا گمان کیا جاتا ہے

---

۵۱ تفسیر قرطبی ج۱ ص۶۳ ۵۲ اتقان ج۱ ص۶۲ ۵۳ روح المعانی ج۱ ص۳۵

وہ آثار درجہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

ابن الحصار کا قول ہے کہ سورتوں اور آیات قرآنیہ کی ترتیب و وضع اپنے اپنے مواقع میں وحی خداوندی ہی سے ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت نازل ہوتے پر فرما دیا کرتے تھے۔ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں موقع پر فلاں آیت کے بعد مقرر کر لو۔

عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ

قال کنت جالساً عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ شخص ببصرہ ثم صوّبہ ثم قال اتانی جبریل فامرنی ان اضع ھذہ الآیۃ ھذا الموضع من ھذہ السورۃ ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ الخ

(مسند احمد بن حنبل)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں آنحضرت نے اپنی نگاہ (آسمان کی طرف) بلند فرمائی پھر اس کو نیچے جھکا لیا اور اس کے بعد فرمایا میرے پاس جبریل آئے اور انھوں نے کہا کہ میں اس آیت کو فلاں سورت میں اس موقع پر رکھوں۔ آیت ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ الخ۔

مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں یہ مضمون ہے کہ جبریل امین وحی الٰہی کے پہنچا دینے کے بعد بیٹھے رہتے تھے یہاں تک کہ ان آیات کی کتابت کے بعد پھر آپ جبریل امین کو وہ آیات سناتے تاکہ کتابت میں کسی قسم کی فروگذاشت نہ رہ سکے۔

امام بغوی شرح السنۃ میں فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ نے مجموعہ اوراق میں یک جا اسی قرآن کو جمع کیا تھا جو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کمی یا زیادتی اور تغیر کریں اس کو اسی طرح جمع اور مرتب کیا جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے تھے۔ اور نہ ہی یہ کیا کہ اس میں سے کوئی چیز مقدم کریں یا مؤخر کریں۔ یا ایسی کسی ترتیب کے ساتھ اس کو مرتب کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین نہ فرمائی ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ہدایت فرما دیتے تھے۔ فلاں آیت فلاں مقام پر رکھو اور صحابہ کو بھی اسی ترتیب کے مطابق قرآن کی تعلیم دیتے تھے جو آج ہمارے سامنے مصاحف قرآن میں موجود ہے۔ جبریل امین کے بتا دینے کے مطابق کہ کونسی آیت کس سورت میں کونسی آیت کے بعد ہے۔ تو معلوم ہوا کہ صحابہ کی کوشش یہ تھی کہ قرآن کریم ایک جگہ مرتب کر دیا جائے۔ نہ یہ کہ انھوں نے اپنی طرف سے اسے ترتیب دی۔ قرآن لوح محفوظ میں اسی ترتیب کے ساتھ تھا جس میں سے متفرق اور مختلف آیات حسب ضرورت اور مصلحت نازل ہوتی رہتی تھیں۔ اور جبریل لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق آیات کے مواقع متعین کر دیا کرتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اس پر

مطلع فرماتے رہتے۔[۱]

سورتوں کی ترتیب بھی محققین علماء کے نزدیک توقیفی ہے۔ شیخ سیوطی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ نقل کیا کہ اجتہادی ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں بعض سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور بعض کی اجتہادی آثار و دلائل سے قول اول ہی قوی اور راجح معلوم ہوتا ہے۔

ابو بکر الانباری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قرآن آسمان دنیا پر بیک وقت نازل فرما دیا پھر متفرق طور پر بیس سال (یعنی تئیس کسر کو حذف کرتے ہوئے) کی مدت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتا رہا بعض سورتیں نازل ہوتیں بعض پیش آنے والے واقعات پر اور کبھی کوئی آیت اترتی کسی سائل کے سوال کے جواب میں اور جبریل آنحضرت کو مطلع کرتے رہتے سورتوں اور آیات کے مواقع سے۔ تو آیات و کلمات اور سورتوں کا تسلسل اور ان کی ترتیب سب کچھ محمد صلے اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین کی طرف سے ہے۔ اس لئے اب اگر کوئی شخص کسی مقدم سورت کو مؤخر یا مؤخر کو مقدم کرے گا تو ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی آیات کی ترتیب بگاڑ دے یا حروف و کلمات میں تغیر و تبدل کر دے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترتیب رب العالمین سے حاصل کی ہے وہ خود ہی فرما دیا کرتے تھے کہ یہ سورت فلاں جگہ رکھو اور یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد۔[۲]

حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے کی دلیل احمد بن حنبل اور ابو داؤد کی وہ حدیث بھی ہے جس میں وفد ثقیف کے اسلام لانے کے بعد حاضری کا قصہ مذکور ہے۔ اس میں ہے۔

فقال لنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طَرَءَ
عَلَیَّ حِزْبِیْ مِنَ القرآن فاردتُّ ان لا اَخْرُجَ حَتّٰی
اَقْضِیَہٗ قال فسألنا اصحاب رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم قلنا کیف تُحَزِّبُوْنَ القرآن
قَالُوْا نُحَزِّبُہٗ ثلاث سور وخمس سور وسبع
سور وتِسْعَ سور واحدی عشرۃ سورۃً وثلاث
عشرۃَ سورۃ وحِزْبُ المفَصَّل من قٓ حتی
نختم القرآن۔[۳]

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر طاری تھا۔ میرا حصۂ معینہ تلاوت قرآن کریم کا یعنی میں مشغول تھا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں اسے پورا کئے بغیر باہر نہ نکلوں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم کے صحابہ سے یہ دریافت کیا کہ آپ لوگ قرآن کے حصے کس طرح مقرر کرتے ہو۔ کہنے لگے کہ ہم اس کے حصے کر لیتے (تلاوت کے لئے) تین سورتیں، پانچ سورتیں سات سورتیں نو سو گیارہ سورتیں، تیرہ سورتیں اور مفصلات کا حصہ سورۂ قٓ سے یہاں تک کہ ہم قرآن ختم کر لیتے ہیں۔

۱؎ الاتقان ص۶۳ ج۱۔ ۲؎ احکام للقرطبی ص۶ ج۱ ۳؎ فتح الباری بحوالہ الاتقان ص۶۵ ج۱

غرض اس سے یہ امر واضح ہوا کہ آنحضرت اور صحابہ ایک متعین ترتیب کے ساتھ قرآن تلاوت فرماتے تھے اور آج وہی ترتیب مصحف قرآن کی ہمارے سامنے ہے جو عہد نبوی میں تھی ۔

علامہ آلوسی رح مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں کہ طیبیؒ سے بھی یہی منقول ہے اور یہی جمہور علماء وائمۂ تفسیر کا مسلک ہے البتہ احمد بن حنبل ترمذی اور ابوداؤد کی اس روایت کے پیش نظر اشکال ہے جس میں ابن عباس رض نے حضرت عثمان رض سے انفال و براۃ کی ترتیب کے بارہ میں سوال کیا تو حضرت عثمان نے جواب دیا کہ سورۂ انفال مدینہ منورہ کی ابتدائی زندگی میں نازل ہوئی تھی اور براۃ مدنی زندگی کے آخر حصہ میں نازل ہوئی مضمون ہر دو سورت کا باہم مشابہ تھا۔ تو میں نے خیال کیا کہ براۃ انفال ہی سے ہے۔ آنحضرت رحلت فرما گئے اور یہ بیان نہ فرمایا کہ سورۂ براۃ انفال سے ہے یا نہیں۔ اس وجہ سے ان دونوں کو متصل مصحف میں مرتب کیا گیا۔ اور بسم اللہ کی سطر درمیان میں نہیں لکھی گئی کیونکہ بسم اللہ تو ان دو سورتوں کے درمیان ہوتی ہے جنکا مستقل مستقل سورت ہونا متعین اور قطعی ہو۔ اور ان دونوں کو سبع طول میں رکھا گیا ۔

تو اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب میں اجتہاد کو دخل رہا ہے۔ اسی بنا پر بیہقی اُس جانب مائل ہوگئے کہ قرآن کی تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے۔ بجز سورۂ انفال و براۃ کے کہ ان کی ترتیب اجتہادی ہے۔ شیخ سیوطی رح کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔ اس ناچیز کا قلبی میلان اور انشراح اس امر پر ہے کہ مصحف کلام اللہ اپنی ترتیب و تالیف کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معین کردہ ترتیب کے مطابق ہے۔ نیز یہ بات قرین قیاس بھی معلوم نہیں ہوتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم میں سے کوئی امر بلا وضاحت و بیان مخفی اور مبہم رہنے دیں۔ اس لئے یہی مسلک اولیٰ وانسب ہے کہ آیات کی ترتیب کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی علی الاطلاق توقیفی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معین فرمودہ ترتیب کے مطابق ہے۔[۱]

قرن اول میں بعض صحابہ نے بغرض تلاوت اور اپنے خصوصی معمولات کے طور پر متعدد سورتوں کے کچھ مجموعے اپنے لئے مرتب کئے ہوئے تھے جن میں بعض سورتوں کی تقدیم و تاخیر تھی۔ تو اس سے یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ ترتیب سور اجتہادی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بعض سورتوں کو کسی کا انفرادی طور پر قدرے تقدیم و تاخیر سے مرتب کر لینا قرآن کریم کی اصل محفوظ ترتیب کے توقیفی ہونے کے خلاف نہیں

---

۱ تفسیر روح المعانی ص ۲۶ ج ۱

اِعجازِ قرآن

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا

اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید **معجزہ** ہے اور اس کے مانند کوئی کلام پیش کرنا طاقت بشریہ سے خارج ہے۔ اگر تمام عالم بھی متفق و متحد ہو کر کوشش کرے تو بھی یہ ممکن نہیں۔ آیۃ مذکورہ حق تعالےٰ شانہ کی طرف سے اسی امر کا اعلان ہے کہ (اے نبی کریم) کہدیجئے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور جن اس پر کہ لے آئیں کوئی کلام اس قرآن جیسا تو ہرگز نہ لاسکیں گے اس جیسا اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس اعلان کی صداقت میں تردد کرنے والے گمراہوں کو مقابلہ کی دعوت دیدی گئی۔ کہ

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

اور اگر تم کسی کھٹک اور تردد میں پڑے ہوئے ہو اس چیز کی طرف سے جس کو نازل کیا ہم نے اپنے (خاص) بندے پر، تو پھر بنا لاؤ تم بھی کوئی سورت (اور ٹکڑا) اسی کلام جیسا اور بلالو تم اپنے مددگاروں کو خدا کو چھوڑ کر اگر تم سچے ہو۔ [۱]

عرب کے ان فصحاء و بلغاء اور مایۂ ناز شعراء اور خطباء کو مقابلہ کی دعوت دی گئی جن کا بچہ بچہ شعر گوئی اور گہوارۂ فصاحت ہی میں تربیت پاتا تھا۔ وہ قوم جب ہر چند کوشش اور طرح طرح کی تدبیروں کے باوجود بھی قرآن کے مانند کوئی مختصر سا کلام بھی بنا سکنے سے عاجز رہی تو عقلاً یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قرآن اللہ کی طرف سے معجزہ (دلیل نبوت) ہے۔ اور دنیا کو اس نے اپنے مقابلہ سے عاجز کر دیا ہے۔ اگر ادنیٰ امکان بھی ہوتا تو وہ لوگ اپنی اسلام دشمنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ عناد رکھنے کی وجہ سے قرآن کے مقابلہ سے پیچھے ہٹنے والے نہ ہوتے لیکن ہر چند

---

[۱] مسئلہ اعجاز قرآن امت میں نہایت ہی اہتمام بالشان مسئلہ رہا ہے۔ ہر دور اور قرن میں علماء اس موضوع پر مستقل تصانیف کرتے رہے۔ ائمہ متقدمین۔ خطابی۔ الزمانی۔ امام رازی۔ الزملکانی۔ ابن سراقہ اور قاضی ابوبکر الباقلانی کی اعجاز قرآن پر کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابوبکر الباقلانی کی کتاب اعجاز القرآن کے متعلق ابن العربی کا قول ہے کہ ایسی کوئی کتاب دنیا میں تصنیف نہیں ہوئی (الاتقان ج ۲ ص ۱۱۶)

جدوجہد اور اپنی امکانی کوششوں سے تھک چکنے کے بعد سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ پایا کہ مہمل اور بے معنی اعتراضات ہی کرنے لگیں[۱]۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اس امر کی ہمت نہ کی کہ کہدیتا۔ ہم نے قرآن کے اس اعلان کا جواب دیتے ہوئے یہ کلام پیش کیا ہے

معجزہ

لفظ معجزہ اعجاز سے مشتق ہے۔ جس کے معنی عاجز کر دینے کے ہیں۔ اصطلاح اور عرف شریعت میں ہر اس خارق عادت امر کو کہا جاتا ہے جو پیغمبر کے ذریعہ ظاہر ہو اس طرح کہ قدرت بشریہ اس جیسی چیز پیش کرنے سے عاجز رہے جس کے دیکھتے ہی لوگ سمجھ جائیں کہ یہ کام مادی طاقت اور انسانی قوت سے بالا و

---

۱ کبھی کہتے قرآن کہانت ہے اور کبھی آپ کی طرف جنون کی نسبت کرتے کبھی کہتے کہ شعر ہے۔ جب یہ سب باتیں خود ان کو ہی لغو اور بے معنی محسوس ہوتی تو کہنے لگتے کہ سحر اور جادو ہے۔ قرآن کریم میں ان کی اس قسم کی لغویات کا جواب دیا جاتا ہے کہ ما اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ " کہ آپ تو اپنے رب کے فضل و انعام سے مجنون نہیں۔ صحیح العقل آدمی کا یہ کام نہیں کہ وہ ایسی ذات کو جس کی زبان سے حقائق و معارف کے سمندر جاری ہوں وہ اس کو مجنون کہہ سکے اس لئے جو کہنے والا ہے یہ قول خود اس کے مجنون ہونے کی دلیل ہے۔

کسی جگہ فرمایا گیا۔ انہ لقول رسول کریم وما ھو بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون ولا بقول کاھن سیرت کی روایات میں مذکور ہے کہ ولید اپنے گروہ کی باتیں سنکر کہا کرتا تمھاری یہ سب باتیں غلط اور لغو ہیں۔ آپ کاہن بھی نہیں۔ میں کاہنوں کو خوب جانتا ہوں اور نہ آپ کا کلام کاہنوں کے کلام کے مشابہ ہے۔ اور نہ آپ کا کلام شعر ہے۔ میں خود عرب کا بہترین شاعر اور اقسام شعر کا ماہر ہوں اس کلام کو شعر سے کوئی نسبت نہیں۔ اور آپ ساحر بھی نہیں ہیں اور نہ آپ کا کلام ساحروں کا دم کرنا اور پھونکنا ہے۔ لوگوں نے کہا اے ابو عبد شمس (کنیت ولید) آخر پھر وہ ہے کیا؟ ولید نے کہا "خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں ایک عجیب حلاوت اور شیرینی ہے اس پر عجیب قسم کی رونق ہے۔ اس قول کی جڑ نہایت تر و تازہ اور اس کی شاخیں ثمردار ہیں۔ اور جو کچھ تم نے کہا ہے میں خوب جانتا ہوں کہ وہ سب لغو اور باطل ہے۔ میرے نزدیک سب سے بہتر اور مناسب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کہو کہ وہ شخص ساحر ہے۔ اور اس کا کلام سحر ہے کیونکہ سحر میں تاثیر ہوتی ہے اور سحر کا خاصہ ہے میاں بیوی میں تفریق ڈالنا اور اس کا کلام ایسا ہی ہے کہ میاں بیوی، باپ بیٹے، بھائی بھائی اور قبیلہ اور کنبہ میں تفریق ڈالتا ہے۔" گویا انھوں نے نبی کریم اور قرآن سے لوگوں کو برگشتہ بنانے کے واسطے اس پروپیگنڈے کو زیادہ بہتر اور اپنے زعم میں کامیاب سمجھا کہ قرآن کو سحر کہا جائے تاکہ اس کی روحانی تاثیر کو محسوس کرنے کی صورت میں لوگوں کے اذہان خیال کو بلحاظ نسبت روحانی اور غیبی تاثیر سے ہٹا کر جادو کی تاثیر کی طرف منتقل کر دیں لیکن مشرکین کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ثابت ہوئی۔ بلکہ اس کے بعد اطراف و اکناف سے آنے والوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی حقانیت خوب

برتر ہے اور دائرہ اسباب سے خارج ہے اس لئے لامحالہ قدرت خداوندی ہی کا کرشمہ ہے۔

معجزات دلائل نبوت ہوتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ اپنے تمام پیغمبروں کو معجزات قاہرہ دیکر مبعوث فرماتا تاکہ قدرتِ خداوندی کی یہ نشانیاں دیکھ کر لوگوں کی گردنیں انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے لئے خم ہو جائیں۔ انبیاء بنی اسرائیل کو معجزات بالعموم وہ دیئے گئے جو محسوس اور مشاہد تھے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ عصا و ید بیضا اور سمندر میں عصا مارنے سے بارہ راستے پیدا ہوجانا اور پتھروں سے بارہ چشموں کا نکل پڑنا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادر زاد نابیناؤں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دینا مُردوں کا زندہ کرنا۔ پرندوں کی صورت بنا کر انھیں اڑا دینا اور یہ بتا دینا کہ لوگوں کے گھروں میں کیا ذخیرہ ہے اور وہ کل کیا کھائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے دھکتی ہوئی آگ کا برد و سلام ہو جانا۔ اور حضرت داؤد کے ہاتھوں میں لوہے کا نرم موم بن جانا وغیر ذلک۔ یہ سب معجزات جنیہ بنی اسرائیل کو دیئے گئے۔ کیونکہ ان قوموں میں بلادت و حماقت غالب تھی فہم و دانائی اور بصیرت کا اکثر میں نام و نشان نہ تھا اس لئے ایسے معجزات دیئے گئے کہ آنکھوں سے نظر آسکیں اور بلید سے بلید آدمی کو بھی گنجائش تردد نہ رہے۔ اس کے برعکس امت محمدیہ کے لئے معجزات عقلیہ دیئے گئے جن کا تعلق فہم و بصیرت اور عقل سے تھا کیونکہ اہل عرب جو وحی کے اولین مخاطب تھے وہ عقل و دانائی اور فکر و تدبر میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کو معنوی اور روحانی معجزے دکھائے گئے اور جو ان میں سابقین کی طرح کودن و احمق اور کوڑھ مغز تھے ان کی خاطر حسی معجزات بھی معنوی معجزات کے ساتھ جمع کر دیئے گئے۔

نیز یہ کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت قیامت تک کے لئے مشروع کی گئی اور آپ کا دین ہمیشہ کے لئے آتارا گیا تھا اس لئے ایسے معجزات آپ کی نبوت اور شریعت کے مناسب تھے جو آپ کی وفات پر انبیاء سابقین کے معجزات کی طرح منقطع ہونے والے نہ ہوں بلکہ ان معجزات کی معجزانہ شان قیامت تک اسی طرح باقی اور قائم رہے جیسے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت میں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ شان معنوی اور روحانی معجزات ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ کی نبوت کے دلائل زیادہ تر معجزات عقلیہ بنائے گئے جن میں سب سے بڑا اور عظیم المرتبت معجزہ قرآن کریم ہے جس کو قیامت تک لوگ دیکھیں گے اور اُس کے ذریعہ ایمان لائیں گے۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من الانبیاء من نبیٍّ اِلّا قد اُعطی من الآیات ما مثلہٗ اٰمن علیہ البشرُ وانّما کان الذی

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء سابقین میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں گذرا کہ اسے نہ دیا گیا ہو آیات و معجزات میں سے کوئی ایسا معجزہ کہ اس جیسے پر انسان ایمان نہ لایا ہو

أُوتِيتُ وَحْيًا أَوْحَى اللهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (صحیح مسلم)

(بلکہ ہر پیغمبر کو معجزات ایسے دیے گئے کہ ان پر لوگ ایمان لائے اور جز این نیست کہ جو چیز مجھ کو دی گئی وہ اللہ کی وحی ہے جو اللہ نے میری طرف بھیجی (یعنی قرآن) پس میں امید کرتا ہوں کہ میں ہی زائد ہوں گا قیامت کے روز متبعین کی تعداد کے اعتبار سے۔

کلمات مبارکہ اسی مضمون کی جانب رہنمائی کر رہے ہیں کہ انبیا رسابقین کے معجزات (مثلاً حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام) بے شک اپنی اپنی جگہ نہایت عظیم الشان معجزے اور قدرت خداوندی کی واضح نشانیاں اور ان کی نبوت کے لئے برہان قاطع تھے لیکن وہ معجزات ان حضرات انبیاء کے زمانوں کے ختم ہو جانے کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اب عصا و ید بیضا، اور احیائے موتیٰ کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن نبی آخر الزماں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ایسا معجزہ ہے کہ جو کسی زمانہ کے ساتھ ختم نہ ہوگا۔ بلکہ دنیا فنا ہو جائے گی۔ اور یہ معجزہ اسی طرح زندہ رہے گا۔ اور لوگ ہر دور در قرن میں اس کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لاتے رہیں گے۔ اس لئے لامحالہ آپ کے متبعین کی تعداد بھی تمام پیغمبروں کے متبعین سے زائد ہو گی۔

کفار مکہ جب مقابلہ سے عاجز رہے اور قرآن کے اس اعلان صداقت کے خلاف کوئی آواز بلند کرنے پر قدرت نہ پا سکے تو یہی کہنا شروع کیا کہ

لولا انزل علیہ اٰیات من ربہ

(کیوں نہیں اتاری جاتیں آپ پر نشانیاں آپ کے رب کی طرف سے)

اس کے جواب میں آپ کو ارشاد فرمایا گیا۔

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ۔

کہدیجیے کہ نشانیاں تو اللہ کے یہاں ہیں (اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں) اور میں تو کھلم کھلا (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا ہوں۔ (فرمایا خداوند عالم نے) اور کیا ان کو یہ (سب سے بڑی نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر نازل کیا قرآن کو جو ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔

یعنی قرآن سے بڑھ کر اور کیا معجزہ اور نشانی ان کو درکار ہے۔ یہی تو سب سے بڑی دلیل و نشانی ہے کہ اللہ کا کلام ان کے روبرو تلاوت کیا جاتا ہے جس کی ہر آیت بذات خود کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کے وجوہ اعجاز

قرآن کریم تمام ابواب ہدایت کے لئے ایک جامع اور وسیع ترخزانہ ہے۔ اس کے علوم ایک دریائے ناپیداکنار ہیں۔ جس کے عجائب قیامت تک ختم نہیں ہوسکیں گے علماء امت اور محققین وجوہ اعجاز پر مختلف دور میں کتابیں تالیف فرماتے رہے۔ بالاجمال یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح اس کتاب الٰہی کے معارف وحقائق کی کوئی حد ونہایت نہیں اس کی معجزانہ شان کی کیفیات اور صورتیں بھی بیشمار ہیں۔ ائمہ مفسرین نے کچھ اصول وکلیات اعجاز قرآن کے ایسے بیان فرمائے ہیں جو بہت سے وجوہ اعجاز کو حاوی اور شامل ہیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ "شفا" میں فرماتے ہیں کہ اعجاز قرآن کی صورتیں تو بہت ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔ البتہ وہ انواع جو اکثر وجوہ اعجاز کے لئے جامع ہیں چار ہیں۔

(۱) قرآن کریم کی حسن تالیف، کلمات وآیات کا باہمی ارتباط وتناسب اور اس کا وہ معیار فصاحت وبلاغت جس نے دنیا کو عاجز بنادیا۔ میدان بلاغت کے عرب کے شہسواروں نے ذلت وعاجزی کے گھٹنے ٹیک دیئے۔

(۲) نظم قرآنی کا وہ عجیب وغریب اور نرالا طرز جو عرب نظم ونثر کے ہر اسلوب اور طرز سے جدا اور ممتاز نظر آتا تھا۔ عرب کے شعراء وبلغاء اور خطباء نظم قرآنی کو انواع اور اقسام نظم ونثر سے مختلف پاکر متحیر ہوتے تھے کہ یہ طرز کلام اور انداز بیان آخر کس معیار پر ہے؟

(۳) امم سابقہ اور گذرے ہوئے زمانوں کے ان واقعات کو بیان کرنا جن کو ایک امی شخص تو درکنار بہت سے خواص اور احبار اہل کتاب بھی نہ جانتے تھے۔ ایسے گذرے ہوئے واقعات نادرہ اس اعلان کے ساتھ بیان کرنا کہ یہ واقعات ثابت اور برحق ہیں اور اللہ کی طرف سے آپ پر وحی کئے گئے۔ قرآن کا کھلا ہوا اعجاز ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے تو ان واقعات کو تحقیق وتثبیت کے رنگ میں بیان کیا جن میں خود اہل کتاب اور بنواسرائیل باہم اختلاف کرتے تھے۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ أَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ — کہ بیشک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنواسرائیل پر ان کے اکثر وہ واقعات جن میں وہ خود اختلاف کررہے ہیں۔

(۴) غیب کی خبروں اور آنے والے واقعات کے بیان پر مشتمل ہونا۔ اور پھر ہر آنے والی خبر جو قرآن میں بیان کی گئی اس کا اسی طرح ظہور پذیر ہونا۔ قرآن کریم نے جن جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی

کی طرح دنیا کی نگاہوں کے سامنے آکر رہے۔

مثلاً حق تعالےٰ نے عجم پر روم کے غلبہ کی خبر دی اس وقت جبکہ عالم اسباب میں بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ

مغلوب ہوگئے ہیں رومی قریب ہی سرزمین (یعنی ملک فارس) میں لیکن یہ لوگ (رومی) اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں ہی میں غالب آجائیں گے (ایران کے مجوسیوں پر)

فارس کے آتش پرست مجوس کو مشرکین مکہ مذہباً اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بھائی یا ان کے کم از کم قریبی دوست تصور کئے جاتے تھے تو فارس کے غلبہ کی خبر پر مشرکین مسرور ہوئے کہنے لگے کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے۔ ہم بھی اسی طرح کل تمہیں مٹا ڈالیں گے۔ اس وقت قرآن نے ظاہری سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف اعلان کیا کہ بیشک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہوگئے ہیں لیکن چند سال (نو سال) کے اندر اندر پھر وہی غالب اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ قرآن کی اس پیشین گوئی کے مطابق ٹھیک نو سال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گذرنے کے بعد) عین بدر کے روز جبکہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر فتح و نصرت حاصل کرکے خوشیاں منا رہے تھے، اسی روز یہ خبر سن کر مسلمانوں کی مسرتوں پر اور مسرتوں کا اضافہ ہوا کہ اہل کتاب رومیوں کو اللہ تعالےٰ نے ایران کے مجوسیوں پر غالب فرما دیا۔

قرآن کریم کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کرکے بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے۔

(۵) قاضی ابوبکر فرماتے ہیں، قرآن کریم کا (سب سے بڑا) اعجاز یہ ہے کہ اس کی تالیف و ترتیب اور کلمات و آیات کا تناسب کچھ ایسے اسلوب پر واقع ہوا ہے۔ عرب کے تمام معتاد اور متعارف طریقوں سے جدا اور نرالا تھا۔ عرب میں نظم و نثر کے جس قدر اسلوب تھے ان میں سے کوئی اسلوب قرآن کے طرز بیان کے مشابہ نہ ہوسکتا تھا۔ اس مرتبۂ اعجاز کے ساتھ بدیع کے تمام اقسام کچھ اس طرح جمع ہیں کہ دنیا کے کسی کلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ [۱]

خداوند عالم کی یہ سنت رہی ہے کہ جو فن اور ہنر کسی زمانہ میں اپنے عروج و کمال کو پہنچا ہوا ہوتا تو اسی نوع کا معجزہ اپنے پیغمبر کی تصدیق و تائید کے لئے عطا فرماتا تاکہ لوگ اس معجزہ کو دیکھ کر انسانی

[۱] الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۱۹/۲

ہنر وکمال، مادی وسائل وطاقتوں اور قدرت خداوندی کے درمیان بخوبی امتیاز کرسکیں۔ حضرت موسیٰ علیہم السلام کے زمانہ میں جادو کا بہت زور تھا مایۂ ناز جادوگر سرزمین مصر میں موجود تھے تو اس کی مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں چونکہ طب اپنے عروج پر تھی اس لئے حضرت عیسیٰ کو احیاء موتیٰ اور ابراء اکمہ وابرص کا معجزہ عطا کیا گیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت وبلاغت شباب پر تھی ایک سے ایک مایۂ ناز شاعر وخطیب اپنے اشعار وقصائد بیت اللہ کی دیواروں پر ھل من مبارز (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کے اعلان کے ساتھ آویزاں کرتا تھا۔ اسی لئے ایسے دور میں آپ کو خصوصی معجزہ قرآن کریم دیا گیا جس کی فصاحت کے سامنے عرب کے تمام فصحاء وبلغاء کی مجموعی طاقت بھی مقابلہ سے عاجز رہی۔

ابتداء دور میں جبکہ شعراء عرب کے قصائد خانہ کعبہ کی دیواروں پر لٹکائے جاتے تھے کسی صحابی نے سورۂ "انا اعطیناك الکوثر" لکھ کر دیوار کعبہ سے لگا دی اس کاغذ پر نیچے کچھ اور لکھنے کے لئے بہت سی جگہ چھوڑ دی۔ ہر سال دور دراز سے آنے والے شعراء اس کو آ آ کر غور سے پڑھتے اور ہر چند کوشش کرتے کہ کچھ اس کے نیچے لکھ دیں لیکن عاجز رہتے۔ آخر ایک بڑے شاعر نے جس کی فصاحت وبلاغت کا عرب میں بہت چرچا تھا صرف یہ جملہ لکھ دیا۔

مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ — کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔

پھر ایسے دلربا انداز فصاحت اور جامع و مؤثر طرز بیان سے ایسے علوم وحکم کو جمع کر دیا کہ دنیا کے علوم ومعارف اور حقائق کے خزانے ان سے خالی ہیں (جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی) پھر طرفہ یہ کہ جو ھادی اس کتاب کو لایا اس نے نہ کبھی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی نہ کسی لائبریری کا مطالعہ کیا۔ نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور نہ اس کے گردوپیش تعلیمات کا کوئی ایسا مواد موجود تھا جس کے ذریعہ مدد لی جاسکتی۔

آپ کے نبی امی ہونے کی شان خود قرآن نے ان الفاظ میں صاف صاف بیان کردی۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۔

اور نہ تو پڑھتے تھے آپ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی آپ اپنے دائیں ہاتھ سے (کوئی حرف) لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بیشک باطل پرستوں کو کچھ شک وتردد کی گنجائش ہوسکتی تھی۔

بہر کیف یہ سب کچھ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

وجوہ مذکورہ کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ اعجاز ہیں۔
(۶) مثلاً قرآن کے الفاظ و کلمات میں ایسی حلاوت اور شیرینی ہے جس کو ہر ایک محسوس کرتا ہے۔ خواہ کوئی کلام عربی کا ذوق و فہم رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ عرب و عجم جوان بوڑھے مرد عورت سب یکساں طور پر قرآن کی حلاوت محسوس کرتے ہیں۔ الفاظ قرآن کا حسن و جمال اس طرح نمایاں ہے کہ قرآن کی کوئی آیت کسی عربی کی کتاب میں بھی آجاتی ہے تو اس کی خوبی حسن و جمال نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے حتیٰ کہ فصیح سے فصیح کتاب یا مجموعہ قصائد اور دیوان ہی کیوں نہ ہو لیکن ہر خاص و عام آیت قرآنیہ اس کے درمیان اس طرح ممتاز روشن دیکھے گا جیسے آسمان کی تاریکی میں ستاروں کا نور۔
(۷) ہر قوم اور ہر ملک کا مزاج ذوق کلام میں مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ امر شاہد ہے کہ کسی کلام کی فصاحت ایک طبقہ کے نزدیک کمال ترقی کے اعلیٰ مقام پر ہے تو اس کے بالمقابل دوسرے مزاج کے نزدیک اس کلام میں وہ خوبی اور معیار پسندیدگی نہیں سمجھا جاتا مگر قرآن کی فصاحت و بلاغت ہر قوم اور ہر مزاج کو مرغوب ہے اس کی حلاوت سے عرب و عجم ایشیا، افریقہ یورپ امریکہ سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بایں ہم کہ وہ کسی کے بھی مذاق اور طرز پر نہیں۔ نہ باقاعدہ نظم ہے کہ کوئی شاعر عروض و قوافی کے حسن پرست ہو سکتا ہو اور نہ ہی وہ اسالیب نثر پر منطبق ہے کہ ہر نثر اپنے انداز طبع سے اس کو لذیذ سمجھے۔
(۸) ہر طویل کلام میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اگر آغاز سخن شوکت الفاظ سے مرصع اور حسن تعبیر کی رنگینیوں سے مزین ہے تو بسا اوقات درمیان میں کلام کی وہ رونق نہیں رہتی ابتدار کی جو شان ہے وہ اختتام اور وسط میں نہیں کہیں کوئی بات بے موقع آجاتی ہے کہیں کسی چیز کا وزن گرا ہوا ہوتا ہے کہ جس سے مضمون کی عظمت و اہمیت بہت ہی گر جاتی ہے۔ مگر قرآن کی جس سورت کو بھی دیکھئے اس کی شان ابتدار و انتہا اور درمیان میں یکساں ہی معلوم ہوگی ابتدار کلام سامع کو مضمون کی بلندی کا یقین دلاتی ہے۔ پھر وسط اس کی تصدیق کر دیتا ہے اور مقطع اس پر مہر ہو جاتا ہے۔
(۹) ہر ایک کلام سے متکلم کی شان نمودار ہوتی ہے۔ عرفاً کا کلام پڑھنے سے دل پر ایک نورانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ کسی شیریں چشمہ کا پانی ہے۔ بادشاہوں کے کلام سے انکی عظمت و جلال کی شان ٹپکتی ہے۔ شہوت پرستوں کے کلام سے آثار شہوت خود بخود محسوس ہوتے ہیں فلسفہ کی دلدل میں پھنسے ہوؤں کا کلام فلسفیانہ تحیر اور آثار تکدر کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن کلام ربانی ان سب باتوں سے منزہ اور بالا و برتر حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی شان الوہیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک اعرابی نے کسی قاری کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سُنا۔

وقیل یاارض ابلعی ماءك ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر۔
اور کہہ دیا گیا کہ اے زمین تو اپنا پانی چوس لے۔ اور اے آسمان تو تھم جا۔ اور (خدا کا یہ فرمانا ہی تھا کہ) پانی جذب ہوگیا اور کام تمام کر دیا گیا۔

آیت سنتے ہی اعرابی اسلام لے آیا۔ کہنے لگا کہ زمین و آسمان کے نام یہ شاہانہ احکام جاری کرنا صرف اسی ذات کے لئے ممکن ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ اور کسی سے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس لئے میں نے جان لیا کہ یہ کلام اسی رب العالمین کا ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا اور میں اس پر ایمان لایا۔ الفاظ قرآن سے عظمت خداوندی برستی ہے۔ اس کی تلاوت سے قلب پر توحید و خداپرستی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں دنیا سے بے رغبتی اور عالم جاودانی کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ حسنات کا شوق اور معصیت سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(۱۰) ایک مضمون یا کوئی قصہ بار بار اگر بیان کیا جائے تو سامع کو بے لطفی بلکہ طبیعت پر انقباض و گرانی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن یہ قرآن کا خاصہ اعجاز ہے کہ ایک آیت بار بار دہرائی جاتی ہے لیکن ہر اعادہ میں سامع کو اس کا ایک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ جو قصہ بھی مکرر بیان کیا جاتا ہے وہ ایسے نرالے انداز کے ساتھ بیان ہوتا ہے کہ بالکل نیا مضمون اور نیا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ انداز بیان کسی بھی فصیح و بلیغ قادر الکلام کے کلام میں نہ آج تک آسکا اور نہ قیامت تک پایا جاسکے گا۔

(۱۱) دنیا میں ہر فصیح و بلیغ اس بات سے عاجز ہے کہ ایک مضمون سے دوسرے مضمون اور ایک موضوع سے دوسرے مختلف موضوع کی طرف لطیف انداز سے منتقل ہو جائے یہ خوبی صرف قرآن ہی کی ہے کہ مختلف موضوع اور مضامین میں ایک سے دوسرے مضمون کی طرف اس عمدگی اور مناسبت کے ساتھ منتقل ہو جاتا ہے کہ کلام کی عظمت و بلندی تک عقل پرواز سے قاصر رہتی ہے۔ کہیں توحید کے مضمون سے احکام کی طرف کسی جگہ قصص سے توحید اور کہیں احکام طلاق و نکاح سے احکام صلوٰۃ و زکوٰۃ کسی مقام پر تعلیم اخلاق کے ساتھ اصول جہاد و احکام غزوات کی طرف کلام منتقل ہو رہا ہے۔

اور پھر نہ کلام کے ربط و تسلسل میں کوئی فرق ہے نہ اس کی حلاوت و لطافت میں کوئی تفاوت معلوم ہوتا ہے مختلف مضامین کو اسی شان جامعیت کے ساتھ بیان کرنا یہ قرآن ہی کا معجزہ ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی بھی متکلم خواہ کتنا ہی شیریں بیان اور قادر الکلام فصیح ہو اگر مختلف موضوعوں کو ممزوج و پیوستہ کر کے کوئی کلام پیش کرنے لگے تو چند جملوں سے زائد اس کلام کو اہل ذوق سننا بھی گوارا نہ کریں گے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم مرے نزدیک من کل الوجوہ

معجزہ ہے۔ اس کا اعجاز اس کے مفردات میں مرکبات میں۔ ترتیب کلمات میں اور اس کے مقاصد و حقائق میں جاری و ساری ہے۔ غرض قرآن از روئے لفظ او ترکیب و ترتیب اغراض و مقاصد حقائق و علوم ہر طرح معجزہ ہی ہے۔

از روئے مفردات معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مفردات میں قرآن کریم وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے کہ اس مقام پر اس معنی کو ادا کرنے اور حقیقت مقصودہ کو واضح کرنے کے لئے اس سے زائد جامع اور بلیغ اور کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا جو اس طرح مراد کو کامل طور پر ادا کرسکے مثلاً موت کے واسطے اہل عرب کے یہاں متعدد لغات استعمال کئے جاتے تھے۔ الحتف۔ الحمام۔ المنون الشعوب۔ الفود۔ السام القاضیۃ۔ المنیۃ۔ الخالج۔ الشجب وغیر ذلک۔

مگر قرآن نے ان تمام الفاظ کو چھوڑ کر لفظ توفی موت کے لئے استعمال کیا جس کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہے۔ کیونکہ حقیقت موت کی یہی ہے کہ روح حیوانی جو تمام اجزاء جسم میں سرایت کی ہوئی ہے اس کو اجزاء جسم میں سے سمیٹ کر پورا پورا نکال لینا کہ جسم کے کسی حصہ میں ادنیٰ مادہ حیات نہ رہے جیسے کہ دہکتے ہوئے انگارے کے ایک ایک جزء میں مادہ آتشی سرایت کئے ہو اور اس پر پانی ڈال کر بجھا دیا جائے۔

اس لئے حقیقت موت کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ توفی سے زائد جامع کوئی لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ نیز اس کلمہ کے استعمال نے مشرکین۔ اور اہل جاہلیت کے اس اعتقاد کا بھی رد کردیا جو یہ سمجھتے تھے کہ موت انسانی فناء محض اور عدم مطلق کے درجہ میں ہوجانے کا نام ہے۔ کہا کرتے تھے۔

أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا۔

قرآن نے اس لفظ کو بول کر یہ حقیقت آشکارا کردی کہ موت کا مفہوم فناء محض اور اعدام مطلق نہیں بلکہ موت کی حقیقت ارواح کا تعلق اجسام انسانیہ اور اجزاء بدنیہ سے جدا کردینے کے بعد کسی دوسرے مستقر میں منتقل کردینا ہے اس لئے کہ ہر انسان کی روح اللہ کے یہاں موجود ہے وہ جب چاہے گا پھر ان ارواح کو اپنے اجسام کے ساتھ جمع کردے گا اور اٹھادے گا۔ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ۔

چنانچہ فرمایا۔ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ۔

تو اس لفظ توفی نے جہاں حقیقت موت کی وضاحت و تعیین کی اس کے ساتھ مسئلہ بعث بعد الموت کو بھی اس طرح واضح کردیا کہ یہ سمجھ لینے کے بعد اس پر کوئی اشکال ہی نہ رہا۔

مشکلات القرآن ص ۲۵

(ف) لفظ توفی کے استعمال میں اور بھی بہت سے لطائف و معارف ہیں تفصیل کے لئے مقدمہ مشکلات القرآن کی مراجعت فرمائی جائے

قرآن مجید کے اعجاز مفردات میں یہ چیز بھی ہے کہ قرآن بعض مقام پر ایک ایسا لفظ اختیار کرتا ہے کہ اگر یہی لفظ نظم قرآنی کے علاوہ کسی دوسری جگہ دیکھا جائے تو وہ اپنے مترادفات کے درمیان کچھ زائد فصیح اور اہل ذوق کے نزدیک لذیذ و شیریں محسوس نہ ہوتا ہوگا مثلاً لفظ ضِیْزیٰ جس کے ہم معنے الفاظ جائرۃ ظالمہ وغیرہ ہیں اور یہ الفاظ بہ نسبت ضیزیٰ زیادہ مستحسن اور بلغاء کے نزدیک معیار فصاحت پر پورے ہیں۔ برخلاف ضیزیٰ کے کہ اس میں "ثقل علی اللسان" اور قدرے "کراہۃ فی السمع" کی آمیزش ہے مگر یہ قرآن کی معجزانہ شان ہے کہ جب اس نے اس لفظ کو سورۂ والنجم کی آیۃ "تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى" میں استعمال کیا تو ایسا متناسب اور لطیف اور کانوں کو اس قدر لذیذ معلوم ہونے لگا کہ کوئی بھی کلمہ اس کے ہم معنی الفاظ میں سے اس مقام پر ہرگز اس قدر لطیف و مناسب نہ رہتا اور اس لفظ نے آیت میں جو حسن پیدا کر دیا یقیناً کوئی دوسرا لفظ اس حسن کے پیدا کرنے سے قاصر تھا کیونکہ سورۂ والنجم کی آیات شروع سے بار مقصورہ پر ختم ہو رہی ہیں اور اس کے آخری الفاظ سب اسی قافیہ پر ہیں۔ والنجم اذا ھوٰی ما ضل صاحبکم وما غوٰی وما ینطق عن الھوٰی تو ان آیات کے درمیان تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى میں جو حسن و خوبی لفظ ضیزیٰ نے پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے ناممکن تھی[۵]۔ حاصل یہ کہ یہی ایک کلمہ مثلاً دوسرے کلام میں استعمال کیا جائے تو فصحاء اور بلغاء عرب ثقل علی اللسان اور کراہت فی السمع جیسے امور سے معیار فصاحت پر جرح کرنے لگیں گے۔ لیکن اسی کلمہ کو قرآن نے جب استعمال کیا تو غایت درجہ لطیف اور مستحسن معلوم ہونے لگا۔ پھر ایک خوبی اس میں یہ بھی ہے کہ یہ مضمون چونکہ کفار مکہ کی اس غلط تقسیم کے متعلق ہے جو انھوں نے اختیار کی تھی کہ اپنے واسطے تو بیٹے تجویز کرتے اور اللہ کے لئے بیٹیاں جیسے کہ فرمایا گیا "الکم الذکر ولہ الانثیٰ" تو ان احمقوں کی اس غلط اور ظالمانہ تقسیم کو تلك اذا قسمۃ ضیزیٰ سے بیان فرمایا گیا کہ یہ تقسیم تو بہت ہی ظالمانہ تقسیم ہے تو ان کی اس تقسیم کی قباحت کے بیان کرنے کے لئے یہی لفظ زیادہ موزوں اور مناسب تھا تاکہ اس لفظ کے ثقل یا استکراہ فی السمع کے رنگ سے ان کی اس تقسیم کی کراہت اور قباحت بھی نمایاں کر دی جائے۔ کیونکہ فصحاء و بلغاء کا یہ طرز ہے کہ جب ان کو کوئی ہولناک اور قابل نفرت امر بیان کرنا ہوتا ہے تو وہاں کچھ ایسے ہی کلمات اور تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ سنتے ہی سامع پر تنفر اور ہیبت کے آثار واقع ہو جائیں۔

---

[۵] مقدمہ مشکلات القرآن للشیخ انور رحمۃ اللہ علیہ

بظاہر یہی وجہ فرق ہے کہ قرآن نے جس کسی جگہ زوجین کے باہمی قرب و اختلاط کو بیان کیا اس کے لئے لطیف کنایات اور استعاروں کو اختیار کیا۔ کہیں فرمایا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کہ وہ تمھارے واسطے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو

کسی جگہ فرمایا۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ کہ تمھاری عورتیں تمھارے واسطے کھیتیاں ہیں الخ

کسی موقعہ پر اس مضمون کو " فَلَمَّا تَغَشَّاهَا " (کہ جب اس نے ڈھانک لیا اس کو) اور کسی جگہ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (کہ حال یہ کہ پہنچ چکا ہے تم میں سے ایک دوسرے کی طرف یعنی بے حجابانہ مل چکا ہے) سے تعبیر کیا گیا اور کہیں اسی ضرورت اور تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے عنوان " وابتغوا ما کتب الله لکم" (کہ تلاش کرو اس (اولاد) کو جو اللہ نے تمھارے لئے مقدر فرما دی ہے) اختیار کیا گیا۔ کسی موقعہ پر ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد۔ غرض اس سے زائد اور کوئی واضح اور صریح تعبیر اس مضمون کے لئے قرآن نے نہیں اختیار کی۔ الا یہ کہ کسی مسئلہ شرعی کے خصوصی شرائط کی توضیح کے لئے لفظ دخول وغیرہ ذکر کر دیا جائے جیسے مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ۔ باقی کسی اور جگہ یہ لفظ بھی نہیں لایا گیا۔ اس کے برخلاف جہاں حق تعالےٰ شانہٗ کو مثلاً "حد زنا" کا ذکر فرمانا تھا وہاں کسی نوع کے استعارہ وکنایہ اور تلمیح کے بجائے ایسے بدکار اور گندہ افراد کے لئے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي جیسا صاف لفظ اور عنوان اختیار فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (بے شک) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو مارا کرو ہر ایک کو ان میں سو سو کوڑے۔

تاکہ اس عنوان کو سنتے ہی اول وہلہ ہی میں حساس طبیعتیں ہیبت زدہ ہو جائیں۔ اور زنا جیسے قابل نفرت لفظ کو سنکر اس ناپاک فعل سے استنکاف ونفرت کے تمام جذبات ودواعی قلب ودماغ میں جمع کرتے ہوئے یہ فرمان خداوندی سنیں۔ چنانچہ الفاظ آیت ہی سے بہت کچھ آثار جلال وقہر خداوندی کے برس رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس مقام پر بس یہی تعبیر سب سے زائد ابلغ تھی اور یہ مقام وہ مقام نہ تھا کہ اس کے لئے کوئی لطیف تعبیر اور پاکیزہ استعارہ اختیار کیا جاتا۔

اعجاز مفردات میں یہ امر بھی ہے کہ کلمات عرب میں بعض کلمات کا استعمال مفرد ہونے کی حالت میں تو فصیح اور اہل لسان کے نزدیک مستحسن ہے اور اگر وہ لفظ جمع استعمال کیا جائے تو فصحاء اور ارباب ذوق اس کو ثقیل شمار کرتے ہیں اور کبھی اس کا عکس ہوتا ہے کہ وہ لفظ جمع تو فصیح ہے اور اس کا مفرد مستعمل ہونا موجب ثقل ہے اور فصحاء اس سے اعراض کرتے ہیں مثلاً لفظ ارض کا استعمال مفرداً فصیح ہے اور جمع اس کی ارضین

ثقیل اور غیر مستحسن ہے۔ اس لئے قرآن نے لفظ ارض ہر جگہ مفرد ہی استعمال کیا کسی موقعہ پر اس کی جمع ارضین نہیں استعمال کی گئی حتی کہ کسی مقام پر سبع سموات کے ذکر کے ساتھ طبقات ارض بھی اتنے ہی بیان کرنے مقصود ہوئے تو جمع کے لفظ سے اعراض کرتے ہوئے قرآن نے اس طرح تعبیر اختیار فرمائی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔ اللہ نے پیدا کئے سات آسمان اور زمین سے بھی اللہ نے اسی قدر طبقے بنائے۔

اگر اس کے بجائے سبع ارضین کہا جاتا تو وہ معیار فصاحت اور خوبی کا نہ رہتا جو لفظ الارض میں ہے۔ اگرچہ لفظ ارضین جمع کسی کلام میں مستعمل ہونا خلاف فصاحت نہیں ہے۔ لیکن قرآن کے اعجاز مفردات کا مفہوم تو یہی ہے کہ جس جگہ قرآن نے جو لفظ استعمال کر لیا اس مقام پر وہی لفظ سب سے اعلیٰ اور سب سے زائد لطیف ہے۔

لفظ لُبّ (بمعنی عقل) مفرداً قدرے ثقیل سمجھا گیا برخلاف اس کی جمع "الباب" کے کہ وہ اہل لسان کے نزدیک نہایت لطیف و مستحسن اور زبان پر خفیف سمجھا جاتا ہے تو قرآن نے کسی جگہ اس لفظ کو مفرد نہیں استعمال کیا بلکہ جہاں کہیں بھی یہ لفظ ہے جمع کے صیغہ کے ساتھ مثلاً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اسی طرح لفظ رجاء بمعنی کنارہ صیغہ جمع ارجاء کے ساتھ مستحسن ہے اسی لئے ہم قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ صیغۂ جمع کے ساتھ دیکھتے ہیں وَالْمَلَكُ عَلٰۤی اَرْجَآئِهَا کہیں رجاء مفرد نہیں آیا۔

جس جگہ کوئی کلمہ بذاتہ ثقیل ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ اس معنی کے لئے موضوع نہیں ہوتا جو مستحسن سمجھا جاتا ہو تو قرآن سرے سے اس لفظ ہی کو نظر انداز کرتے ہو اس حقیقت کے اظہار کے لئے کوئی مستقل تعبیر اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے اینٹ کے لئے لفظ اٰجُر اور قرمد اور اہل مصر کے نزدیک طوب یہ لفظ ثقیل ہیں اور فصحاء ایسے ثقل اور اس قسم کے مبتذل الفاظ سے اعراض کرتے ہیں اور اس سے زائد مستحسن کوئی اور کلمہ بھی اس معنی کے لئے موضوع نہیں تھا تو قرآن نے ان سب الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسی تعبیر اختیار کی جس سے حقیقت مقصودہ واضح ہو جائے اور ایسا کوئی ثقیل یا مبتذل لفظ بھی استعمال نہ ہوا۔ فرعون کے واقعہ میں مذکور ہے

وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ۔ اور فرعون نے کہا اے جماعت نہیں جانتا ہوں میں تمھارے واسطے کوئی معبود بجز اپنے تو اے ہامان تو دہکا دے مرے واسطے آگ گارے مٹی پر

وقود علی الطین (گارے پر آگ دہکا دینا) کا عنوان اختیار فرمایا جس سے اظہار حقیقت کے ساتھ اس صنعت کی طرف بھی رہبری ہو گئی۔ (مقدمہ مشکلات القرآن)

اعجاز قرآن باعتبار ترکیب و ترتیب کلمات یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی ترکیب اختیار کرتا ہے کہ اس

مقام پر اس مقصد کے ادا کرنے کے لئے اگرچہ اور بھی تعبیرات ممکن تھیں لیکن قرآن نے جو تعبیر اختیار کی وہی سب سے زیادہ بلیغ اور مراد کو ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ جامع ہوتی ہے اور اگر اس میں ذرہ برابر بھی تغیر یا تقدم و تاخر کر دیا جائے تو وہ حسن و خوبی اور درجۂ بلاغت نہیں رہتا۔ اور نہ ہی اس تغیر کردہ تعبیر میں پوری پوری مراد اس خوبی کے ساتھ ادا ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم میں جن کو الوہیت و معبودیت خداوندی میں شریک کرنے والوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ (یعنی اور تجویز کئے ان مشرکوں نے اللہ کے لئے شریک جنوں کو) بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تعبیر اس طرح ہوتی وَجَعَلُوا الْجِنَّ شُرَكَاءَ لِلّٰهِ کہ بنایا انھوں نے جنّات کو اللہ کا شریک لیکن قرآن کی غرض صرف اسی امر کو بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ غرض اولاً غیر اللہ کو اللہ کی الوہیت میں شریک بنانے اور ارتکاب شرک کی قباحت کو بیان کرنا اور ثانیاً اس حماقت کو کہ شریک بھی بنایا تو جنوں کو بنایا۔ تو گویا اس عنوان نے ان کی ہر دو حماقتوں کو نمایاں کیا اول بیہودگی اور حماقت شرک مع اللہ اور پھر حماقت بالائے حماقت یہ کہ خدا کا شریک بنایا بھی جنّات کو تو یہ مقصد صرف یہی تعبیر ادا کر سکتی تھی اس کی جگہ ہر ممکن تعبیر متعدد تعبیرات میں سے اس معنی کو ادا کرنے سے قاصر تھی۔ اسی لئے جعلوا للہ شرکاء میں شرکاء کو جعلوا کا مفعول بنا کر پھر اس سے لفظ "الجنّ" بدل قرار دیا۔ اس لئے اب ترجمہ ان کلمات کا اس طرح کرنا کہ "بنایا انھوں نے جن کو اللہ کا شریک" تقریباً غلط ہوگا کیونکہ یہ ترجمہ غرض قرآنی کو ادا نہیں کر سکے گا۔ البتہ یہ ترجمہ کیا جائے اور بنائے انھوں نے اللہ (رب العزت) کے لئے شریک (کہ جو ایک عظیم الشان جرم ہے اور وہ شریک بھی اچھی مخلوقات میں سے نہیں کہ فرشتہ کو خالق کا شریک بنائیں یا کسی انسان کو بلکہ خالق کے ساتھ شریک بھی بنایا تو اس کی مخلوق میں سے ارذل ترین اور شر مخلوق) یعنی جن کو۔[1]

امام العربیہ علامہ زمخشری نے اپنی اس عبارت سے اس نکتہ پر متنبہ کیا۔

قلت فما فائدة التقديم قلت فائدته استعظام ان يتخذ لله شريك من كان ملكا او جنيا او انسيا۔ اسی کی نظیر قرآن کریم کی اختیار کردہ تعبیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے جبکہ فرعون کی فوج کو تعاقب میں دیکھ کر ان کی قوم نے کہا۔

اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (کہ بیشک ہم تو پکڑ لئے گئے) اس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ذکر کیا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔

كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ — خبردار (ایسا ہرگز نہیں) یقیناً میرے ساتھ تو میرا رب ہے

اسی مضمون کے قریب وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں حضرت ابوبکرؓ کو تسلی

[1] مقدمہ مشکلات القرآن ۱۲

دیتے ہوئے فرمائے جبکہ ابوبکر کو پریشانی تھی کہ کفار مکہ تعاقب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کو دیکھ پائیں اور پکڑ لیں۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا — غمگین نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ دونوں مقولے بظاہر قریب قریب ایک ہی مضمون "یعنی حق تعالیٰ کی معیت اور اس کی نصرت اور امداد کا شامل حال ہونا" ادا کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جو تعبیر جس جگہ اختیار کی ہے وہی اس مقام کی غرض صحیح طور پر ادا کر سکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کَلَّا حرف تنبیہ اور معی ضمیر واحد متکلم ہے کیونکہ ان کے مخاطب وہ لوگ تھے جن پر مایوسی غالب تھی اور رحمت خداوندی کے شامل حال ہونے کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ تھا اس لئے ان کے جواب کے لئے تنبیہ کا عنوان اختیار کرتے ہوئے ضمیر واحد متکلم ہی استعمال کرنا چاہئے تھی۔ کہ خبردار میرا رب تو میرے ساتھ ہے۔ برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے کہ آپ کے مخاطب حضرت ابوبکر صدیق تھے جو پیکر صداقت اور اپنے قلب میں ایمان محکم اور رحمت خداوندی کا یقین کامل لئے ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ تکلیف کا تصور ان کے لئے ایک غم کا پہاڑ تھا تو ان کے لئے یہی عنوان موزوں تھا جو اختیار کیا گیا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تسلی کے کلمات اور معنا ضمیر جمع متکلم کے ساتھ کیونکہ یہاں مخاطب اور متکلم دونوں رحمت خداوندی کے ساتھ ہونے پر یقین رکھتے ہیں اس لئے یہاں کے مناسب جمع متکلم ہی کا عنوان ہو سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقصد صرف یہی عنوان ادا کر سکتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اختیار کئے گئے اگر ان دونوں مقام کی تعبیروں میں کچھ بھی تغیر کر دیا جائے تو یقیناً عبارت مقصد ادا کرنے سے قاصر رہے گی۔ تو یہ اعجازی شان قرآن کی اختیار کردہ ترکیب اور ترتیب میں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں امراۃ عزیز (زلیخا) کا یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا۔ جس عنوان سے قرآن نے اس کو ادا کیا ہے اس مقصد کو اس کے علاوہ کوئی دوسری تعبیر ہرگز نہ ادا کر سکتی تھی۔ مثلاً فرمایا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ۔ — اور پھسلایا یوسف کو ان کے نفس سے اس عورت نے کہ جس کے گھر میں وہ تھے اور دروازے بند کر دیئے اور کہا کہ جلدی کر۔

اپنی جانب مائل کرنے اور پھسلانے والی اس عورت کے لئے اور بہت سی تعبیریں ممکن تھیں اس کا نام یا امراۃ العزیز یا سیدۃ البیت وغیرہ اور لفظ امراۃ العزیز خود قرآن نے آگے چل کر بولا بھی ہے "وَقَالَتِ امْرَاَةُ الْعَزِیْزِ الْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ"۔ لیکن یہاں نام و لقب اور کوئی دوسرا مختصر عنوان چھوڑ کر یہ عنوان اَلَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا اختیار کیا جس کے ذریعہ ایک ایسا مقصد ادا ہو رہا ہے کہ دوسرے کسی عنوان سے اس کا ادا ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ یہ کہ مخاطب اس عنوان کے ذریعہ یہ جان لے کہ

مائل کرنے والی محض کوئی عورت نہ تھی کہ وہ صرف جنسی میلان اور طبعی دواعی اور تقاضوں ہی سے مائل کرتی ہو بلکہ پھسلانے والی تو وہ تھی کہ جس کے گھر میں حضرت یوسف موجود تھے خود اسی کی طرف سے رغبت کا اظہار پھر اس کے یہاں کے انعامات اور ظاہری عطاؤں سے حضرت یوسف ممنون بھی تھے اسی کے گھر میں بھی اور تنہائی وخلوت بھی۔ ان سب امور کے بعد نکلنے کے لئے راستوں کی بندش بھی اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر لبیک نہ کہنے پر تنبیہی عنوان کے ساتھ یہ بھی کہ آخر آمادگی کیوں نہیں ...... مگر اللہ اکبر کیا عفت و پاکدامنی تھی کہ ان سب احوال کے جمع ہونے کے باوجود خدا کے پیغمبر کا جواب یہ ہوتا ہے مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (خدا کی پناہ (ہر معصیت سے) وہ عزیز مرا محسن ہے مجھے اچھا ٹھکانا دیا (میں اس کی امانت میں کیسے خیانت کروں ایسا کروں گا تو ظالم بنوں گا اور) حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے

تو حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و پاکدامنی مقصد بیان ہے وہ اس شان کے ساتھ صرف وراودته التی هو فی بیتها کے عنوان سے بیان کی جاسکتی تھی جس کے لئے قرآن نے یہ تعبیر اختیار کی۔ اہل فکر سوچ لیں اور خوب سوچ لیں کہ کیا ان حقائق اور لطیف معانی کو اس تعبیر کے سوا کوئی دوسری تعبیر ادا کرسکتی تھی نہیں ہرگز نہیں حاشا وکلا ثم حاشا وکلا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ومن تامل لطائف هذا النظم وبدائع ترتیبها علم ان القرآن کما انه معجز بحسب فصاحة الفاظه وشرف معانیه فهو ایضا معجز بحسب ترتیبه ونظم آیاته۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۶۴)

اور جو شخص نظم قرآنی کے لطائف اور آیات قرآنیہ کی ترتیب اور اس کے حقائق پر غور کرے گا تو وہ یہ جان لے گا کہ قرآن جس طرح اپنے الفاظ کی فصاحت اور شرف معانی کے لحاظ سے معجزانہ شان رکھتا ہے وہ اسی طرح ترتیب کلمات اور ربط آیات کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔

قرآن کریم اسی طرح مقاصد کے اعتبار سے بھی درجۂ اعجاز رکھتا ہے۔

مقاصد قرآن مبدء و معاد کی تحقیق انسان کے معاد و معاش کی بہترائی۔ دنیا و آخرت کے فلاح و نجاح کے اصول۔ اصلاح عقائد اعمال و اخلاق اور معاملات کے طریقے۔ صانع عالم اور خالق کائنات کی معرفت اس کی ربوبیت و توحید کی تعلیم۔ دلائل نبوت کا بیان اور یہ کہ خالق حقیقی کی اطاعت انسانی فطرت کا صحیح تقاضہ اور اسی فطرت سلیم پر انسان کی تخلیق ہے۔ عبادت و بندگی کی ترغیب اور نافرمانی پر وعید۔ دنیا کی بے ثباتی جزاء، سزا کا معیار غرض ان مقاصد کو قرآن نے ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ ادا کیا ہے کہ دنیا کا کوئی بلیغ سے بلیغ

کلام ایسے پاکیزہ مؤثر اور محیر العقول تعبیرات کے ساتھ ادا کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ قرآن نے ان مقاصد کو کہیں ایجاز و اختصار اور کہیں تفصیل و توضیح اور کسی جگہ تمثیل و تشبیہ اور کنایات اور کسی مقام پر دلائل و براہین کے انداز میں کچھ اس طرح سے بیان کر دیا ہے کہ عقل و انصاف سے نظر کرنے والے مخاطبین کے لئے ایک ایک آیت ہی قلب و دماغ کو ان مقاصد کے رنگ میں رنگ دینے کے واسطے بہت کافی ہے۔

مثلاً ایک مقام پر ارشاد فرمایا۔ حضرت یوسف کے واقعہ کو نقل کرتے ہوئے جبکہ وہ اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کو سمجھا رہے ہیں۔

یاصاحبی السجن أأرباب متفرقون خیرام الله الواحد القهار ما تعبدون من دونه الا اسماء سمیتموها انتم وآباؤکم ما انزل الله بها من سلطان ان الحکم الا لله امر ان لا تعبدوا الا ایاه ذلك الدین القیم

کہ اے مرے دونوں قید کے ساتھیو بتاؤ کہ متفرق اور بہت سے معبود بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار؟ نہیں عبادت کرتے ہو تم اس معبود حقیقی کو چھوڑ کر کسی کی بجز چند ناموں کے کہ جن کو تم نے اور تمہارے آباء نے تجویز کر لیا ہے کہ جس کے واسطے نہیں نازل کیا اللہ نے کسی برہان و دلیل کو۔ شانِ حاکمی صرف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے حکم کیا کہ نہ عبادت کرو تم بجز اس کے اور کسی کی (یہی توحید خداوندی) دین قیم ہے۔

تو ان کلمات میں توحید و ربوبیت کے اثبات کے ساتھ ابطال شرک کیا گیا اور یہ ظاہر فرما دیا گیا کہ فرضی معبودوں کی پرستش مقتضائے عقل اور فطرت کے خلاف ہے ربوبیت و معبودیت کے ساتھ شانِ حاکمیت بھی صرف خدا کے لئے ہے اور صحیح راستہ فلاح و کامیابی کا اسی دین کی اطاعت و پیروی ہے۔ ایک مقام پر یہ فرمایا گیا۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (یونس پ ۱۱)

دنیا کی زندگانی کی مثال صرف ایسی ہی ہے جیسے کہ پانی جس کو اتارا ہم نے آسمان سے پھر مل گیا اس کے ساتھ زمین کا سبزہ جس سے کہ کھاتے ہیں انسان اور چوپائے (بھی) یہاں تک کہ جب اختیار کر لی زمین نے اپنی رونق اور خوب مزین ہو گئی اور خیال کرنے لگے زمین کے مالک کہ اب ہم اس پر قدرت حاصل کر چکے ہیں ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات میں یا دن میں پھر کر ڈالا اس کو کٹا ہوا ڈھیر اس طرح کہ (گویا) کل یہاں نہ تھی کوئی آبادی (شادابی) اسی طرح ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔

دوسرے ایک مقام پر ان اہم ترین اور متعدد مقاصد کو اس طرح ادا فرمایا گیا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ
ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا
وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ
اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ (الحدید ۲۰)

جان لو کہ دنیا کی زندگانی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کھیل اور تماشہ اور بناؤ سنگار اور ایک دوسرے پر آپس میں بڑائیاں کرنا اور مال و اولاد میں کثرت کی طلب (یہ سب کچھ ایک) بارش کی طرح ہے (جس کے ذریعہ) بھلا معلوم ہوا کسانوں کو اس کا سبزہ۔ پھر وہ لہلہانے لگا پھر تو دیکھے گا اس کو اس حالت میں کہ وہ زرد ہے پھر وہ ہو جاتا ہے پارہ پارہ۔ اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی۔ اور نہیں ہے دنیوی زندگی (کچھ بھی) سوائے دھوکے کے سامان کے۔

اس آیت میں انسانی حیات کے تمام احوال اور مختلف اَدْوَار کو بیان کرنے کے ساتھ دنیا کی زندگانی اور اس کی حقیقت ایک نہایت ہی لطیف اور عجیب انداز کے ساتھ بیان فرمادی گئی۔ کہ انسان کی زندگی کا پہلا دور کھیل تماشہ ہے۔ پھر بچپن کی منزل سے ذرا آگے بڑھا اور جوانی کی شاہراہوں پر قدم رکھنا ہی تھا کہ بناؤ سنگار (یعنی فیشن) کا دلدادہ بن گیا پھر عزت وجاہ اور نام و نمود کی فکر میں پڑ گیا کچھ آگے اور بڑھا تو اولاد اور مال و دولت کی کثرت کے لیے حیران و پریشان اور کوشاں ہوا کہ زندگی آرام سے بسر ہو۔ اور جمع شدہ سرمایہ بعد میں اولاد کے کام آئے۔ مگر یہ سب شان وشوکت سامانِ فانی ہے جس کی حقیقت صرف اس کھیتی کی سی ہے جو چند روزہ بہار دکھا کر زرد پڑ جاتی ہے پھر اسی گذشتہ چند دنوں کی اس شاداب کھیتی کا یہ حشر ہوتا ہے کہ پارہ پارہ ہو کر انسان اور جانور اس کو اپنے قدموں میں روند رہے ہیں غرض یہی حال کل دنیا کا ہے کہ فی الحقیقت وہ دغا کی پونجی اور دھوکہ کی ٹٹی ہے آدمی کو اس کی عارضی بہار سے دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیے۔ انسان کو کام وہ کرنا چاہیے جو آخرت کے بعد اس کے کام آئے وہ ایمان و عمل صالح ہے۔ یہی چیز اس کے مولیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے اور اپنے مولیٰ کی نافرمانی سخت ترین عذاب اور اس کے قہر کا سبب ہے۔ انسان کو کسی مرحلہ پر بھی عارضی اور ناپائیدار رونق کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ اپنی عاقبت ہی برباد کر بیٹھے۔

اعجاز قرآن باعتبار حقائق یہ ہے کہ وہ امور غامضہ اور بلند و بالا حقائق جن تک انسانی عقول اور افکار کی پرواز ممکن نہیں اور وہ مسائل جو وجوہ مختلفہ کی کشاکشی سے اہل عقل کے نزدیک محل نزاع رہے جیسے مسئلہ خلق افعال عباد کہ بندے کا اپنے افعال سے کیا اور کیسا ربط ہے اور اس فعل کا قدرت ازلیہ سے تعلق کس

نوع کا ہے تو قرآن کریم نے ان مشکل اور الجھے ہوئے مسائل کو اس طرح واضح کیا کہ ادنی تردد کا بھی مقام نہ رہا۔ اور ایسے مواقع پر قرآن نے وہ تعبیر اختیار کی کہ توضیح حقیقت کے لئے اس سے بہتر اور کامل تعبیر پیش کرنا طاقت بشریہ سے خارج ہے (مشکلات القرآن)

بہر حال اعجاز قرآنی کی تفہیم کے لئے یہ چند امور صرف بطور مثال ذکر کر دئے گئے۔ مفسرین نے وجوہ اعجاز پر جو کچھ کلام فرمایا ہے اگر ہم اس کا اقتباس ہی لینے کا ارادہ کریں تو یہ چند اوراق اور پیش نظر مقالہ کی محدود وسعت یقیناً اس کو اپنے میں نہیں سما سکے گی۔ اگر اعجاز قرآنی کے انواع و اقسام ہی بیان کئے جائیں تو اس کے لئے بھی ایک مستقل تصنیف چاہئے۔

علامہ ابن ابی الاصبع نے صرف فن بدیع سے متعلق لطائف اور محسنات کو جمع فرمایا تو تقریباً سو قسم کے بدائع ذکر کئے جو کلام الہٰی میں موجود ہیں جس کے لئے ان کی کتاب اعجاز القرآن دنیا کے سامنے موجود ہے۔

اس مرحلہ پر اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ تو وہ امور ہیں جن کا ادراک اہل علم کی نظر و فکر نے کر لیا ہے۔ باقی ان کے علاوہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اور کس قدر معارف و لطائف اور وجوہ اعجاز ہوں گے کہ جن کا تصور بھی نہ ہو سکا ہوگا۔ کلمات رب کی شان تو یہ ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔

کہ کہدیجئے اگر سمندر روشنائی ہو جائے مرے رب کے کلمات کے لئے تو سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ مرے رب کے کلمات ختم ہو جائیں۔ اگرچہ ہم لے آئیں ایک اور سمندر اسی جیسا اس کے اضافہ کے لئے۔

تو جو شان کلمات خداوندی کی اس آیت سے مستفاد ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کم کسی طرح اس کلام الہٰی کے معارف اور خوبیوں کی شان نہیں ہو سکتی۔

اس لئے جو کچھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی حمد و ثنا میں فرمایا۔

اللّٰهُمَّ لا احصی ثناءً علیك انت کما اثنیت علی نفسك[1]۔ بس یہی کچھ ہم کلام رب کی خوبیوں میں کہہ سکتے ہیں۔

---

[1] اے اللہ میں احاطہ نہیں کر سکتا تجھ پر حمد و ثنا کا (بس) اے پروردگار تو ایسا ہی مستحق ہے (ثنا کا) جیسا کہ خود تو نے اپنی ذات کے لئے اختیار فرمائی۔

کُتبِ سماویہ یا بائیبل

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ (آل عمران)

حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہ تورات و انجیل اور زبور کا تذکرہ کیا اور صحف ابراہیم و موسیٰ کا بھی تبعاً ذکر فرمایا گیا اور ان کی مدح و توصیف کے ساتھ قرآن کو ان کتب مقدسہ کا مصدق (و موید) بتایا چنانچہ ارشاد ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔

تورات کو کتاب منیر امام فرقان اور رحمۃ کے عنوان سے یاد کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ کتاب کا نام انجیل مقرر فرمایا۔ اور حضرت داؤد کو جو کتاب دی اس کو زبور کے لقب سے یاد کیا جیسے کہ حضرت عیسیٰ کے بارہ میں ارشاد ہے وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ہم نے ان کو انجیل دی اور حضرت داؤد کے متعلق فرمایا وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا اور داؤد (علیہ السلام) کو ہم نے زبور دی۔

یہ تو وہ عظیم المرتبت کتابیں تھیں جن کو ان انبیاء پر اتارا گیا جن کے لئے مستقل شریعت اور احکام دیئے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور متعدد کتابیں دوسرے پیغمبروں کو دی گئیں جن کی تعداد اور تفصیل حق تعالےٰ نے نہیں بیان فرمائی جیسے کہ بہت سے رسولوں کا ذکر فرمایا اور بہت سوں کا صرف اجمالاً تذکرہ کر دیا اور نام نہیں بتایا۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ — کہ اور کچھ رسول تو وہ ہیں جن کا ہم نے آپ پر بیان کر دیا ہے اور کچھ وہ ہیں جنکو ہم نے آپ پر نہیں بیان کیا

وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جس طرح تمام انبیاء سابقین کے کمالات کا مجموعہ ہے اسی طرح آپ کی کتاب (قرآن) بھی تمام کتب سماویہ کی تعلیمات اور حقائق و معارف کا مجموعہ ہے اور تمام علوم سماویہ قرآن کریم میں علاوہ قرآن مجید کے بے شمار عظیم خصوصیات کے لب اور مغز کی طرح جمع کر دیئے گئے، اسی وجہ سے قرآن تمام کتب سماویہ کا موید و مصدق ہے[1]۔ اور اسی وجہ سے ہر اہل کتاب کو جس طرح پیغمبر خاتم الزمان

---

[1] قال اللہ تعالیٰ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسمٰعیل و اسحٰق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب ویونس وھارون وسلیمان وآتینا داؤد زبورا۔

پر ایمان لانا لازم ہے کہ بغیر آنحضرت پر ایمان لائے وہ ہر گز مستحق نجات نہیں۔ حتیٰ کہ آنحضرت کا ارشاد ہے۔
لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ۔ اگر اس وقت خود حضرت موسیٰ حیات زندہ ہوتے تو ان کو بھی کوئی چارۂ کار نہ ہوتا بجز میری پیروی کرنے کے۔

تو اسی طرح ہر اہل کتاب کے لئے۔ یہودی ہو یا نصرانی قرآن کریم کے بعد اپنی کسی کتاب پر عمل کرنے یا اس کی اتباع میں ہدایت تصور کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس کے لئے نجات و کامیابی صرف اسی چیز میں مضمر و منحصر ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لائے۔ بلکہ ہر اس شخص کے لئے جو تورات و انجیل کی اپنے قلب میں ادنےٰ عظمت اور حرمت کا جذبہ رکھتا ہو اس کا ذریعہ نجات بھی صرف قرآن ہی پر ایمان لانا ہے گویا قرآن پر ایمان نہ لانا تورات و انجیل کا ٹھکرا دینا ہے۔ اس لئے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ اپنے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان بائیبل پر ہے ان کا دعویٰ غلط ہے۔ قرآن جیسی جامع ہدایت کے ہوتے ہوئے کسی کو.... کیا حق ہے کہ وہ کسی دوسری کتاب کی طرف نظر کرے۔ بالخصوص جبکہ ان کتابوں کی حفاظت کا ثبوت تو درکنار۔ صدہا دلائل سے ان میں تحریفات ثابت ہیں۔ اصل تورات و انجیل کو جس جس طرح مسخ اور ردوبدل کیا گیا اس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں کہ ان میں جو کچھ ہے اس کو آسمانی ہدایت اور خدا کے پیغمبروں کے علوم کہا جا سکے۔

جس مجموعہ کا نام تورات ہے وہ تمام تر بجز چند مضامین کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تصنیف کی گئی۔ یقیناً یہ وہ کتاب الٰہی تورات نہیں ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اسی طرح وہ کتابیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تصنیف ہوئیں اور ان میں حضرت عیسیٰ کے حالات و اقوال کو صحیح و غلط طور پر جمع کر دیا گیا جس کو اب عیسائی انجیل متی و مرقس و لوقا و یوحنا کہتے ہیں وہ بھی وہ انجیل نہیں جس کا قرآن میں ذکر ہے[۱]۔

بارہا قرآن نے اہل کتاب کی تحریف و تبدیل کا ذکر کیا۔ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

ایسی صورت میں عقلاً بھی اس بات کا کوئی جواز نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایسی محرف اور غیر معتبر کتابوں پر

---

[۱] اہل کتاب کتب سماویہ کے مجموعہ کو بائیبل کہتے ہیں جس کے دو حصے ہیں ایک عہد عتیق یعنی پرانی کتابیں۔ دوسرا عہد جدید پہلے حصے میں متعدد کتابیں جن کے لئے عنوان لفظ "سِفر" ہوتا ہے جیسے سفر خلیقہ جس کو کتاب پیدائش بھی کہتے ہیں۔ سفر خروج۔ سفر عدد۔ سفر احبار۔ سفر استثنا۔ ان پانچوں کا مجموعہ تورات ہے عہد جدید میں انجیل متی۔ انجیل مرقس۔ انجیل لوقا اور انجیل یوحنا میں تفصیل کے لئے "البیان فی علوم القرآن" مقدمہ تفسیر حقانی ملاحظہ فرمایا جائے حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے تورات و انجیل میں اہل کتاب کی تحریفات کو نہایت بسط و شرح سے بیان فرمایا ہے از ص۵۳۳ تا ص۶۳

ایمان لایا جائے چہ جائیکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ ظلم و ستم بھی ہو کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کی طرف دعوت دیں جن کے پاس خدا کی وہ کتاب موجود ہے جو لوح محفوظ سے جس طرح اتری تھی آج تک اسی طرح مؤمنین کے الواح قلوب پر نقش ہے۔ چودہ سو سال گذر گئے لیکن ایک حرف کا بھی فرق نہیں آیا اور نہ قیامت تک آئے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور وعدۂ الٰہی کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ دوم

ضرورت تفسیر

یہ امر فطری اور یقینی ہے کہ ہر متکلم کی خصوصیات اس کے کلام میں ظہور پذیر ہوا کرتی ہیں جس قدر متکلم کی شان عالی ہوتی ہے اسی قدر اس کا کلام بھی بلند مرتبہ ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض کلام اس درجہ بلند پایہ ہوتا ہے کہ عام اذہان وافکار اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور اس کی جامعیت بھی اس درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ ہزارہا ایسے اصول وقواعد پر مشتمل ہوتا ہے کہ جن سے بے شمار فروع وجزئیات کا استنباط کیا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام محتاج تشریح وتفسیر ہوتا ہے۔ تو قرآن کریم حق تعالےٰ کا کلام وخطاب ہے جس کے ذریعہ اللہ نے اپنے بندوں سے خطاب فرمایا۔ یقیناً حق تعالیٰ کا کلام اس کی بے نہایت وغایت عظمتوں کا مظہر ہوگا۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ہر کس وناکس محض زبان سمجھنے کی وجہ سے اس کلام الٰہی کی عظمتوں اس کی خوبی اور ان حقائق ومعارف اور اغراض ومقاصد کا ادراک کرسکے جن کا اس کلام میں ارادہ فرمایا گیا اور علوم الٰہیہ کو بلا کسی شرح وتفسیر اور معلم ومفسر کے سمجھ جائے۔

بلاشبہ کلام الٰہی کی شان عظمت اور جامعیت شرح وتفسیر کی محتاج ومتقاضی تھی اس وجہ سے خداوند عالم نے اپنے کلام کا شارح ومفسر اپنے ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر مبعوث فرمادیا جیسے کہ ارشاد فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔ اور نازل کیا ہم نے آپ کی طرف وحی (قرآن) کو تاکہ آپ بیان کریں لوگوں کے لئے اس وحی کو جو ان کی طرف اتاری گئی

اور اس طرح اصل تبیین وتشریح کا منصب اور حق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا گیا کہ آپ اپنے اقوال وافعال اور احوال سے قرآن کی شرح فرمائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے متعلق فرماتی ہیں کان خُلُقُہٗ القراٰن۔ کہ آپ کی عادت مبارکہ اور سیرت عین قرآن تھی۔

پھر اس کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کے اقوال وارشادات کو اپنی وحی بنا دیا "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" تاکہ آپ کی طرف سے بیان فرمودہ ہر تشریح وتفسیر خود اس ذات رب العالمین کی تفسیر وتحقیق سمجھی جائے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

غرض قرآن اگرچہ اہل عرب میں اُترا اور عربی زبان ہی میں نازل بھی ہوا لیکن یہ ممکن نہ ہوا کہ ان اہلِ عرب میں سے ہر شخص از خود قرآن کریم سمجھ لے۔ اس کے معارف وحقائق تک رسائی حاصل کر سکے بلکہ وہ آیات کلام اللہ کی مراد سمجھنے میں جگہ جگہ اس بات کے محتاج رہے کہ مقصد کلام کی توضیح کی جائے اور حقیقی مفہوم سے انھیں مطلع کیا جائے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ جب آیۃ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نہیں مخلوط وملتبس کیا انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ تو یہ لوگ وہ ہیں جن کے واسطے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

نازل ہوئی تو اس ظاہر عنوان کو دیکھ کر صحابہ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے "اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ" کہ ہم میں سے کون ایسا ہوگا کہ جس نے اپنے پر ظلم نہ کیا ہو۔ ہر شخص اپنے پر کچھ نہ کچھ زیادتی اور ظلم کرتا ہی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ نہیں یہ ایسا نہیں جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو بلکہ یہ ظلم تو ظلم عظیم یعنی شرک ہے جیسے کہ حضرت لقمان علیہ السلام کے قول میں مذکور ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ تو آپ نے اس تفسیر وتوضیح سے صحابہ کو آیت کے حقیقی مفہوم سے آگاہ فرمایا۔ اور اس کے بعد حضرات صحابہ کی تشویش وپریشانی دور ہوئی۔

حضرات صحابہ فصاحت وبلاغت میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ اور عقل وفہم میں بھی ایسے کامل تھے کہ تاریخ عالم ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قلوب انوار نبوت سے منور اور حضور کے فیض صحبت سے تربیت یافتہ تھے لیکن بایں ہمہ بسا اوقات قرآن کی مراد سمجھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کے محتاج ہوتے۔ اور بہت سے مواقع میں خلاف مراد کا التباس بھی ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان فہم قرآن میں محتاج تفسیر ہے۔ اور اصل تفسیر قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہی ہے۔ تو یہ دعویٰ سراسر غلط اور بداہت عقل کے خلاف ہوا کہ براہ راست قرآنی علوم سمجھے جا سکتے ہیں اور ان علوم کو سمجھنے کے لئے شارح وحی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ کی ضرورت نہیں

اگر بالفرض والتقدیر اس امر کا کسی کو استحقاق ہو سکتا تھا تو وہ صرف صحابہ ہو سکتے تھے مگر حضرات صحابہ خود ایک ایک حرف کلام اللہ کا حضور سے سمجھتے اور معلوم کرتے تھے۔ اب اس کے بعد کس کو حق رہا کہ وہ اس کی جرأت کرے۔

شرح و تفسیر ہر مخاطب کے لئے نور شمس کی طرح ہے۔ اور نور شمس سے منتفع ہونے کے لئے انسان قوت بینائی کا بھی محتاج ہے۔ نہ صرف سورج کی روشنی کافی ہے۔ اور نہ فقط بینائی کسی چیز کی رویت وابصار پر قادر بنا سکتی ہے۔ رات کی تاریکی میں آنکھیں ہزار کوشش کریں لیکن کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اسی طرح آفتاب نبوت کی شعاعیں فکر انسانی کے واسطے قرآن کریم کے مطالب اور معانی سمجھنے میں درکار ہیں۔

غرض نہ محض اپنی بصیرت اور فکر کو کافی سمجھنا چاہئے اور نہ ہی یہ تصور کرنا چاہئے کہ بلا تدبر اور غور و فکر قرآن کے حقائق و معارف حاصل کرے گا۔ اسی لئے آفتاب نبوت کی روشنی میں رہتے ہوئے فکر و تدبر کا حکم فرمایا گیا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ محض تدبر اور فکر انسانی فہم قرآن کے لئے کافی ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ کیوں نہیں وہ غور و فکر کرتے قرآن میں یا دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں۔

اور غفلت و اعراض کرنے والوں پر وعید فرمائی گئی۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

کہ کیا ابھی وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا کہ پگھلیں ان کے دل اللہ کے ذکر کے لئے اور جو حق نازل ہوا (اس کے لئے بھی) اور نہ ہو جائیں وہ ان لوگوں کی طرح کہ جنکو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان پر ایک مدت دراز گذری (غفلت و لاپرواہی میں) جس سے ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں سے اللہ کی اطاعت سے خارج ہونے والے ہیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت جو قرآن میں بیان کئے گئے وہ تین ہیں۔ تلاوت آیات تعلیم کتاب وحکمت۔ اور تزکیہ نفوس۔ جیسے کہ ارشاد ہے یتلوا علیہم ایاتہ ویعلمہم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم اس لئے تلاوت آیات کے ساتھ فہم معانی اور ان پر عمل بھی لازم وضروری ہے۔ کیونکہ کتاب اللہ کی غرض تلاوت سے آگے بڑھ کر اس کے معانی وحقائق سمجھنا اور ان پر عمل کا ضروری ہونا ہے۔

ابن جریر نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے۔

قال کان الرجل منا یتعلم عشر ایات لم — کہ ایک شخص ہم میں سے جبکہ دس آیات یاد کر لیتا تھا تو ان سے

یجاوزھُنَّ حتّٰی یعرف معانیھن والعمل بھن

آگے نہ بڑھتا حتی کہ ان کے معانی جان لیتا اور ان پر عمل کرنے لگتا

حضرت مسروق عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

قال والذی لا الٰہ غیرہٖ ما نزلت اٰیۃ فی کتاب اللہ تعالیٰ الّا وانا اعلم فیم نزلت واین نزلت ولو اعلم احدا اعلم بکتاب اللہ منی تنالہٗ المطایا لاتیتہٗ۔

فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی بھی آیت کتاب اللہ میں ایسی نہیں نازل ہوئی کہ میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس بارہ میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میں کسی شخص کے متعلق یہ معلوم کروں کہ وہ مجھ سے زائد کتاب اللہ کا جاننے والا ہے تو ضرور میں اس تک پہنچوں گا اگر اس کی جگہ تک اونٹنیاں پہنچا سکتی ہوں۔

تفسیر قرآن کے شوق میں مسروق نے ایسا ہی کر دکھایا۔ شعبی بیان کرتے ہیں کہ مسروق نے ایک آیت کی تفسیر کے لئے بصرہ کا سفر کیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جن کے لئے سفر کیا تھا شام چلے گئے تو وہاں سے شام روانہ ہو گئے۔

انس بن مالک رضؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص ہم میں سے سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو وہ ہماری نظروں میں بہت معزز شمار ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور علوم قرآن سے بڑھ کر شرف اور عزت کی کیا چیز ہو سکتی ہے اس لئے اس کا پڑھنے والا اور عالم بھی بڑے اعزاز کا مستحق ہونا چاہئے۔

ابوالعالیہ سے آیت ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا کی تفسیر میں منقول ہے کہ حکمۃ فہم قرآن ہے۔ اور قتادہ فرماتے تھے کہ حکمت قرآن اور احکام قرآن کا جاننا ہے۔ ایاس بن معاویہ سے مروی ہے کہ ان لوگوں کی مثال جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کی تفسیر نہیں جانتے ایسی ہے کہ کسی قوم کے پاس ان کے بادشاہ کی طرف سے کوئی پیغام پہنچا رات کی تاریکی میں اور ان کے پاس کوئی چراغ نہیں کہ وہ اس کی روشنی میں پیغام شاہی پڑھ سکیں اب ان کے دلوں میں اضطراب و بے چینی ہے کہ نہ معلوم اس میں کیا لکھا ہے تو ان کی اس پریشانی اور اضطراب کے عالم میں ناگہاں ایک شخص روشن چراغ لیکر پہنچا جس کی روشنی سے ان لوگوں نے وہ پیغام پڑھ لیا اور اس کے مضمون پر مطلع ہو سکے۔ تو یہ روشن چراغ لانے والا شخص عالم قرآن ہے جس کے علم و ہدایت کے منور چراغ سے اس قوم کی حیرانی دور ہوتی ہے جو جہل و ناواقفیت کی ظلمتوں میں مبتلا اور اس تحیر میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے رب نے ہم سے نہ معلوم کیا خطاب[1] فرمایا ہے۔"

---

[1] ملخص من کلام القرطبی ج ۱ ص ۲۶

تفسیر اور تاویل

لفظ تفسیر باب تفعیل کا مصدر فَسْر سے ماخوذ و مشتق ہے جس کے معنی بیان اور کشف کے ہیں اور تاویل اول سے ماخوذ ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں۔ گویا معانی متعددہ اور محتملہ میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرنا۔ شیخ جلال الدین سیوطی رح نے تفسیر و تاویل کے معنی اور باہمی فرق واضح کرنے کے لئے ائمہ مفسرین کے کچھ اقوال الاتقان میں نقل فرمائے ہیں۔

امام راغب رح فرماتے ہیں کہ تفسیر تاویل سے عام ہے۔ تفسیر کا اکثر استعمال الفاظ و مفردات میں ہوتا ہے۔ اور تاویل کا غالب استعمال معانی اور جملوں میں۔

علامہ اصبہانی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تفسیر اصطلاح علماء میں قرآن کریم کے معانی اور اس کی مراد واضح اور بیان کرنے کو کہتے ہیں خواہ باعتبار حل الفاظ مشکلہ ہو یا غیر مشکلہ ہو باعتبار معنی ظاہر ہو یا باعتبار معنی خفی اور تاویل کلام تام اور جملوں کا مفہوم متعین کرنے کو کہتے ہیں۔

بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے چنانچہ امام ابونصر القشیری بیان کرتے ہیں کہ تفسیر موقوف ہے سماع اور اتباع پر (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) اور تاویل اجتہاد و استنباط کا نام ہے کہ کتاب اللہ کا جو مفہوم سنت رسول اللہ اور احادیث صحیحہ و صریحہ کے ذریعہ متعین ہے وہ تفسیر ہوگا اور اس معین اور واضح مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے اسی کے موافق و مطابق جو لطائف و معارف علوم الٰہیہ میں مہارت رکھنے والے علماء اور محققین استنباط کریں ان کا نام تاویل ہوگا۔

تفسیر شریعت کا ایک اصطلاحی عنوان ہے مطلقاً از روئے عربیت آیات کا ترجمہ یا ان کا اجمالی مفہوم بیان کر دینا یا سمجھ لینا تفسیر نہیں ہے بلکہ تفسیر کا مفہوم، نزول آیات اور زمان نزول احوال نزول و واقعات متعلقہ اور وہ اسباب جن کے باعث آیات نازل ہوئیں ان کا مکی یا مدنی ہونا یا محکم و متشابہ ہونا یا ناسخ و منسوخ ہونا یا خاص و عام اور مطلق و مقید ہونا یا مجمل و مفصل ہونا اور ان میں سے احکام حلال و حرام یا وعد و وعید اور امثال و عبر پر مشتمل ہونا اور یہ کہ دلالت آیات فرضیت پر ہے یا وجوب و استحباب پر ان سب کے جاننے کو تفسیر کہتے ہیں۔ ان امور مذکورہ کو جانتے اور پہچانتے ہوئے جو بات کتاب اللہ کی تفسیر میں کہی جائے گی اس کا نام تو تفسیر ہو سکتا ہے ورنہ تو پھر قیاس آرائی اور تفسیر بالرائے ہے جس کی شدید ممانعت اور اس پر وعید فرمائی گئی ہے۔ من فسر القرآن برأیہ فقد کفر۔ کہ جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ یا ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔

امام[1] ماتریدی فرماتے ہیں کہ تفسیر کے معنی یہ ہیں کہ ایک معنی پر یقین کر لینا کہ اللہ کی مراد بس یہی ہے اور تاویل یہ ہے کہ چند احتمالات میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینا۔

حاصل یہ کہ جو بیان ظاہر کے مطابق اور قطعی ہو وہ تفسیر ہے خواہ کلام معصوم سے ہو یا غیر معصوم سے اور جو بیان خلاف ظاہر ہو مگر قواعد اور قرائن سیاق اور سباق کے مطابق ہو تو وہ تاویل ہے۔ اگر معصوم کی طرف سے ہے تو قطعی ہے ورنہ ظنی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں قرآن نے فرمایا ویعلمك من تاویل الاحادیث۔ یہاں تاویل ظنی نہیں ہو سکتی بلکہ قطعی ہو گی کیونکہ سکھانے والا اس تاویل کا اللہ ہے اور جس کو سکھایا گیا وہ خدا کا پیغمبر۔ اس لئے اب اس کے ظنی ہونے کا کیسے امکان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت خضر، اللہ رب العزت کی طرف سے بتائے ہوئے امور تکوینیہ کو اسی عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں۔ ذٰلِكَ تَاوِيْلُ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا۔ تو یہاں بھی تاویل قطعیت ہی کی شان کے ساتھ متصف ہے۔
متشابہات کے علم اور اس کی حقیقت کو حق تعالےٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرماتے ہوئے یہ فرمایا۔
وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ اور ظاہر ہے کہ علم الٰہی قطعی ہی ہوتا ہے۔

غرض تاویل کا عنوان ظن اور احتمال کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تاویل کی اضافت دیکھی جائے گی کہ وہ کس معنی پر مبنی ہے۔ اگر اس کی اضافت خداوند عالم یا نبی کی طرف ہے تو وہ تاویل تفسیر اور تحقیق ہی ہے اور قطعی و یقینی ہے۔ اور اگر اصول مقررہ اور قواعد کے ماتحت کسی ایسے معنی کا استنباط ہے جو حدیث مرفوع یا صحابہ کی تفسیر میں اگرچہ منصوص نہیں لیکن انہی کے مقرر کردہ اصول سے وہ معنی ماخوذ ہیں تو پھر یہ تاویل ظنی ہے جیسے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے اصول اور کتاب و سنت سے استنباط کردہ فقہی فروع و جزئیات ظنی کہلاتی ہیں بایں معنی کہ وہ امر جزئی اور مسئلہ فقہیہ بعینہ اس طرح قطعی اور یقینی نہیں جس طرح کہ اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ کا حکم ہے۔
حضرت شاہ عبد العزیز سورۂ قیامہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تفسیر میں تین رعایتیں شرط ہیں۔
(۱) ہر کلمہ کو معنی حقیقی یا مجاز متعارف پر محمول کرنا۔ (۲) سیاق و سباق کو ملحوظ رکھنا کہ کلام بے ربطہ ہو جائے
(۳) شاہدان نزول وحی یعنی پیغمبر علیہ السلام اور صحابہ کی تفسیر اس کے خلاف نہ ہو۔ پس اگر شرط اول فوت ہو تو تاویل قریب ہے اور اگر دوسری یا تیسری فوت ہو تو تاویل بعید۔ اور اگر تینوں فوت ہو جائیں تو پھر تحریف ہے اسی لئے علم تفسیر کی تعریف اصول تفسیر کی کتابوں میں اس طرح کی جاتی ہے۔

اِنَّ عِلْمَ التَّفْسِيْرِ عِلْمٌ يُّبْحَثُ فِيْهِ عَنْ مَعْنٰى نَظْمِ الْقُرْاٰنِ بِحَسْبِ الْقَوَانِيْنِ الْعَرَبِيَّةِ وَالْقَوَاعِدِ — علم تفسیر اس علم کو کہا جاتا ہے جس میں نظم قرآنی کے معنی سے بحث کی جائے قوانین عربیہ اور قواعد شرعیہ کے مطابق

---

[1] تفسیر روح المعانی ص ۱ ج ۱ الاتقان ص ۱۷۳ ج ۲

الشَّرعیۃ بِقَدْرِ الطَّاقَۃِ البَشَرِیۃِ بقدر طاقت بشریہ۔

ابوحیان نے علم تفسیر کی تعریف اس عنوان کے ساتھ کی ہے۔[1]

کہ وہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیتِ نطق اور معانی الفاظ اور ان کے افرادی وترکیبی حالات اور ان کے تمات کا بیان کیا جائے۔

علم کا لفظ بمنزلہ جنس کے ہے جو جملہ علوم کو شامل ہے۔ کیفیت نطق کی قید سے علم قرأت اور معانی الفاظ کی قید سے علم لغت کی طرف اور الفاظ کے افرادی وترکیبی حالات کی قید سے صرف ونحو بیان بدیع کی طرف اور مدلولات حقیقیہ ومجازیہ کی طرف اور تتموں کی قید سے معرفت ناسخ ومنسوخ ظاہر نص مفسر ومحکم اور توضیح قصص واحکامات کی طرف اشارہ ہے اور یہ علوم علم تفسیر کے مبادی ہیں۔

موضوع تفسیر

علم تفسیر کا موضوع قرآنِ کریم ہے اس لحاظ سے کہ قرآن کے مطالب واغراض اور مقاصد بیان کئے جائیں۔ اہل علم کے نزدیک یہ امر متعارف ہے کہ علوم مدونہ کا باہمی امتیاز موضوع ہی کے تعین اور امتیاز سے ہوتا ہے مثلاً طب اور علم ہے نحو صرف دوسرا علم ہے تو یہ امتیاز ہم اسی طرح پہچانتے ہیں کہ طب کا موضوع بدن انسانی ہے اور اس میں اسی کے حالات صحت ومرض سے بحث کی جاتی ہے۔ صرف ونحو کا موضوع کلمہ اور کلام ہے اور وہاں کلمہ وکلام ہی کے متعلقات سے بحث ہوتی ہے۔ غرض ہر علم کا موضوع وہی ہوتا ہے جس کے حالات ذاتیہ سے اس فن میں بحث ہو۔ اس لئے فن تفسیر میں صرف انہی امور سے بحث کی جاسکتی ہے جو قرآن کے اغراض ومقاصد سے متعلق ہوں۔ ایسے کسی امر کا ذکر کرنا جس کا کوئی تعلق قرآن کے اغراض ومقاصد مطلوبہ سے نہ ہو اس کو تفسیر نہیں کہا جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص آیت "یٰۤاَھَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا" کی تفسیر وتشریح میں فن تعمیرات کے اصول اور اس کی جزئیات سے بحث شروع کردے اور انجینیرنگ کے طریقوں کا استنباط کلام اللہ سے کرنے لگے اور یہ کہ کس رُخ پر تعمیر کس طرح ہونی چاہئے کس ملک میں تعمیر کے کیا طریقے مروج ہیں کتنی منزل کی تعمیر کے لئے کس قدر استحکام کے ساتھ بنیادوں کے اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس کا معیار کیا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کے مسائل کا ذکر قرآن کریم میں ایسا ہی ہوگا جیسا کہ دستور وآئین کی کسی کتاب کی شرح میں کوئی موچی جوتا گانٹھنے کے مسائل بیان کرنا شروع کردے۔ چمڑے کی صفائی اور رنگائی کے اصول سے بحث کرنے لگے۔ یہ مانا کہ جوتا بنانا ایک مفید اور بہترین صنعت اور انسانی زندگی کا جزو لازم بھی ہے لیکن ہر عاقل انسان دستور وآئین کے ساتھ اس قسم کے مسائل بیان کرنے کو ایک

[1] بحوالہ البیان فی علوم القرآن ص۱۳

کھلی حماقت تصور کرے گا۔ اس لئے کہ ہر شے کا ذکر موضوع کے ساتھ ربط و تعلق رہنے ہی کی صورت میں مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے مضامین تفسیر وہی ہوں گے جو موضوع تفسیر کے ماتحت قرآن کریم کے مقاصد اصلیہ سے تعلق رکھتے ہوں اصول سائنس اور صنعتی ترقیات کو مضامین قرآن میں زیر بحث لانا اور انہی مسائل کو منتہائے فکر اور مبلغ علم قرار دینا قرآن کے اعلیٰ و اکمل اصول ہدایت اور فوز و فلاح کے بہترین مقاصد سے اعراض کرنا ہوگا۔

توحید و رسالت اصلاح اعمال و اخلاق تحفظ حقوق نظام مملکت کی وابستگی اعلاء کلمۃ اللہ تذکیر آخرت زہد و قناعت تقویٰ اور صبر و شکر کی تعلیم۔ اخلاقی اور عملی گندگیوں سے طہارت فساد فی الارض سے اجتناب مجرمین کی سرکوبی جان و مال اور عزت و ناموس پامال کرنے والے مفاسد اور اس قسم کے مفسدین سے معاشرہ کی تطہیر جیسے پاکیزہ اصول جو مقاصد قرآن ہیں نظرانداز کرنا ہوگا۔

غرض یہ سمجھنا کہ بس سائنسی ترقیات ہی مقاصد وحی الٰہی ہیں۔ قرآن کریم کی ایک کھلی تحریف و بے حرمتی اور ان مقاصد عالیہ سے محروم رہنا ہے جن کے لئے اللہ نے قرآن نازل فرمایا اور ان کی تعلیم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

قرآن نہ ہوائی جہاز اور راکٹوں کی صنعت سکھانے کے لئے نازل ہوا اور نہ اس کی تعلیم مقصد رسالت ہے بلکہ مقصد وحی اور غرض رسالت تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس ہے۔

یہ صنعتی ترقیات ہمارے دنیوی امور ہیں جن کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے انتم اعلم بامور دنیاکم فرما کر ان کو خود ہمارے حوالے فرما دیا کہ تم ان چیزوں میں جس طرح چاہو تصرف اور ترقی کرتے رہو۔ ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں۔ خداوند عالم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان ایجاد کردہ تمام مخلوقات پر انسان کو جو تصرف و حکمرانی کی قوت بخش دی ہے اس کو بطور انعام بیان کرکے یہ ظاہر فرما دیا کہ اے انسانو! یہ سب کائنات تمہارے واسطے مسخر کر دی گئی ہے اب تم جس طرح چاہو تصرف کرو پانی پر سفر کرو یا ہوا۔ پر اڑو۔ معدنیات سے زمین کے خزانوں کو حاصل کرو۔ . . . . . ہم نے سب کچھ تمہارے ہی نفع کے لئے بنایا ہے ان نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے ہر مقام پر حق تعالےٰ نے انسانوں کے افکار کو اپنی معرفت اور اداء عبادت کی طرف دعوت دی اور یہ کہ ان بے شمار انعامات اور دلائل ربوبیت کو دیکھ کر بھی اپنے رب کا نہ پہچاننا اور اس کی نافرمانی کرنا بہت بڑا ظلم احسان ناشناسی اور احساس و شعور کا فقدان اور قلوب کی موت ہے۔ بس یہی مقصد قرآن ہے۔ اسی مقصد اور محور کی پیروی کرتے ہوئے آیات اللہ کی تشریح تفسیر کہلاتی ہے۔ اور اس کو چھوڑ مثلاً

"سخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ" جیسی آیات پر جہازوں کی صنعت پر بحث شروع کر دینا کہ

کشتیاں اور جہاز کس طرح تیار کیے جائیں اس کے کیا طریقے اور اصول ہیں۔ اس کے بنانے والوں کو کیا تعلیم دی جائے، کتنی مدت تعلیم رہے اس کا نصاب کیا ہے۔ اس کا طریق تربیت کیا ہے۔ کیا کیا وہ سائنسی اصول ہیں جس کے ذریعہ یہ صنعت ترقی پذیر ہو سکے۔ وغیر ذلک غرض یہ عنوان اختیار کرتے ہوئے جہاز سازی اور جہاز رانی کے تمام شعبوں کی پوری روئیداد اور جزوی جزوی تفصیلات میں پڑ جانا ظاہر ہے کہ یہ چیز تفسیر تو کیا کہلائے گی اس کا نام تو یقیناً تفسیر قرآنی کے بجائے تحریف قرآنی ہونا چاہیئے۔ عام فہم لوگ اور مقاصد قرآنی سے تعلق نہ رکھنے والے ان امور کو قرآنی تحقیقات کہیں گے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور احساس نہ ہوگا کہ ان امور نے ہمارے حقیقی مقصد کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ قرآن نے جس دنیوی زندگی کے انہماک سے انسانوں کے رُخ اخروی زندگی کی طرف پھیرے تھے اور وانیبوا الی ربکم و انیبوا الی ربکم کی بار بار کی صداؤں سے انسانی زندگی کا رُخ صحیح منزل کی جانب کر دیا تھا۔ یہ تحقیقات اس رُخ کو غلط کر کے پھر اسی جاہلیت کے دور کی طرف واپس لوٹا دیں گی۔ اگر اور کوئی نقصان سمجھ میں نہیں آتا تو سب سے بڑھ کر یہ نقصان تو سرسری نظر ہی سے معلوم ہو جائے گا اور یہ قباحت لازم آئے گی کہ اس معیار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگیاں ہی قرآنی مضامین سے بالکل بے تعلق نظر آئیں گی کیونکہ آنحضرت نے تو کسی مجلس میں ان صنعتی ترقیات کو نہ بیان فرمایا اور نہ ہی صحابہ نے ان کو کبھی بیان کیا۔ نہ ابن عباس اور ابن مسعود جیسے جلیل القدر صحابہ سے یہ مضامین نقل کئے گئے۔ تو سوچیئے اگر ان مضامین کا نام "علوم قرآن" قرار دیا جائے تو کیا یہ لازم نہ آئے گا کہ علوم قرآن سے سب سے زیادہ ناواقف یہی حضرات تھے۔ نہ ان مضامین کو آنحضرت نے سمجھا نہ صحابہ و تابعین نے اور نہ غزالی و رازی نے اور بے شمار علمائے ربانیین نے۔ قرآن کو حضور کے وقت سے لیکر آج تک کسی نے حل نہ کیا۔ بس آج ان جدید تحقیقات ہی نے قرآن حل کیا تو پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خداوند عالم نے بلاوجہ قرآن محمد رسول اللہ پر نازل فرمایا اور صحابہ کو اس کا اولین مخاطب بنایا۔ اچھا ہوتا کہ لندن کی کسی یونیورسٹی کے فلاسفر پر اترتا۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ بظاہر ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان یہ سوچنے کی بھی جرأت کر سکے۔

یہ بات تو نہایت ہی واضح ہے کسی تردد و بحث کی محتاج نہیں کہ قدرت کی طرف سے ...... صنعت و حرفت کے تمام شعبے انسانوں کے انظار و افکار کے حوالے کر دیئے گئے کہ تم جو چاہو کرو۔ اور جس طرح چاہو ایک سے ایک اچھی گھڑی ایجاد کرو۔ ہواؤں پر اڑو۔ برقی پرواز سے بھی زائد تیز رفتار جہاز بناؤ۔ مگر ان چیزوں کو علوم الٰہیہ نہ کہو یہ علوم انسانیہ ہیں۔ علوم الٰہیہ اور علوم انسانیہ میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا کہ خود خالق اور مخلوق کے درمیان ہے۔

اس لئے مضامین قرآن علوم الٰہیہ سے متعلق رہیں گے۔ فنی اور صنعتی امور کے ذکر کو ان پر ترجیح دینا یا اس قسم کے مباحث سے قرآن کے مضامین عالیہ کو ملوث کرنا کلام ربانی کی شان علو یت کو گھٹا کر جرمن و جاپان کی ایجادات کے معیار پر لے آنا ہوگا۔

اگر کسی نے ایسا کیا تو پھر تو (خدانہ کردہ) قرآن کا ساری دنیا میں بہترین کتاب ہونا یا معجزہ ہونا ہی مخدوش ہو جائے گا کیونکہ پھر تو قرآن کا کمال صنعتی ترقیات کے کمال سے پرکھا جانے لگے گا۔ اب اس پر جو بھی کتاب پوری اترے گی اسی کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ دعویٰ کرے کہ

ذٰلِکَ الکتاب لا ریب فیہ۔ اور قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ۔ اور وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ۔

بہرکیف موضوع تفسیر وہی مضامین ہیں جو علوم الٰہیہ ہیں اور مقاصد قرآن ہیں جن کی تشریح و تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ آپ کے اقوال وعادات اور صحابہ کی روایات نے کی۔ انشاء اللہ العزیز آئندہ کسی عنوان کے تحت علوم قرآن اور مقاصد قرآن کی تفصیل ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔

جدید تحقیقات اور سائنسی ترقیات کو مقصد کائنات کا دل فریب عنوان دے کر مضامین قرآن میں داخل کرنے والوں کے طرز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کا موضوع ہی معلوم نہیں۔ قرآن نہ تو فلسفہ ہے اور نہ سائنس کی کوئی کتاب ہے نہ تاریخ و جغرافیہ ہے وہ تو طب روحانی کی آخری اور بے مثال کتاب ہے جس میں روحانی امراض کے معالجات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس قسم کی تفسیریں مرعوبانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہیں کہ یورپ کی مادی ترقیات سے مرعوب ہو کر آیات قرآنیہ کو سائنس کے مسائل اور تحقیقات جدیدہ پر ڈھالنا شروع کر دیا۔ جن پر خود ماہرین سائنس کو بھی پورا وثوق نہیں۔ بہت ممکن ہے گذشتہ تحقیقات کی طرح آج کی یہ تحقیقات بھی کسی وجہ سے غلط ثابت ہو جائیں۔ ایسی صورت میں تو قرآن ہی کا غلط ہونا لازم آئے گا۔ نیز اس تقدیر پر یہ بھی خرابی لازم آئے گی کہ ان آیات کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اور عرب بلکہ سارا عالم حتیٰ کہ قیصر وکسریٰ جیسی متمدن حکومتیں بھی ان چیزوں سے قطعاً ناآشنا تھیں بلکہ روئے زمین پر بھی کوئی شخص فلسفہ اور سائنس کی ان موجودہ تحقیقات سے واقف نہ تھا تو اگر قرآن کا موضوع یہی تحقیقات جدیدہ اور مسائل ہیں تو ان کے سامنے ان مسائل کے بیان سے کیا حاصل اور فائدہ ہوا۔ اس کی مثال تو وہ ہوگی کہ

"یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔"

پھر یہ بھی خرابی لازم آئے گی کہ اگر فلاسفۂ یورپ یہ سوال کریں کہ قرآن نازل کرنے سے اگر انہی تحقیقات جدیدہ

اور سائنس کے مسائل کو بیان کرنا مقصود تھا تو پھر ہمیں قرآن اور تمہارے پیغمبر اور تمہارے دین کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب ہم بغیر قرآن کے ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جو تمہارے سامنے موجود ہے اور تم باوجود قرآن کے اس ترقی کے میدان میں ہم سے بہت دور ہو۔ اور جو کچھ تم نے ترقی کی وہ بھی ہماری بدولت اور ہماری امداد و اعانت سے ہوئی کہ قرآن سے تو پھر ہمیں قرآن کی ضرورت کیا ہے۔ اور اے مسلمانو تم پھر ہمیں کس قرآن اور کس اسلام کی دعوت دیتے ہو۔ اور اگر ہمیں قرآن اور اسلام کی دعوت انہی مسائل کی خاطر دیتے ہو تو ہمیں نہ تمہارے قرآن کی ضرورت ہے اور نہ تمہارے اسلام کی۔ ہم بغیر قرآن ہی کے ان تحقیقات پر پہنچ چکے ہیں تو یہ جدید مفسرین بتائیں کہ فلاسفۂ یورپ کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے۔[1]

تفسیر قرآن کے لئے کن علوم کی ضرورت ہے

علم تفسیر کی تعریف امام ابوحیان کے حوالہ سے نقل کی جا چکی کہ "وہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت نطق اور معانی الفاظ اور ان کے افرادی و ترکیبی حالات اور ان کے تتمات بیان کئے جائیں"

یہ تعریف جن قیود اور فصول پر مشتمل ہے اس سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ علم القرأت لغت صرف نحو بیان بدیع معرفت ناسخ و منسوخ اور معرفت ظاہر و نص و مفسر و محکم اور ان کے مقابل اقسام اور معرفت احوال امم ماضیہ یہ تمام علوم علم تفسیر کے لئے اجزائے ترکیبیہ اور مبادی ہیں۔

ائمہ تفسیر علوم مذکورہ میں سے بعض کو مبادی تفسیر قرار دیتے ہیں معرفت ناسخ و منسوخ اور اسباب نزول مقاصد آیات کی تشریح الفاظ غریبہ کی توضیح ابہام و اجمال کی تفصیل تفسیر کا یہ حصہ تو روایت یعنی نقل صحیح اور اقوال سلف سے تعلق رکھتا ہے۔ اکثر متقدمین اسی کو تفسیر کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو لغت صرف و نحو اور معانی جیسے علوم سے متعلق ہے۔ یہ حصہ مبادی تفسیر کہلاتا ہے۔ یہ مبادی تفسیر آثارِ سلف نقل صحیح اور روایات پر موقوف نہیں ہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی رح فرماتے ہیں کہ تفسیر کے لئے پندرہ علوم ضروری ہیں اور کسی شخص کو قرآن کی تفسیر کا حق نہیں جب تک کہ وہ ان تمام علوم میں ماہر نہ ہو۔

(۱) لغت عربیہ جس کی وجہ سے الفاظ مفردہ کی تشریح کی جا سکے اور کلمات کا مدلولِ وضعی معلوم ہونا ممکن ہو۔ مجاہد رح سے منقول ہے فرماتے تھے کہ کسی ایسے شخص کے لئے کہ جو اللہ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتا ہو یہ چیز حلال نہیں کہ وہ کتاب اللہ کے بارہ میں کچھ لب کشائی کرے تاوقتیکہ

وہ لغت عربیہ کا عالم نہ ہو اور یہ بات کافی نہیں کہ چند لغات کے معانی جان لینے کے بعد کوئی شخص یہ گمان کرے کہ میں عالم باللغۃ العربیہ ہوں ظاہر ہے کسی لغت کا ماہر اور عالم اسی کو کہا جائے گا جس کو اس زبان کے پورے لغات پر عبور ہو ان کی اوضاع کو پہچانتا ہو اشتراک و ترادف اور طرقِ استعمال سے واقف ہو

(۲) علم النحو اس لئے کہ اعراب ہی پر معانی کا دارومدار ہے۔ اور اعراب ہی کی رعایت سے کلام کا صحیح مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ ادنیٰ فرق اور تغیر سے زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اعرابی نے ایک شخص کو سنا کہ وہ یہ آیت پڑھ رہا ہے اِنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ رَسُوۡلُہٗ اور لفظ رسولُہٗ رفع کے ساتھ پڑھنے کے بجائے ورسولِہ جر کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ اور اس طرح آیت کا مفہوم قطعاً فاسد ہو جاتا تھا اور بجائے اس کے کہ آیت کے معنی یہ ہوں کہ اللہ اور اس کا رسول بری اور بیزار ہے مشرکین سے یہ معنی لازم آئے ہیں کہ مشرکین پر عطف ہے ورسولہ کا اور معطوف علیہ معطوف ہر دو پر حکم سابق العیاذ باللہ مرتب ہو رہا ہے۔ اس آیت کو غلط طریقہ پر سنکر اعرابی (دیہاتی) کہنے لگا کیونکر اس دین کو اختیار کیا جائے جس میں اللہ اپنے رسول سے ..... ہے۔

اسی پر ابوالاسود دؤلی کو علم نحو کے اصول مرتب کرنے کے لئے مامور فرمایا گیا۔ اعراب قرآن کے عنوان کے ماتحت اس کی تفصیل گذر چکی۔

(۳) علم صرف۔ اس لئے کہ صَرف ہی کے ذریعہ بناءِ کلمات اور صیغوں کا علم ہو سکتا ہے اور جبتک کہ انسان یہ نہ جانے کہ یہ صیغہ کونسا ہے اور اس کی تصریف و تعلیل کس طرح ہے تو وہ کلام کی مراد اور معنی کیسے سمجھ سکتا ہے۔

(۴) علم الاشتقاق۔ کیونکہ جب تک کہ اصل مادہ لغت معلوم نہ ہو کلمہ کے معنی سمجھنا ممکن نہیں بسا اوقات لفظ کی صورت یکساں ہوتی ہے لیکن اختلاف مادہ کی وجہ سے معنی میں عظیم تفاوت ہو جاتا ہے مثلاً لفظ مَسِیح فَعِیلٌ کے وزن پر کہ سیاحت بمعنی سیر سے مشتق ہو سکتا ہے اور مسح (بمعنی ملنا رگڑنا ہاتھ پھیرنا) سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لفظ مسیح کے معنی متعین کرنے کے لئے کلمہ کا اصل مادہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی اور بغیر مادۂ اشتقاق کے تعین کے کوئی معنی نہیں لئے جا سکیں گے۔

(۵) علم المعانی (۶) علم البیان (۷) علم البدیع اس لئے کہ بغیر ان علوم کے نہ تو ترکیب کلام سے ان معانی کا ادراک ہو سکتا ہے جن پر کلمات دلالت کر رہے ہیں اور نہ ہی خصوصیات کلام اور تعبیر کے محاسن اور قرآن کی مجیر العقول بلاغت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ (۸) علم القرأت اس لئے کہ الفاظ کلام اللہ کی کیفیتِ نطق اسی کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے (۹) علم اصول دین۔ تاکہ احکام حلال و حرام فرض

واجب جائز اور ناجائز پر استدلال کر سکے۔ (۱۰) اصول فقہ۔ تاکہ احکام شرعیہ اور فقہیہ تفصیلی طور پر نصوص کتاب اور سنت سے استنباط کرنا ممکن ہو (۱۱) علم اسباب النزول والقصص۔ اس لئے کہ اسباب نزول اور واقعات متعلقہ کے علم کے بغیر آیات کا مفہوم سمجھنا نہایت ہی مشکل امر ہے۔ (۱۲) علم ناسخ ومنسوخ۔ اس لئے کہ شریعت میں بہت سے احکام منسوخ کئے گئے ہیں اور ان کے قائم مقام دوسرے احکام مقرر ہوئے تو ضروری ہے احکام کلام اللہ کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے انسان ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتا ہو۔ (۱۳) فقہ یعنی احکام شرعیہ سے متعلق تفصیلی جزئیات اور فروع کا علم (۱۴) علم الحدیث اس لئے کہ قرآن کی اصل تشریح وتفسیر تو حدیث ہی کرتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ قرآن کی عملی تشریح ہے۔ (۱۵) علم الموہبہ یعنی وہ صحیح ذوق باطنی نور اور فہم صحیح جو انسان کو علم صحیح عمل صالح اور اس کے زہد وتقویٰ کی برکات سے منجانب اللہ عطا ہوتا ہے جس کی بدولت کلام اللہ کے معارف واسرار اور لطائف اس پر منکشف ہوتے ہوں۔

ابن ابی الدنیا بیان فرماتے ہیں کہ علوم القرآن اور جو علوم وحقائق اس سے مستنبط ہیں وہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے (علوم مذکورہ حقائق قرآنی کے لئے کافی نہیں ہیں بلکہ) یہ علوم مفسر کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہیں کہ ان کے ذریعہ مفسر قرآن کریم کے مفہوم کو حاصل کر سکتا ہے۔ جو شخص ان اصول اور قواعد کے ماتحت تفسیر کرے گا اس کی تفسیر قابل اعتبار ہوگی اور جو بغیر ان علوم کے حاصل کئے ہوئے تفسیر کرنے لگے وہ تفسیر بالرائی ہوگی جس کی ممانعت نہایت تاکید کے ساتھ کر دی گئی۔

علم الموھبہ بظاہر غیر اختیاری اور محض عطاء الٰہی ہے جو انسان کی قدرت اور اس کے کسب واکتساب سے خارج معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب واحوال پر یہ علم عطا ہوتا ہے وہ اختیاری ہیں یعنی انسان کا عمل صالح اس کا خلوص زہد وتقویٰ شہوات ومعاصی سے پرہیز اور انابتہ الی اللہ یہ تمام امور چونکہ اختیاری ہیں اس لئے اس علم الموھبہ کو بھی اختیاری علوم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ شیخ رح؟ برہان میں ذکر فرماتے ہیں کہ یہ بات جاننا چاہئے کہ کسی ایسے شخص پر وحی الٰہی کے معارف اور اسرار منکشف نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کو فہم قرآن سے کوئی حصہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جس کے دل میں بدعت کی گندگی بھری ہو۔ کبر وغرور خواہشات نفسانیہ اور حُب دنیا ہو اور گناہوں پر اصرار کرتا ہو۔ ایمان واعتقاد کمزور ہو یہ تمام باتیں فہم قرآن اور وحی الٰہی کے اسرار سمجھنے کے لئے حجاب اکبر ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

سَأَصْرِفُ عَنْ اٰیَاتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی کو میں رُخ پھیر دوں گا اپنی آیات (اور نشانیوں سے

الارض۔
ان لوگوں کا جو تکبر کرتے ہیں زمین میں۔
تو معلوم ہوا کہ تکبر کرنے والوں کو آیات اللہ کے فہم سے دور کر دیا جاتا ہے۔ سفیان بن عیینہ سے یہی منقول ہے۔

ان پندرہ علوم کے علاوہ اور بھی بعض علوم تفسیر قرآن کے لئے ضروری ہیں، اگرچہ بعض علوم مذکورہ میں ضمناً مندرج ہو سکتے ہیں[1]۔

(۱۷) علم کلام۔ (۱۸) علم تاریخ (۱۹) علم جغرافیہ اس لئے کہ جن واقعات کو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے ان کے مقامات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ (۱۹) علم الزہد والرقاق۔ (۲۰) علم الاسرار اس لئے کہ اسرار قرآنی کا سمجھنا انہی پر موقوف ہے۔ (۲۱) علم الجدل والخلاف۔ اس لئے کہ قرآن میں بکثرت اہل باطل کے ساتھ مناظرانہ رنگ میں حقائقِ توحید اور معارفِ ربوبیت بیان کئے گئے ہیں، اور اہل باطل پر رد کیا گیا تو ان دلائل کو سمجھنا علم الجدل والخلاف پر موقوف ہے۔ (۲۲) علم السیرۃ۔ (۲۳) علم الحقائق یعنی وہ علم کہ جس میں حقائق موجودات کا بیان ہوتا ہے۔ یہ علم نہایت ہی وسیع ہے اور اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ حقائق موجودات میں حکماء قدیم کا علم جدا ہے اور حکمائے جدید کا علم دوسرا، دونوں کی تحقیقات میں بڑا تفاوت ہے۔ پھر اس میں اہل اشراق کا علیحدہ مسلک ہے اور حضرات صوفیاء اہل حقیقت کا علیحدہ جو ان کے انکشاف روحانی پر مبنی ہے۔ جو ان حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ یا بالواسطہ حاصل ہوتا ہے۔ (۲۴) علم الحساب کیونکہ قرآن میں علم میراث بھی ہے! اور میراث میں حساب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ حساب مسائل میراث کے لئے مدار ہے۔ (۲۵) علم منطق۔ تا کہ اس کے مسائل و قواعد معلوم ہونے سے قرآن کے طریق استدلال اور دلائل کی قوت معلوم کر سکے۔

غرض یہ علوم مفسر کے لئے ضروری اور لازمی ہیں ان علوم میں مہارت کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر کا قصد کرے۔ افسوس کہ اس زمانہ میں ہر کس و ناکس چند اردو یا انگریزی تراجم دیکھ کر اور انہی سے عبارتوں کو ردو بدل کر کے کچھ جمع کر لیتے ہیں اور تفسیر کرنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی مہارت و ہمہ دانی کے مدعی ہوتے ہیں اور قابل صد حیرت و افسوس امر ہے کہ ان متقدمین اور سلف کی تفاسیر اور تحقیقات پر ردو قدح کرنے لگتے ہیں جو علوم و حقائق کے ناپیدا کنار سمندر علمی اور نظری عظمتوں کے پہاڑ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں علوم قرآن کی تحصیل اور اس کی اشاعت میں صرف کیں۔ غضب بالائے غضب آج یہ لوگ جو عربی کی ابجد سے بھی ناواقف فعل فعلا کی گردان تک کا سلیقہ نہ رکھیں اور ان اکابر و سلف کی تحقیقات پر اعتراضات کرتے ہوئے اپنی منگھڑت چیزیں اور

---

[1] الاتقان ص۱۸۱

اوہام کے متعلق دعویٰ کریں کہ یہ قرآنی علوم ہیں۔ افسوس صد افسوس۔ غزالی اور رازی کی تحقیق و تجہیل کریں اور اپنی لن ترانیاں اور یورپ کی تقلید میں مغربی خیالات کی اشاعت کو کمال سمجھنا ایک کھلی ہوئی حماقت ہے خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشے اور عامۃ المسلمین کو ایسے فتنوں سے محفوظ و مامون رکھے آمین

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ان شرائط مذکورہ اور بیان کردہ علوم میں مہارت کے ساتھ مفسر و مترجم ہونے کے لئے یہ بھی ایک شرط ہے کہ اس شخص نے علم باضابطہ اساتذہ سے حاصل کیا ہو جس شخص نے باضابطہ اساتذہ سے نہیں پڑھا ہو اور محض تراجم دیکھ لینا یا اردو انگریزی تفاسیر کا مطالعہ کر لینا کافی سمجھ کر تفسیر کرتا ہو تو یہ شرعاً اور عقلاً جائز اور درست نہیں ہے جیسے کہ کوئی شخص ڈاکٹری کتابوں کا محض مطالعہ کر لینے سے ڈاکٹر نہیں بن جاتا اور قانون کے تراجم دیکھ کر وکیل اور قانون داں نہیں ہو سکتا اسی طرح اردو تراجم کے مطالعہ سے ممکن نہیں کہ کوئی شخص مفسر قرآن ہونے کا مدعی ہو سکے۔ حالانکہ ڈاکٹری اور قانون و وکالت انسانی علوم ہیں انسانی فکر اس کی بلندی کو پا سکتی ہے۔ اس کے بالمقابل قرآن تو علوم الٰہیہ کا ایک عمیق سمندر ہے۔ پھر کیسے انسان باضابطہ علم حاصل کئے بغیر ہمہ دانی کا مدعی بنتا ہے۔

مفسر و مترجم ہونے کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ علماء معاصرین اور فضلاء زمانہ کی نظر میں اس کا علم فہم اور تقویٰ مسلم اور معتبر ہو۔ کیونکہ علم تو وہ ہی ہے جس کا اہل فضل و کمال اعتراف کریں فضل و کمال کے لئے محض دعویٰ کافی نہیں، مشک آن ست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اگر کسی کو اپنے علم و فضل کا دعویٰ ہو تو اس کے امتحان کا طریقہ نہایت سہل اور آسان یہ ہے کہ اس کو ایک نسخہ سادہ قرآن کریم کا دے دیا جائے اور اس کو پہلے تو یہ کہا جائے کہ دو تین رکوع کی صحیح تلاوت کرو۔ پھر ان آیات کے صیغے اور اعراب بتاؤ اور اس کے بعد کہو کہ ترجمہ کرے اور آیات کی تشریح و تفسیر بیان کرے۔ اس قسم کے مدعیان علم و فضل کے دعویٰ کی حقیقت خود بخود روشن ہو جائے گی۔

لیکن افسوس افتاد زمانہ اور فطرتوں کا مسوخ ہونے کا کیا علاج کیا جائے کہ ایسی صورت بیان کرنے پر فوراً کہدیا جائے گا کہ یہ باتیں تو دقیانوسی ہیں اور ملاؤں کی مکتبی باتوں میں ہم پڑنے والے نہیں۔ اور یہ کہ جاہل ملاؤں نے قرآن کو مکتب میں محدود کر کے رکھدیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفسر و مترجم کے لئے ان تمام شرائط اور علوم کے ضروری ہونے کی ایک اجمالی اور کلی دلیل یہ ہے کہ اگر مترجم و مفسر ان تمام شرائط کا جامع نہ ہوگا تو وہ قرآن کریم کی تفسیر اپنی رائے سے کرے گا جس کا غلط اور گمراہی ہونا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللهِ اِنَّ اللهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ۔ ثَانِىَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ لَهٗ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ

اور اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہو بغیر اللہ کی طرف سے ہدایت کے۔ بیشک اللہ تعالیٰ رہبری نہیں فرماتا ظالموں کی۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو جھگڑتے رہتے ہیں اللہ کے بارہ میں بغیر علم اور ہدایت اور بغیر کسی کھلی ہوئی روشن کتاب اور دلیل کے پھیرے ہوئے ہے ایسا شخص اپنی بازو (حق کے راستے باطل کی جانب) تاکہ بھٹکا دے (لوگوں کو) خدا کے راستہ سے اس کے واسطے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ہم اس کو ایک دہکتے ہوئے اور جلانے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

جو شخص قانون حکومت اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا چاہے اور اس کی دفعات کی ایسی عجیب و غریب تشریحات کرے جو عدالت عالیہ کے کسی فاضل جج کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی ہو تو ایسا شخص یقیناً حکومت کا مجرم ہے اور حکومت کے آہنی پنجہ سے نہیں چھوٹ سکتا۔ بس اسی طرح جو شخص قانونِ خداوندی کے ایسے عجیب و غریب معانی بیان کرے جو عہد صحابہ سے لے کر اس وقت تک کسی امام مفسر عالم ربانی اور فاضل لاثانی سے نہ منقول ہوئے اور نہ ان کی تحقیقات سے وہ معانی مستنبط ہو سکتے ہیں تو وہ شخص خداوند عالم کا مجرم ہے۔ اور يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۔ اور يريدون ان يبدّلوا كلام الله کا مصداق ہونے کے باعث اصول شریعت کی رو سے ملحد و زندیق ہے۔

مراتب تفسیر

اصول تفسیر کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراتب تفسیر پانچ اقسام میں منحصر ہیں

قسم اوّل یہ کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعہ کی جائے۔ کیونکہ قرآن کریم میں بعض اشیاء اور احکام و واقعات کا ذکر مکرر ہوتا ہے کسی مقام پر اگر کوئی شئے اجمال کے ساتھ بیان کی گئی تو وہی چیز دوسرے موقع پر کتاب اللہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے تو اس طرح جو آیات مجمل ہیں ان کی تفسیر واضح اور مفصل آیات سے ممکن ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ حق تعالیٰ کی ہمکلامی کا واقعہ اور ان کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لئے روانگی کا امر اور فرعون کی اس پر سرکشی سورۂ والنازعات ایک عجیب اختصار کے رنگ میں مذکور ہے۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى اِذْ نَادَاهُ

(اے پیغمبر) کیا آپ کو پہنچا ہے قصہ موسیٰ (علیہ السلام) کا

ربہ بالواد المقدس طوی اذھب الیٰ فرعون انہ طغیٰ فقل ھل لک الیٰ ان تزکّٰی واھدیک الیٰ ربّک فتخشیٰ فاراہ الآیۃ الکبریٰ فکذّب وعصیٰ۔ الآیات (والنازعات ۳۰)

جبکہ پکارا ان کو ان کے رب نے ایک میدان مقدس "طوی" میں کہ (اے موسیٰ) جا فرعون کی طرف کیونکہ اس نے بہت ہی سرکشی اختیار کر رکھی ہے (اور) پھر کہہ (اس سے کہ) کیا ہے کچھ خیال تیرا اس بات کے لئے کہ تو پاکی اختیار کرلے (اور مالک حقیقی کی اطاعت کرتے ہوئے سنور جائے) اور راستہ بتاؤں میں تجھ کو تیرے رب کا تاکہ تو اس سے ڈرنے لگے تو (حضرت) موسیٰ (گئے اس کے پاس اور پھر انھوں) نے دکھایا اس کو ایک بڑا معجزہ اور نشانی مگر اس نے جھٹلایا اور نافرمانی پر قائم رہا الخ

اب ان چند کلمات میں مناجات خداوندی اور حضرت موسیٰ کا فرعون کے پاس تبلیغ کے لئے جانا پھر اس کے سامنے آیات (معجزات) میں سے آیت کبریٰ کا ظہور ہونا اس پر اس کا تکبر و غرور سے انکار کرنا اور ایمان نہ لانا بیان کردیا گیا۔ انہی اجزاء واقعات کو قرآن نے بسط اور تفصیل کے ساتھ کلام اللہ کے دوسرے متعدد مواقع میں بیان فرمایا کہ کس کیفیت کے ساتھ حق تعالےٰ کے ساتھ ہمکلامی ہوئی اور کب ہوئی۔ اس وادی مقدس میں کیا تلاش کرنے گئے تھے اور خدا کی طرف سے کیا کیا نعمتیں ملیں۔ فرعون کو کس طرح ایمان کی دعوت دی اس نے کیا جواب دیا۔ کس قسم کی مناظرانہ گفتگو ہوئی معجزہ کس شان و شوکت سے ظاہر ہوا۔ اور جو معجزہ خداوندی کا مقابلہ کرنے کو آئے تھے ان پر کیا ثمرات مرتب ہوئے۔ فرعون کی شقاوت و بدبختی نے اس کو کس نوبت تک پہنچایا اور جن کے دلوں میں ایمان کے انوار سما چکے تھے وہ کیسے پہاڑ کی طرح ایمان پر قائم رہے غرض یہ تمام اجزاء بالخصوص سورۂ اعراف، یونس، ہود، ابراہیم، طٰہٰ، مؤمنون، الشعراء، النمل القصص، حٰم، المؤمن اور سورۂ دخان میں اس وضاحت و تفصیل سے ذکر کئے گئے کئی کئی رکوع مسلسل اسی بیان میں چلتے رہے۔

قسم ۲ ثانی یہ کہ تفسیر قرآن سنت نبوی کے ذریعہ کی جائے۔ کیونکہ درحقیقت کلام اللہ کے لئے اصل شارح اور کامل تفسیر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ آپ کی تمام تر سیرت مبارکہ قرآن کی عملی تشریح ہے۔ خود قرآن نے یہ بات معین کردی اور بار بار اس کی تصریح کردی ہے کہ آپ کی حیات مبارکہ ہی کے ذریعہ قرآن کی اتباع و پیروی ممکن ہے۔ ارشاد فرمایا۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم

اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف ذکر (قرآن) کو تاکہ آپ واضح کریں لوگوں کے سامنے وہ چیز جو ان کی طرف اتاری گئی

ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا

وہ حق تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک

علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

رسول انہی امیوں میں سے کہ تلاوت کرے وہ ان پر اللہ کی آیات اور ان کا تزکیہ و تطہیر کرے اور ان کو کتاب وحکمۃ کی تعلیم دے۔ اور یقیناً وہ لوگ اس پیغمبر کی بعثت سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ اور آپ کی عملی زندگی کے بارہ میں دریافت کیا تو جواب میں فرمایا کان خُلُقُہ القراٰن کہ آپ کی حیات مبارکہ بس عین قرآن ہے۔ قرآن علمی کتاب ہدایت ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کی تفسیر و تشریح اور عملی پیکر ہدایت ہے

شیخ جلال الدین سیوطی رح نے الاتقان میں امام شافعی رح کا قول نقل کیا ہے

کل ما حکم بہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فھو مما فھم من القراٰن قال تعالیٰ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللہ۔ وقال تعالیٰ وما انزلنا علیك الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون۔

کہ جو بھی کوئی فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ وہی ہے جو آپ نے قرآن سے سمجھا۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے "بے شک ہم نے اتارا آپ کی طرف کتاب کو حق کے ساتھ تاکہ آپ فیصلہ فرما دیں لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ آپ کو سمجھائے۔ اور فرمایا اور نہیں نازل کی ہم نے آپ پر کتاب مگر صرف اسی لئے کہ آپ بیان کردیں ان لوگوں کے روبرو وہ چیز جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور یہ قرآن ہدایت و رحمت ہے اہل ایمان کے واسطے۔

قسم ۳ ثالث :۔ تفسیر صحابہ ہے۔ کہ اگر کسی آیت کی تفسیر حدیث مرفوع میں نہ ہو پھر آثار صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ تفسیر کا سب سے اعلیٰ درجہ تو وہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی ہے لیکن اس کے بعد درجات تفسیر میں صحابہ کی تفسیر کا درجہ ہے کیونکہ یہی حضرات قرآن کے سب سے پہلے مخاطب ہیں انہی کے سامنے وحی اترتی تھی اور تازہ تازہ وحی الہٰی کی شرح زبان نبوت سے ان کے کان سنتے تھے۔ ان کے قلوب انوار نبوت سے منور تھے۔ علم راسخ رکھتے تھے۔ قلوب طہارت و تقویٰ سے معمور تھے۔ امت میں یہی گروہ سب سے زائد افضل گذرا اس لئے ان سے بہتر قرآن کا کون سمجھنے اور سمجھانے والا ہو سکتا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس مقدس گروہ کے اوصاف نہایت ہی لطیف تعبیر کے ساتھ بیان فرمائے۔

اولئك اصحابُ محمدٍ صلے اللہ علیہ وسلم کانوا افضل ھذہ الامۃ وابرھا قلوبًا واعمقھا علمًا واقلھا تکلفًا اختارھم اللہ

یہ لوگ اصحاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو اس امت کے افضل ترین حضرات تھے۔ امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ دل تھے اور سب سے زائد گہرا علم رکھنے والے

لصحبة نبیہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوا علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔

اور کم سے کم تکلف والے (بلکہ نام و نشان بھی تکلف کا نہ تھا) جن کو پسند کیا اور منتخب کیا اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مرافقت کے لئے اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لئے اس لئے اے لوگو! تم ان کی فضیلت و برتری کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ہوسکے تم ان کے اخلاق اور طریقوں کی پیروی کرو۔ کیونکہ وہ حضرات ہدایت اور سیدھے طریقہ پر تھے۔

اس لئے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کی تفسیر کے مقابلہ میں کوئی تفسیر قابل اعتبار بلکہ قابل اعتنا[۱] بھی نہ ہوگی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عملی کمالات میں یہ امور دخیل ہیں۔ علم کا عمق اور اس کا رسوخ۔ قلب کی طہارت۔ تکلف و تصنع سے اجتناب (نہ یہ کہ اپنے علمی وصف پر غرور و ناز ہو اور اپنے بالمقابل دوسروں کو حقیر جانے) اعتقاد حق پر قائم ہونا۔ اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہمہ وقت مستعد و تیار رہنا اور اپنی زندگی اسی پر گذارنا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو علم کے صحیح اور اہل علم کے مستند ہونے کے لئے معیار و بنیاد ہیں جس کی زندگی ان اوصاف کا مظہر ہوگی اس کو حق ہوگا کہ وہ کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے ارادہ کرے۔ محض لغت دانی یا تاریخ میں مہارت پر بھروسہ کرتے ہوئے انسان کا یہ سمجھ لینا کہ وہ تفسیر قرآن کا اہل ہے یہ اس کی غلطی ہے۔

درسگاہ نبوت کے پہلے تلامذہ کی پیروی ان کے نقش قدم پر چلنا ان کے کمالات سے متصف ہونے کی جدوجہد علوم الہیہ کے حصول کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ ورنہ تو پھر قرآن فلسفہ یا منطق کی کوئی کتاب ہوجائے گی یا صرف تاریخی مجموعہ بن کر رہ جائے گا۔

قسم رابع :۔ ان امور کا بیان کرنا ہے جو لغت اور قواعد عربیہ سے متعلق ہوں اس سے مراد کلام اللہ کے وہ اسرار و لطائف ہیں جن سے اعجاز قرآن نمایاں اور معلوم ہوں سنت رسول اللہ اور اقوال صحابہ سے قرآن کریم کا اصل مدلول ثابت ہونے کے ساتھ تفسیر کا یہ پہلو قواعد عربیہ سے متعلق ہے (جس کی قدرے تفصیل وجوہ اعجاز کے بیان میں گذر چکی اس کی مراجعت فرمالی جائے)

قسم خامس :۔ تفسیر کی وہ قسم ہے جو وجوہ مذکورہ میں سے کسی ذریعہ سے بھی ثابت اور متعین نہ ہو۔ بلکہ اہل علم اور حضرات مفسرین اس میں مختلف ہوں جیسے مقطعات قرآنیہ (یعنی وہ حروف ہجائیہ جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں) کہ ان کی کوئی تفسیر کسی قطعی اور یقینی دلیل سے ثابت نہیں کہ اس پر جمہور مفسرین اور اہل علم اتفاق کرتے ہوں۔ اور اسی طرح آیت "وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ" میں روح کی تفسیر اور اس کا حقیقی مفہوم کسی دلیل سے متعین نہیں اور تمام متشابہات جو قرآن میں مذکور ہیں ان پر سکوت و توقف کا حکم دیا گیا۔

[۱] یعنی قابل توجہ ۱۲

اور غور و خوض بحث و مباحثہ کی ممانعت فرمادی گئی۔ فرمایا گیا۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اور ارشاد فرمایا۔

اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔

بہر حال وہ لوگ جنکے دلوں میں کجی ہے وہ تلاش میں لگتے ہیں۔ قرآن میں متشابہ کی فتنہ کے لئے اور اس کی (بلا دلیل) تاویل تلاش کرتے ہوئے حالانکہ نہیں جانتا متشابہ کی تاویل کو کوئی بھی سوائے اللہ کے اور وہ لوگ جو راسخ ہوتے ہیں اپنے علم میں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس پر ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے

اس نوع کے ماتحت دو قسمیں داخل ہیں ایک قسم وہ کہ جس میں غور و خوض اور بحث مباحثہ نہایت ہی خطرناک ہے جیسے صفات خداوندی اور متشابہات۔ مثلاً الرحمٰن علی العرش استویٰ" کی تفسیر۔ امام مالکؒ سے اس کی تحقیق کی گئی تو اس پر سکوت فرمایا۔ سائل جب متعدد بار دریافت کرتا رہا تو فرمایا الاستواءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ۔ کہ استوار علی العرش معلوم اور یقینی ہے کیفیت مجہول ہے اور کیفیت استوار کی تحقیق و تفتیش بدعت ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے کہ جو اس سے کم ہے۔ اور اس قسم میں تحقیق و تفتیش اس درجہ خطرناک یا ممنوع نہیں جیسے کہ قسم اول میں مثلاً اس درخت کی تعیین میں کلام جو آدم علیہ السلام نے کھایا تھا اور اس کے نام کی تحقیق یا اصحاب کہف کے اسمار یا اسی طرح اور جو امور قرآن میں مبہم اور مجمل طریقہ پر ذکر کر دئے گئے اگرچہ ان امور کی تعیین میں کوئی صحیح الاسناد روایت بھی منقول نہیں لیکن بایں ہمہ ان امور پر کلام و تحقیق ممنوع بھی نہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ ابن النقیب سے نقل کرتے ہیں کہ علوم قرآن کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو کتاب اللہ کے وہ اسرار جن پر اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو مطلع نہیں فرمایا اور اپنے ہی علم کے ساتھ ان کو مختص رکھا بمثلاً حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے غیب کی حقیقت ان امور پر غور و خوض اور تحقیق کسی کے لئے بھی درست نہیں جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا لا تدرکہ الابصار۔ کہ انسانی نگاہیں (اور افکار) اس کا ادراک نہیں کر سکتیں

قسم ثانی۔ کتاب اللہ کے وہ اسرار و حکم جن پر حق تعالےٰ نے صرف اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا۔ ان اسرار و رموز پر کلام صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا جس کو اللہ اجازت دے دے بس اسی کے لئے جائز ہے۔ جیسے مقطعات قرآنیہ (سورتوں کے شروع میں الٓمٓ الٓمٓرٰ حٰمٓ وغیرہ جیسے کلمات کے معانی)۔

قسم ثالث وہ تمام علوم جو اللہ نے اپنے پیغمبر کو سکھائے (عالم کی ہدایت اور فلاح و کامیابی کے لئے) ان علوم میں بعض تو نقل اور روایت پر موقوف ہیں جیسے اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کی معرفت۔ حشر و نشر جزا و سزا جنت و جہنم اور تمام اعتقادی اور تعبدی احکام یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح ثابت

اور منقول ہیں ان پر اسی طرح یقین کرنا لازم ہے۔ اور بعض امور وہ ہیں جو روایت اور نقل پر مبنی نہیں جیسے وہ تمام دلائل جو نظر و فکر سے تعلق رکھتے ہوں اور حق تعالیٰ کی خالقیت اس کی توحید و ربوبیت پر دلیل و برہان ہوں تو اس قسم کے دلائل روایت اور نقل پر موقوف نہیں ہیں۔ اسی پر حق تعالیٰ نے نظر و فکر کی دعوت دی اور اسی واسطے دلائل قدرت کا ذکر فرمایا گیا تاکہ ان کے ذریعہ معرفت ربوبیت حاصل ہو تو احکام اور اصول دین میں اتباع سنت کو ضروری قرار دیا گیا اور دلائل قدرت میں اہل نظر کو نظر و فکر کی دعوت دی گئی۔

بحث شان نزول

شان نزول یا اسباب نزول آیات قرآنیہ سے تعلق رکھنے والے ان واقعات کو کہا جاتا ہے جو آیات کے نازل ہونے کا سبب بنے۔ نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل سبب اور شان نزول تو بندوں کی حاجت اور ضرورت ہے جس کے لئے خدا نے قرآن کریم نازل فرمایا مگر بسا اوقات چونکہ خارج میں کوئی خاص واقعہ بھی پیش آیا ہوا ہوتا ہے جس پر وہ آیت نازل ہو جاتی ہے۔ اصطلاح مفسرین میں اسی قسم کے امور کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے خاوند کے بارہ میں کچھ عرض کرنا اور اس پر قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللّٰہ آیت کا نازل ہونا یا مثلاً بدر کے قیدیوں کے بارہ میں آنحضرت کا صحابہ سے رائے لینا کہ قتل کیا جائے یا فدیہ قبول کر کے آزاد کر دیا جائے۔ اس پر صحابہ کی مختلف رائے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طبعی رأفت و رحمت کی بنا پر فدیہ لے لینے کی طرف مائل ہونا۔ اور اس پر آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ الخ نازل ہونا۔ اس حیثیت سے بطور اسباب نزول کتب تفسیر میں سند صحیح کے ساتھ واقعات محدود طور پر منقول ہیں جن کو حضرات محدثین نے نقل کیا ہے بعض مفسرین کی ہر آیت کے لئے شان نزول کے بیان کی پابندی اور التزام ایک تکلف ہے جیسے کہ محمد بن اسحٰق کلبی نے اس میں غلو کیا۔ اسی لئے اکثر مفسرین شان نزول کے بیان کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے البتہ جن مقامات پر آیت کی تفسیر بیان واقعہ پر موقوف ہے اس جگہ توضیح آیت کے لئے واقعہ کا بیان کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے مثلاً واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ اور اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا واللہ ولیھما۔ اور اسی طرح کی وہ آیات جن کا اصل مدلول ہی بیان واقعہ ہے

شان نزول سے متعلق واقعات کا ثبوت اگرچہ سند صحیح سے ہو لیکن باتفاق جمہور مفسرین آیت کا مضمون اس واقعہ کے لئے ہرگز مخصوص نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار کرتے ہوئے وہ آیت ایک قانون عام

کے درجہ میں سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً آیات لعان اگرچہ ایک خاص واقعہ پر نازل ہوئیں لیکن ان کا حکم قیامت تک کے لئے عام ہے۔ مسافر کے لئے قصر صلوٰۃ کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی فلیس علیکم ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم۔ عمر فاروق نے ایک بار عرض کیا یا رسول اللہ اب تو ہم لوگ پورے مطمئن ہیں اور خوف کا کوئی نام و نشان نہیں کیا اب بھی نماز کا قصر کریں آپ نے فرمایا یہ تو اللہ کی طرف سے ایک صدقہ ہے اس کو قبول کرو۔ تو آپ نے واضح فرما دیا کہ یہ قید اتفاقی ہے قرآن نے اس وقت کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو ذکر کر دیا تھا ہمیشہ کے لئے حکم اس قید کے ساتھ مقید نہیں۔ صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت ایک خاص غزوہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جو سفر صحابہ کو درپیش تھا اس میں ہوئی لیکن اس کا حکم ہمیشہ کے لئے برقرار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی حکم کے لئے شرط نہ تھی۔ متقدمین صحابہ اور تابعین کے دور میں شان نزول کے مفہوم میں بہت توسع ملحوظ رکھا جاتا اور جو واقعہ درحقیقت آیت کا سبب نزول ہے اسی کو شان نزول کہنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ جن چند امور پر آیت صادق آتی ہے اگرچہ وہ امور نزول آیت ہی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے ہوں۔ ان کو بھی شان نزول کہدیتے تھے۔ کسی مقام پر آنحضرت نے کسی امر کی تفہیم و تشریح یا استنباط کے لئے اس آیت کو تلاوت فرمایا تو اسی کو شان نزول کہدیا۔ یا کسی آیت کو استدلال و محاجہ کے طور پر تلاوت کیا گیا تو اسی کو کہدیا گیا کہ یہی اس آیت کا شان نزول ہے۔ اور "نزلت فی کذا" کے عنوان سے ذکر کر دیا۔ محققین اور مفسرین اپنی تفاسیر میں اس امر پر بھی نظر رکھتے ہیں کن مواقع میں شان نزول حقیقی اور واقعی اعتبار سے کہا جا رہا ہے اور کن مواقع میں باعتبار توسع اطلاق ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات شان نزول کے بارہ میں صحابہ کے اقوال متعدد اور مختلف منقول ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ بعض آیات قرآنیہ میں کسی امر کلی کی توضیح و تفہیم کے لئے کچھ کلمات ایسے مذکور ہوتے ہیں کہ جن کی سطح سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اس وجہ سے بعض مفسرین اس کے درپے ہوتے ہیں کہ واقعہ متعلقہ کی تفصیل معلوم ہونی چاہئے حالانکہ الفاظ کلام اللہ کی غرض کسی امر جزئی اور مخصوص واقعہ کی خبر دینا نہیں ہوتا بلکہ ایک مقصد عام اور امر کلی ہوتا ہے تو اس تکلف کی وجہ سے بسا اوقات کلام اللہ کے حقیقی مقصد کا فوت ہونا لازم آجاتا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر قرآن میں انسان کی نیکی اور بدی کی حالتوں اور اس پر مرتب ہونے والے اچھے اور برے نتائج کو بیان فرمایا۔

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا۔

ہم نے حکم دیا ہے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا اسکی ماں نے اٹھایا اس کو حالت حمل میں سختی کے ساتھ اور جنا بھی اسکو سختی کے ساتھ

اور اسی طرح آیت ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً - اور آیت كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ اور آیت وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ اور آیت وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اور آیت هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا الآیۃ۔ ان سب آیات کا مقصود عمومی اور کلی امور کو بیان کرنا ہے۔ اگرچہ ان آیات کے ماتحت مفسرین واقعات ذکر کرتے ہیں لیکن سنداً ان کو صحیح نہیں کہا جا سکتا بلکہ آخری آیت کے تحت بیان کردہ قصہ تو شریعت کے اصول موضوعہ اور مقاصد کے خلاف ہے۔ جس میں حضرت آدم اور حوا سے ایک مشرکانہ فعل کے صدور کو ذکر کیا گیا ہے۔ جو انبیاء علیہم السّلام شانِ عصمت کے منافی ہے۔

صحت تفسیر کے اصول اور تفسیر بالرائے

قرآن کریم کی تصریح سے یہ امر تو معلوم ہو چکا کہ کلام الٰہی کی اصل شرح اور تفسیر اسوۂ نبوی ہے۔ اور اس تصریح نے یہ چیز متعین اور ثابت کر دی کہ کلام اللہ کی تفسیر ہر ذوق اور ہر مختلف طبقہ اور ہر نوع کے افکار و آراء کے حوالہ نہیں کی گئی کہ جو طبقہ جو کچھ چاہے اپنے ذوق اور خیالات پر اس کو ڈھال لے۔ اور جو شخص جس نوع کے اعتقاد و رجحانات رکھتا ہو وہ اسی کی طرف کھینچنے لگے۔ اگر بالفرض والتقدیر ایسا ممکن ہوتا تو قرآن کا کوئی مفہوم ہی قیامت تک متعین نہ ہو سکتا۔ اس لئے اس قسم کی کشاکشی اور افکار و اذہان کے باہمی تصادم کو ختم کرنے کے لئے حق تعالےٰ نے اپنے کلام کے لئے خود اپنی ہی طرف سے ایک ایسا شارح مقرر کر دیا کہ جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ گو ظاہر میں زبان پیغمبر سے بولا جا رہا ہے لیکن درحقیقت وہ اسی رب العالمین کی طرف سے ہے جس نے خود قرآن نازل فرمایا۔

اس لئے یہ تو امکان نہ رہا کہ ہر شخص اپنی رائے اور اعتقاد و مسلک کے مطابق قرآن کی تاویلیں کرنے لگے۔ بلکہ دنیا کے ہر فرد کے لئے اسی ایک طریقہ کی پیروی متعین کر دی گئی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دیا۔

جو لوگ اپنی خواہشات اور منگھڑت خیالات کے مطابق قرآن کے معانی اور مطالب تجویز کریں اور اس کے حقیقی مفہوم کی پیروی ضروری نہ سمجھیں انہی کے بارہ میں یہ ارشاد خداوندی ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً -	کیا دیکھا اے مخاطب تو نے اس انسان کو جس نے اپنا معبود بنا رکھا ہے اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا اس کو خداوند عالم نے (اسکی بدبختی کی بدولت) باوجود اسکے علم کے اور مہر لگا دی

اللہ نے اس کے کان اور اس کے قلب پر اور ڈال دیا اس کی نگاہ پر پردا۔

صحت تفسیر کے لئے جو امور لازم ہیں ان کا انحصار بالاجمال اصول ذیل میں ہے۔

(۱) ہر آیت کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی روایت کردہ تفسیر کے مطابق ہو۔ یا تفسیر مرفوع اور اقوال صحابہ سے ماخوذ و مستنبط ہو۔

(۲) سیاق و سباق کے مطابق ہو۔

(۳) قواعد عربیہ اور اہل لسان کے استعمال کے موافق ہو۔

(۴) اصول شریعت (دین کے اصول موضوعہ) اور ان تمام قواعد کے مطابق ہو جو دین میں مقرر ثابت ہیں اور جن پر اعتقاد و ایمان لازم ہے۔

(۵) مقاصد قرآن کے ماتحت ہو۔

(۱) اس لئے کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر معتبر نہ ہو گی جو حدیث مرفوع اور صحابہ کی تفسیر کردہ روایات کے خلاف ہو۔ مثلاً "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" کی تفسیر میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہودیت و نصرانیت اور تمام ادیان سماویہ کی اصل ایک ہی چیز یعنی ایمان باللہ والیوم الآخر اور عمل صالح ہے اس لئے ان تمام مذاہب سماویہ کی صحیح شکل پر عمل کرتے ہوئے انسان نجات کا مستحق ہو سکتا ہے۔ نجات صرف اسلام ہی میں منحصر نہیں تو یہ تفسیر ایک کھلی ہوئی تحریف اور دین کے اصول موضوعہ کا انکار ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا فرمایا گیا ہے۔ اور ایمان باللہ کا مفہوم اصول شریعت سے پہلے ہو چکا ہے کہ توحید و رسالت پر ایمان لانا ہے۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت الا کان من اصحاب النار۔

کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگانی ہے کبھی نہیں ہو سکتا ایسا کہ کوئی یہودی اور کوئی نصرانی اس امت کا سنے میری بعثت کے متعلق اور پھر بھی وہ مر جائے اس حال میں کہ وہ ایمان نہ لائے اس دین پر کہ جو دین دیکر مجھے مبعوث کیا گیا تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ جہنمیوں میں سے ہوگا۔

تو آیت مذکورہ کی تفسیر اس طرح کرنا جس سے یہ مستفاد ہو کہ نجات اسلام کے علاوہ کسی دوسرے راستہ سے بھی ممکن ہے تفسیر نبوی کے صریح خلاف ہے۔ نیز قرآن کریم کی آیت ان الدین عند اللہ الاسلام اور آیت ورضیت لکم الاسلام دینا اس قسم کے مفہوم کو باطل قرار دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ صحت تفسیر کے جو دیگر اصول وضوابط ضروری ہیں ان کا فوت ہونا بھی لازم آتا ہے۔ اس بنا پر یہ تفسیر اصول شریعت کے اعتبار سے رد اور باطل سمجھی جائے گی۔

(۲) اور نہ وہ تفسیر معتبر ہوگی جس کا اعتبار و لحاظ کرنے سے کلام اللہ کے سباق اور سیاق (ماقبل اور مابعد) میں کوئی ربط باقی نہ رہے۔ جیسے کہ آیت فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ۔ (بقرہ) واقعہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ و السلام کی تفسیر میں یہ معنی آیت کے بیان کئے جائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا امر فرمایا گیا کہ چار پرندے مختلف پہاڑوں پر بٹھا دو۔ پھر ان کو آواز دو تو وہ تمہاری آواز پر مانوس ہو کر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے جس سے اس قسم کے مفسر یہ معنی مستنبط کریں کہ اگر وحشی اور بے عقل پرند چند دنوں کے انس اور تربیت سے ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہاری آواز پہچاننے لگے اور تمہارے حکم کی تعمیل کرنے لگے تو کیا دعوتِ حق سے انسانوں میں یہ تبدیلی نہیں ہو سکتی کہ وہ تربیت یافتہ ہو جائیں اور تمہاری تعلیم کو قبول کرلیں۔ تو یہ تفسیر قطعاً تحریف ہے جمہور مفسرین اور امت کے تمام علماء نے جو معنی آیت کے بیان کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پہاڑوں پر مختلف حصے کرکے رکھ دو۔ اور پھر اس کو آواز دو تو وہ تمہاری آواز پر قدرت خداوندی سے دوبارہ زندگی پاکر دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ تو اے ابراہیم ان کو دیکھ کر تم احیاء موتی کی کیفیت سمجھ لینا کہ اسی طرح سے حق تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرے گا جس کا کہ تم نے سوال کیا۔ اور اس منظر کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا تو اس مقام پر بجائے جمہور کی اس تحقیق کی پیروی کرنے کے یہ معنی تجویز کر لینا کہ پرندوں کو مانوس بنا کر ان کو آواز دو اور بلاؤ وہ تمہاری آواز پر دوڑتے چلے آئیں گے کلام اللہ کی آیات کے مفہوم اور اس مضمون میں ربط کو فوت کر دیتا ہے، اور اس مقصد کو فوت کر دیتا ہے جو اس موقعہ پر بیان کیا جا رہا ہے اور نہ ہی اس تفسیر پر مضمون کی کوئی خاص اہمیت اور عظمت باقی رہتی ہے۔

(۳) اور نہ وہ تفسیر معتبر ہوگی جو قواعد عربیہ اور اہل لسان کے استعمال اور ان کے اصول اور طریقوں کے خلاف ہو۔ جیسے "اضرب بعصاک الحجر" کے معنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ اور پتھر پر چڑھنا" بیان کئے جائیں کہ تم پہاڑ پر چڑھو وہاں تم کو چشمے بہتے ہوئے ملیں گے (استغفر اللہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے پانی کے چشموں کا نکلنا مراد نہ لیا جائے۔ تو یہ تفسیر قواعد عربیہ اور لغت اور استعمال اہل لسان کے خلاف ہے اس کے علاوہ پیغمبر خدا کے ہاتھوں سے جو ایک عظیم الشان معجزہ ظاہر کیا گیا اس سے انحراف واعراض اور انکار کرتا ہے۔ اور اقتضاء لغت کے خلاف ہونے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر کے خلاف ہے۔

(۴) اور نہ وہ تفسیر معتبر ہوگی جس سے اصول شریعت اور ان امور کا ابطال وانکار لازم آتا ہو جو شریعت میں طے شدہ ہیں۔ اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے مثلاً کسی تفسیر سے انکار معجزات حشر ونشر معاد جسمانی وزن اعمال

اور انکار وجود ملائکہ وشیاطین وغیرہ لازم آتا ہو۔ چنانچہ بعض لوگوں نے قرآن کریم کی تفسیر اسی لئے کی کہ ان تمام حقائق کا رد کیا جائے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت فرمایا اور ان پر دین کی بنیادیں قائم ہیں اس قسم کے محرفین کے نزدیک نہ جنت کوئی عالم ہے اور نہ اس کی وہ نعمتیں راحتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں جن کا ذکر قرآن نے کیا اور اسی طرح نہ جہنم کوئی عالم ہے اور نہ اس میں عذاب و آلام ہیں جن کو قرآن بار بار بیان کر رہا ہے۔

(۵) اور نہ وہ تفسیر معتبر ہوگی جس سے مقاصد قرآن کا فوت ہونا لازم آتا ہو جیسے کہ آیات قرآنیہ کو قرآن کے حقیقی مقاصد پر حمل کرنے کے بجائے اصول سائنس و فلسفہ اور صنعتی ترقیات و ایجادات پر حمل کیا جائے۔ اور اسی کا نام مقصد کائنات تجویز کر کے تمام آیات کو اسی رنگ پر ڈھالا جائے اور اس مفروض مقصد کائنات کی تشریح کو کلام اللہ کا مقصد قرار دے لیا جائے۔

غرض یہ وہ اصول خمسہ ہیں جن کی رعایت اور پیروی کرتے ہوئے تفسیر کرنا تمام ائمۂ محققین کے نزدیک لازم ہے۔ امت کے علماء اور مفسرین اسی کو تفسیر قرآن کہتے ہیں۔ اور ان اصول کے خلاف ہر تفسیر کو تفسیر قرآن کے بجائے تحریفِ قرآن سمجھتے ہیں۔

قرون اولیٰ میں معتزلہ اور فلاسفہ نے بعض روایات اور آیات میں جزئی طور پر اس قسم کی تاویلات اور تحریفات کی تھیں لیکن موجودہ زمانہ کے متنورین[1] اور مغربی علوم سے مرعوب ذہنیتیں پورے ہی قرآن کو علوم الٰہیہ سے دور اور جدا کر کے صرف ایک فلسفہ اور سائنس ہی کی کتاب بنانے کے درپے ہیں کہ قرآن اور سنت نے اسلام اور دین کے جو مقاصد اور حقائق متعین فرمائے وہ سب قرآن سے جدا کر کے سائنسی ترقیات قرآن کریم کا اصل موضوع بنا لیا جائے۔

تفسیر بالرائے کتاب اللہ میں تحریف ہے

حاصل یہ ہے کہ تفسیر کلام اللہ کے معتبر ہونے کے جو پانچ اصول بیان کئے گئے ان کی رعایت اور پابندی نہ کرتے ہوئے کسی آیت کی کوئی تشریح کرنا تفسیر بالرائے ہے۔

حافظ ابن کثیر مقدمۂ تفسیر میں بیان فرماتے ہیں۔

تفسیر القرآن بمجرد الرائے حرام لما روی ابن جریر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال من قال فی القرآن برأیہ او بما لا یعلم فلیتبوء مقعدہ من النار۔ وھکذا اخرجہ الترمذی والنسائی

کہ تفسیر قرآن محض رائے سے حرام ہے جیسا کہ ابن جریر نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن میں کوئی بات کہی اپنی رائے سے یا یہ کہ وہ بات کہی جس کو وہ نہیں جانتا تو اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہئے۔ اور اسی طرح اس روایت کو

---

[1] روشن خیال ۱۲

ورواه ابوداؤد۔ وقال الترمذی هذا حدیث حسن ۔ وروی ابن جریر عن جندب ان رسول الله صلے الله علیه وسلم قال من قال فی القرآن برأیه فقد اَخْطَاءَ رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وفی لفظ لهم من قال فی کتاب الله برأیه فَاَصَابَ فقد اَخْطَاءَ لانه قد تکلّف مالا علم له به وسلك غیر ما امر به۔ وهکذا سمّی اللهُ القَذَفَةَ کاذبین فقال فاذلم یأتوا بالشهداء فاولئك عند الله هم الکاذبون۔ ولو کان قد قذف من زنیٰ فی نفس الامر لانه اخبر بما لا یحلّ لهٗ الاخبار به انتهی کلامه (مختصراً)

نقل کیا ہے امام ترمذی، نسائی اور ابوداؤد نے اور امام ترمذی رح نے (اس کو ذکر کر کے) فرمایا یہ حدیث حسن ہے اور ابن جریر رض نے جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن میں کوئی بات کہی اپنی رائے سے تو اس نے یقیناً خطا کی روایت کیا ہے اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اور انہی حضرات کی روایت سے حدیث مذکور میں ایک لفظ یہ بھی ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ میں کوئی بات کہی اپنی رائے سے اور وہ بات درست بھی کہی تب بھی اس نے خطا کی۔ اس لئے کہ اس نے تکلف کیا اس امر کا جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اور وہ طریقہ اس نے اختیار کیا کہ جس کی اس کو اجازت نہیں دی گئی۔ اور اسی طرح اللہ نے بہتان لگانے والوں کو جھوٹا کہا اور فرمایا کہ پس جبکہ وہ گواہ نہ پیش کر سکیں تو وہ خدا کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ اگرچہ جس شخص نے مثلاً کسی کو زنا کے ساتھ متہم کیا اور اس نے فی نفس الامر زنا کیا بھی ہو لیکن پھر بھی (قانوناً) اس کو جھوٹا کہا گیا کیونکہ اس نے وہ چیز بیان کی جس کا بیان کرنا اس کے لئے حلال نہ تھا۔

امام قرطبیؒ ابو بکر انباریؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عباسؓ میں نہ جانے ہوئی بات کہنے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ مشکلات قرآن کے حل اور تفسیر میں ایسی کوئی چیز بیان کی جو صحابہ اور تابعین سے ماثور نہیں اور نہ ہی ان کے اقوال سے وہ مستنبط ہے۔ تو اس قسم کی تفسیر کرنے والا اللہ کی ناراضگی کا نشانہ بنتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو شخص قرآن میں ایسی بات کہے جو جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے اور یہ بات خلاف حق ہے تو ایسی تفسیر پر اس کو اپنا ٹھکانا جہنم بنالینا چاہیے۔

اور فرمایا کہ حدیث جندب کی شرح میں سلف نے یہی مراد بیان کی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں کوئی قول اپنی خواہش کے موافق ایسا اختیار کرے جس کا کوئی ماخذ متقدمین کے اقوال اور صحابہ کی تفاسیر میں نہ ہو تو فی نفسہ

یہ بات اگرچہ صحیح بھی ہو لیکن بایں ہمہ یہ خطا ہے کیونکہ اس نے قرآن کے بارہ میں بلا اصل اور بنیاد کے ایک فیصلہ کیا حالانکہ قرآن کی تفسیر میں ہر بات سند کے ساتھ معتبر ہوسکتی تھی جو اہل اثر اور اصحاب روایت کی نقل پر مبنی ہو۔ بے ثبوت اور بلا اصل کوئی قول کسی باب میں بھی حجت اور سند کا درجہ نہیں رکھتا۔

کسی زمانہ کا کوئی واقعہ یا کسی شخص کی کوئی حکایت بھی اگر بیان کی جاتی ہے تو اس کے اعتبار کے لئے سب سے اول اس کی نقل اور قابل اعتبار ہونے کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے تو کلام اللہ کی شان تو سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے لامحالہ ہر اس قول کے لئے محکم ثبوت کی ضرورت ہے جس کو کہا جائے کہ یہ اللہ کی مراد ہے۔ ابن عطیہ سے منقول ہے کہ اس سے مراد اس شخص کی تفسیر ہے جو کلام اللہ بیان کرتے ہوئے صحابہ کے اقوال و تفاسیر کو پیش نظر رکھے۔ اور نہ اصول شریعت اور قواعد عربیہ کی رعایت کرے۔ ظاہر ہے کہ اس ممانعت میں اہل لغت اور ارباب بلاغت کی لغوی تحقیقات یا لطائف عربیہ اور اسی طرح فقہاء مجتہدین کا احکام فقہیہ کا استنباط داخل نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب امور اصول و قواعد پر مبنی اور سلف صالحین کی تفاسیر ہی سے ماخوذ ہیں۔

امام قرطبی یہ متعدد اقوال نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا منشاء انسان کا اپنے معتقدات اور خیالات کی جانب رجحان ہوتا ہے فطرۃً خیالات کا رجحان انسان کو اپنی خواہشات کی جانب مائل کرتا ہے۔ اور یہ جذبات اس کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ آیات کو اپنے ذوق اور خیالات کے موافق بنائے۔ تو اس صورت حال میں کبھی تو ایسا ہوگا کہ آیات قرآنیہ کے مفہوم کی تحقیق اور تعیین میں خیالات کی آمیزش غالب آجائے گی اور خود بخود اس کا ذہن اور فکر اسی جانب مائل اور متوجہ ہوگا جو خود اس کا ذاتی ذوق اور اختیار کردہ غلط مسلک ہے۔ اور کبھی یہ ہوگا کہ دیدہ دانستہ تلبیس کرے گا اور قرآن کو طرح طرح کے تکلف کر کے اپنے خیال اور خواہش کی طرف پھیرے گا۔ جیسے کہ اہل بدعت آیات کی ایسی بعید از قیاس تاویلات کرتے ہیں جس سے مقصد اپنی اختیار کردہ بدعات کی تائید حاصل کرنا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی نہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ درحقیقت آیت سے تو اہل حق کا ہی مسلک ثابت ہو رہا ہے۔ محض عناد اور اپنی خواہشات کی پیروی میں تاویلات بعیدہ کرتے ہیں تاکہ اپنے مقابل پر حجت قائم کر سکیں۔ اور ان تاویلات سے آیات الٰہیہ کو اپنے خیال اور ذوق کے موافق بنا دیں۔

بہرکیف یہ دونوں صورتیں تفسیر بالرائے کی ہیں۔ اول صورت جہل عن الحق اور ضلال (گمراہی) کا درجہ ہے اور دوسری شکل تلبیس اور کتمان حق (یعنی باطل کو بررنگ حق ظاہر کرنے اور حق کو چھپانے) کی ہے[1]۔

یہود کے اسی بے ہودہ طرز کو قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا۔

---

[1] ملخص من احکام القرآن للقرطبی۔ ص۳۱ تا ص۳۴ ج ۱

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

اور بے شک ایک جماعت ان میں سے حق کو چھپاتی تھی حالانکہ وہ لوگ جاننے والے ہوتے تھے (کہ حق کیا ہے)

اور ارشاد فرمایا۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلاً فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۔

ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کچھ نوشتہ اپنے ہاتھوں سے اور پھر یہ کہتے ہیں یہ ہے اللہ کی طرف سے تاکہ حاصل کریں اس کے ذریعہ (دنیا کا) ثمن قلیل۔ پس افسوس اور ہلاکت اس نوشتہ کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور افسوس بربادی اس کمائی پر جو وہ کماتے ہیں۔

اہل کتاب میں سے تحریف کرنے والوں نے تو اپنی منگھڑت چیزیں لکھ لکھ کر دعویٰ کیا کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اس امت کے محرفین یہ تو کر ہی نہیں سکتے کہ الفاظ وضع کر کے اس کو کلام الٰہی کہدیں چونکہ قرآن اللہ کا کلام قدیم اور نظم معجز ہے۔ اس کی حفاظت کا وعدہ حق تعالیٰ فرما چکا تو لفظی تحریف کا امکان نہ رہا البتہ معنوی تحریف کا بظاہر امکان رہا تو اس امت کے محرفین نے کلام اللہ کے منگھڑت معنی تجویز کر کے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ ہے اللہ کی مراد۔ اگرچہ محرفین کی یہ تدبیر اور تلبیس بین الحق والباطل کارگر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جس طرح الفاظ خداوندی محفوظ ہیں انشاء اللہ اسی طرح ان کلمات خداوندی کا مفہوم اور مدلول بھی تحریف و تلبیس سے محفوظ رہے گا۔ ہمیشہ حق اور باطل چھٹ کر عالم کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اللہ کی یہی سنت ہے لیمیز اللہ الخبیث من الطیب

قال ابن النقیب جملۃ ما تحصل فی معنی حدیث التفسیر بالرأی خمسۃ اقوال احدھا التفسیر من غیر حصول العلوم التی یجوز معھا التفسیر۔ الثانی تفسیر المتشابہ الذی لا یعلمہ الا اللہ۔ الثالث التفسیر للمذھب الفاسد بان یجعل المذھب اصلا والتفسیر تابعا فیرد الیہ بای طریق امکن وان کان ضعیفا۔ الرابع التفسیران مراد اللہ کذا علی القطع من غیر دلیل۔ الخامس

ابن النقیب بیان کرتے ہیں حدیث تفسیر بالرائے کی شرح میں جو اقوال مجموعی طور مفہوم اور حاصل ہوتے ہیں وہ پانچ ہیں۔ ایک یہ کہ تفسیر بالرائے یہ ہے کہ انسان ان علوم کے حاصل ہوئے بغیر تفسیر کرے جن کے ساتھ تفسیر کرنا جائز ہے (اور بغیر ان علوم کے تفسیر جائز نہیں ہے) دوسرے یہ کہ ان متشابہات کی تفسیر جن کی (حقیقی) مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تیسرے یہ کہ مذہب فاسد اور باطل کی حمایت کے لئے تفسیر کرے جس کی صورت یہ ہو کہ اس مذہب کو اصل بنا کر تفسیر کو اس کے تابع کردے اور آیات کو اسی مذہب کی طرف پھیرے جہاں تک بھی اسکو اس امر کا امکان ہو خواہ کسی سند ضعیف ہی کے ذریعہ

التفسیر بالاستحسان الھویٰ ۔ کذا فی الاتقان (اس طرح کی تاویل بعید اختیار کرے ۔ چوتھے یہ کہ بلا دلیل اور سند کے دعویٰ کرے کہ حق تعالےٰ کی مراد یقیناً یہی ہے ۔ پانچویں یہ کہ خواہشات کے مطابق تاویل کرے اور جو امور اس کو پسند ہیں انہی کی طرف آیات کو راجع کرے ۔

یہی وہ چیز ہے جس کو خداوند عالم نے فرمایا ۔ ولا تقف مالیس لك بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئك کان عنہ مسئولا اور فرمایا ۔ ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدیً ولا کتاب منیر ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ لہ فی الدنیا خزی ونذیقہ یوم القیمۃ عذاب الحریق ۔

اللہ کے بارے میں جدال و خصومت کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ کی طرف اس کی منشاء اور دین کے خلاف ایسے امور کی نسبت کرے جس کو حق تعالیٰ پسند نہیں فرماتا ۔ گویا یہ امر نظری اعتبار سے اللہ تعالیٰ سے مقابلہ و خصومت کرنا ہے ۔ اور اللہ کے ساتھ جدال خصومت کرنے والا انسان اپنے رُخ کو حق سے پھیر کر باطل ہی کی طرف کرنے والا ہوتا ہے جس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو اللہ کے صحیح راستہ سے برگشتہ اور منحرف کر دے ۔ ایسے ظالموں اور خواہشات نفسانیہ کو اپنا معبود بنانے والوں کے متعلق خداوند عالم کا ارشاد ہے ۔

ومن اضل من اتبع ھواہ بغیر ھدیً من اللہ ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین ۔

اس سے زیادہ گمراہ اور کون شخص ہو سکتا ہے جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی بغیر اللہ کی کسی ہدایت کے بے شک اللہ تعالیٰ رہبری نہیں فرماتا ہے ظالموں کے لئے ۔

علامہ نظام الدین نیشاپوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ

یہ بات جان لینی چاہیئے کہ دیانت اور تقویٰ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ہر گز کوئی ایسی تاویل نہ اختیار کی جائے جن سے ان حقائق کا ابطال و رد لازم آتا ہو جن کی تفسیر و تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ و سلف صالحین نے کی جیسے معاد جسمانی حشر و نشر ۔ جنت و جہنم ۔ صراط و میزان اعمال ۔ حور و قصور ۔ انہار و اشجار وغیرہ بلکہ لازم و ضروری ہے کہ ان حقائق کو انہی کیفیات کے ساتھ برقرار رکھا جائے جس کیفیت کے ساتھ ان کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان حقائق کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے بعض لطائف رموز و اشارات کے درجہ میں مستنبط ہوں تو ان کو اختیار اور ذکر کر لیا جائے ۔ تو متقدمین کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ۔ اس نوع کے رموز حضرات صوفیاً کی تفاسیر میں منقول ہوتے ہیں وہ محض تمثیل اور ایک اشارہ کا درجہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے عالم کائنات میں جو چیز بھی حقیقت واقعیہ کے ساتھ خارج اور نفس الامر (عالم صورت) میں پیدا فرمائی ہے اس کی کوئی نہ کوئی مثال اور نظیر عالم معنیٰ میں بھی ہوتی ہے (انتہیٰ) بلکہ عالم معنیٰ میں تو انسان کے اعمال و افعال کی بھی مثالی صورتیں ہوتی ہیں جس کا قرینہ وہ حدیث ہے جس میں یہ فرمایا گیا

کہ مردِ صالح اور مؤمن کے لئے قبر میں سوال و جواب کے بعد ایک نہایت حسین و جمیل شکل ظاہر ہو گی۔ اس پر یہ شخص صالح دریافت کرے گا کہ تو کون ہے۔ تیرا چہرہ تو خیر کی مخبری کر رہا ہے وہ شکل جواب دے گی " انا عملك الصالح " میں تو تیرا عمل صالح ہوں۔ اور شخص فاجر و کافر کے سامنے قبر میں نکیرین کے سوال کے بعد اسی طرح ایک شکل ظاہر ہو گی جو نہایت ہیبتناک ہو گی اس کو دیکھ کر یہ شخص فاجر دریافت کرے گا جواب یہ دیا جائے گا انا عملك الخبيث کہ میں تیرا عمل خبیث ہوں۔ غرض یہ حسین و جمیل اور قبیح و ہیبت ناک صورت اس کے اعمال کی تصویر ہو گی۔

بہر حال تفسیر بالرائے کی یہ چھٹی صورت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی وہ تشریح جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ثابت کردہ معنی کا ابطال لازم آتا ہو۔

تفسیر بالرائے سے ملحق یہ شکل بھی ہے کہ کسی آیت کے کوئی ایسے جدید معنی اختراع اور ایجاد کئے جائیں جس کی طرف نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا اور نہ صحابہ اور ائمہ متقدمین اور سلف صالحین میں سے کسی کا ذہن اس معنی کی طرف متوجہ ہوا۔ تو یہ تفسیر بھی اصول شریعت کے اعتبار سے الحاد اور زندقہ ہے۔ اس لئے کہ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ قرآن کے یہ معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اور ائمہ متقدمین پر جنھوں نے اپنی زندگیاں قرآن و حدیث کی خدمت میں صرف مخفی رہے۔ اور ناگہاں چودہ سو برس کے بعد یورپ کے ان متنورین پر معنی منکشف ہو گئے جو اپنی خواہشات اور اغراض باطلہ کی پیروی میں انبیاء و مرسلین کے مد مقابل ان کے مخالف بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے ثابت کردہ حقائق مٹانے کے لئے کبھی فلسفہ اور سائنس کا سہارا لے رہے ہیں اور کبھی ادیبانہ عبارتوں سے عوام الناس کے اذہان اور خیالات کو مرعوب و متأثر کر رہے ہیں۔

اصول دین سے یہ امر طے شدہ اور امت کے درمیان متفق علیہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک جو تفسیر اور کلام اللہ کی جو مراد متفق علیہ ہے اس سے عدول اور خروج بلا شبہ ضلالت و گمراہی ہے۔

اس زمانہ میں ان جدت طرازیوں کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ کمال نہیں بلکہ یہ تو ضلال ہے۔

خداوند عالم قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے جس طرح کہ خدا کے پیغمبر نے سمجھایا۔ اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرما کر ہمارے نفوس کا تزکیہ و تطہیر فرمائے جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی۔ آمین یا رب العالمین۔

تفسیر کلام اللہ میں حضرات عارفین کے اقوال

علامہ آلوسی رح فرماتے ہیں کہ صوفیا، اور عارفین کا کلام آیات قرآنیہ میں بطریق تفسیر نہیں ہوتا اس سے کہ تفسیر تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی بیان کردہ مراد کا نام ہے۔ بلکہ وہ تو صرف رموز و اشارات اور وہ لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر فائض فرماتا ہے۔ ارباب سلوک کے قلب باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں۔ اور ان پر تجلیات غیبیہ کا ورود ہوتا رہتا ہے تو گاہ بگاہ انکی زبان سے آیات کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف اور معارف جاری ہوتے ہیں جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف روحانی تلقین اور تفہیم غیبی ہوتے ہیں۔ یہ باطنی اشارات کلام اللہ کے اس مفہوم اور مدلول قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں گے جو اصول شریعت نبی کریم اور صحابہ کی تفسیر سے ثابت ہے اس لئے اگر ارباب تصوف سے کوئی ایسی چیز منقول ہو کہ جس سے ظاہر احکام شریعت اور حدود کا انکار لازم آتا ہو تو وہ ہرگز مقبول اور معتبر نہ ہوگی۔ قابل اعتبار صرف وہی لطائف و اشارات ہوں گے جن سے نہ احکام شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو۔ اور نہ ہی ایسے امر کا صراحةً یا دلالةً رد لازم آتا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی تفسیر سے ثابت ہے۔

حضرت حسن رضؓ سے مروی ہے۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لکل اٰیۃ ظھر و بطن و لکل حرف حد و لکل حد مُطلع۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آیت کے لئے ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے اور ہر حرف کے لئے ایک حد یعنی حکم شرعی ہوتا ہے اور ہر حکم شرعی کیلئے ایک اطلاع پانے کی جگہ ہوتی ہے (کتاب اللہ میں سے)

ابن النقیب رح بیان کرتے ہیں ظہر آیات سے وہ معانی ہیں جو اہل علم ظاہری علوم اور قواعد شریعت کے ذریعہ جانتے ہوں۔ اور بطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ارباب حقائق (اور عارفین) کو مطلع فرماتا ہے اور لکل حرف حد کے معنی یہ ہیں کہ ہر حرف کے معانی اور حقائق کا ایک منتہی ہوتا ہے جو بھی اللہ ارادہ فرمائے۔

یہی وہ اسرار و حقائق ہیں جن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔

ھو الذی لا تنقضی عجائبہ ۔ کہ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب و لطائف کبھی ختم نہ ہوں گے تو مدلول قرآنی تو آنحضرت اور صحابہ کی تفاسیر سے مقرر و متعین ہے جس میں ادنیٰ تغیر اور رد و بدل کا امکان نہیں۔ اس مدلول قطعی اور طے شدہ مفہوم (جس پر تمام احکام شریعت کا دار و مدار ہے) کے بعد باطنی اسرار و نکات اور معارف

کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ کتاب لطائف المنن میں بیان فرماتے ہیں کہ کلام اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و تشریح میں حضرات صوفیا اور عارفین کے بیان کردہ نکات اور اس قسم کے غرائب بیان کرنا کلام کو اس کے ظاہر مفہوم سے متغیر کرنا نہیں ہے اس لئے کہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی مراد ہوتا ہے جس پر آیت ناطق ہے اور وہ قواعد عربیہ اور اصول شریعت سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ غرائب محض رموز و اشارات اور باطنی تفہیم ہوتے ہیں جو غیبی طور پر اللہ کی طرف سے ارباب باطن پر القا کئے جاتے ہیں[1]۔

قاضی بیضاوی ؒ آیت "الذی جعل لکم الارض فراشًا والسّماءَ بناءً" کی تفسیر و تشریح فرمانے کے بعد آخر میں اسی نوع کے عارفانہ نکتہ کو بیان کرتے ہیں۔

ولعلہ سبحانہ وتعالیٰ اراد من الایۃ الاخیرۃ مع مادلّ علیہ الظاھر وسیق الکلام فیہ اشارۃ الی تفصیل خلق الانسان وما افاض علیہ من المعانی والصفات علی طریقۃ التمثیل فمثل البدن بالارض والنفس بالسماء والعقل بالماء وما افاض علیہ من الفضائل العملیۃ والنظریۃ المحصلۃ بوساطۃ استعمال العقل للحواس وازدواج القویٰ النفسانیۃ والبدنیۃ بالثمرات المتولدۃ من ازدواج القویٰ السماویۃ الفاعلیۃ والارضیۃ المنفعلۃ بقدرۃ الفاعل المختار فان لکل اٰیۃ ظھرًا وبطنًا ولکل حدٍّ مطلعًا[2]۔

اور شاید یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آیۃ اخیرہ (یعنی الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً) سے ارادہ فرمایا اس مدلول کے باوجود جس پر بظاہر کلام دلالت کر رہا ہے اور جس مقصد کے لئے کلام جاری فرمایا گیا اشارہ فرمانے کا تخلیق انسانی اور اس پر فائض کردہ اوصاف و معانی (اور اس کے فضائل عملیہ اور نظریہ) کی تفصیل کی جانب بطریق تمثیل۔ تو بدن انسانی کو تشبیہ دی گئی ارض (زمین) سے اور اس کے نفس کو سماء (آسمان) سے اور عقل کو ماء (پانی) سے اور انسان کو عطا کردہ فضائل عملیہ اور کمالات نظریہ کو جو حواس کے لئے استعمال عقل کے توسط اور قوائے نفسانیہ اور قوائے بدنیہ کے امتزاج و اختلاط سے حاصل ہوتے ہیں،، ان ثمرات سے تعبیر فرمایا جو کہ آسمان کی قوت فاعلیہ اور زمین کی قوت منفعلہ (قابلیہ) کے امتزاج کی وجہ سے فاعل مختار کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں (اور یہ اشارہ) اس لئے کہ ہر آیت کے لئے ظہر و بطن ہے اور ہر حکم کے لئے ایک اطلاع کا مقام ہے۔

بہرحال عارفانہ لطائف کا کلام اللہ سے استنباط ایسا ہی ہے جیسا کہ اس شعر سے حضرت علیؓ کا نام "علیؓ" اخذ کیا جاتا ہے۔ ؎ چشم بکشا زلف پُرشکن اے یار من ٭ بہر تسکین دل بریان من

---

[1] بحوالہ مفتاح السعادہ ۲۲۳/۲۔ [2] تفسیر بیضاوی ۴۳/۱

طبقات مفسرین

(پہلا طبقہ)

اصل شارح قرآن اور مفسرِ وحی الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ اس کے بعد طبقات مفسرین میں سب سے اعلیٰ طبقہ حضرات صحابہ کا ہے۔ اس لئے کہ امت میں یہی حضرات قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے جبریل امین تازہ بتازہ کلام الٰہی لیکر اُترتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کو پڑھاتے اور اس کے مقاصد و مطالب سمجھاتے تو ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ مضامین قرآن کا جاننے اور سمجھنے والا کون ہوسکتا ہے (جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا) ہر کلام کی حقیقی اور کامل مراد متکلم اور پھر مخاطب ہی سمجھا کرتا ہے۔ اس لئے بالعموم تمام صحابہ اس طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض صحبت سے ان کے قلوب منور تھے اور یہ استعداد و قابلیت پیدا ہوگئی تھی کہ امور غامضہ اور قرآن کے اسرار و لطائف سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں مگر اس وصف میں مشترک ہونے کے بعد باہم حضرات صحابہ کے اذہان اور قابلیتیں متفاوت اور گوناگوں تھیں۔ اس بنا پر تلاش اور تتبع سے یہ بات ظاہر ہے کہ طبقۂ صحابہ میں دس حضرات تمام صحابہ پر اس شان اور وصف تفسیر میں ممتاز و نمایاں اور دوسروں پر فائق تھے۔

خلفاء اربعہ (ابوبکر صدیقؓ، عمرؓ بن الخطاب، عثمانؓ بن عفان، علیؓ بن ابی طالب) عبداللہؓ بن مسعودؓ عبداللہؓ بن عباسؓ۔ ابیؓ بن کعبؓ۔ زیدؓ بن ثابتؓ۔ ابوموسیٰؓ الاشعریؓ۔ عبداللہؓ بن الزبیرؓ۔ خلفاء راشدین میں تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ دوسرے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ سے روایاتِ تفسیر بہ نسبت حضرت علیؓ کے کم منقول ہیں۔

ابوالطفیل سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت علیؓ کے روبرو حاضر تھا۔ وہ خطبہ دے رہے تھے دورانِ خطبہ فرمایا۔

سلونی فواللہ لاتسألونی عن شیءٍ الّا أخبرتکم وسلونی عن کتاب اللہِ فواللہ مامن آیۃٍ الّا وانا اعلم أبلیلٍ نزلت ام بنھارٍ ام فی سھلٍ أم فی جبلٍ۔

(اے لوگو!) دریافت کرلو مجھ سے (احکام دین) خدا کی قسم جو بھی کوئی چیز تم مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں بتا دوں گا۔ اور پوچھ لو تم مجھ سے کتاب اللہ (جو چاہو) خدا کی قسم کوئی بھی آیت ایسی نہیں کہ میں اس کو نہ جانتا ہوں کہ وہ رات میں اتری یا دن میں نرم اور ہموار میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑوں میں۔

---

۵ الاتقان ص۱۸۱ ج۲

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر آیت کے متعلق جانتا ہوں کہ وہ کہاں نازل ہوئی اور کب ہوئی اور کن لوگوں یا کس واقعہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ خدا نے مجھے ایک سمجھدار قلب اور تحقیق کرنے والی زبان (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے) عطا فرمائی ہے۔

ابن ابی حمزہ حضرت علی رضؓ سے بیان کرتے ہیں کہ فرمایا اگر میں چاہوں کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کو لاد دوں تو میں کر سکتا ہوں [۱]

خلفاء راشدین کے بعد ان دس حضرات میں سب سے فائق ترجمان القرآن حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو فائق ہونا ہی چاہئے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا آپ کے حق میں اللّٰھم علمہ الکتاب والحکمۃ والتاویل "علوم قرآن کے فہم میں سب سے فائق ہونے کی ایک کھلی ہوئی شہادت اور ضمانت ہے خود ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرے لئے ارشاد فرمایا نِعْمَ ترجمان القرآن انت [۲]

صاحب جواہر الحسان فرماتے ہیں کہ طبقۂ صحابہ کے درمیان صدر المفسرین حضرت علی بن ابی طالبؓ ہیں اور ان کے بعد درجہ عبداللہ بن عباس رضؓ کا ہے۔ اور عبداللہ بن مسعود رضؓ بھی ابن عباس کے بارہ میں فرماتے تھے وہ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے اسی علمی امتیاز اور تفوق کے باعث عمر فاروق رضؓ کی مجلس میں معمر صحابہ کے بالمقابل زائد بلند مقام رکھتے تھے بعضوں کو یہ امر محسوس ہوا اور اس کا اظہار کیا گیا تو فاروق اعظم نے سورۂ اِذَا جَاءَ

---

[۱] اس لئے کہ الحمد للہ رب العالمین کی شرح محتاج ہے حمد کے بیان معنی اور اللہ رب العزت کے اسم جلال کی تحقیق اور اس کی تنزیہ و تقدیس کی پھر ضروری ہے کہ عالم کے مفہوم کی وضاحت کی جائے اور ان کی وہ تعداد بھی جو ایک ہزار بیان کی جاتی ہے جن میں سے چار سو عالم خشکی میں اور چھ سو سمندر میں ہیں اس کی بھی تفصیل اور ان عالموں میں بسنے والی مخلوقات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ الرحمن الرحیم میں ان دونوں ناموں کی شرح ضروری ہے جس کے ضمن میں حق تعالیٰ کی صفات بھی بیان کرنا ہوگا اور صفات خداوندی ہیں جمال و جلال سے متعلق صفات کا بھی ذکر ہوگا اور تمام اسماء کے درمیان ان کے اختصاص کی وجہ۔ اس کے بعد مالک یوم الدین کی تفسیر قیامت اور قیامت کے جمیع احوال اور اہوال کی تفصیل۔ پھر ایاک نعبد و ایاک نستعین میں عبادت و استعانت کے معنی عبادت کے اقسام و انواع اور اسی طرح استعانت کے انواع و اقسام اور ان سے متعلق احکام کا ذکر ضروری ہوگا اور اسی طرح اھدنا الصراط المستقیم میں ہدایت کے معنی اور اس کے درجات بیان کئے جائیں گے۔ اس کے بعد آخری آیت میں انعام اور ضلال و غضب کی تحقیق ہوگی۔ اور اہل انعام اور اہل غضب و ضلال کے احوال کا بھی بیان ہوگا غرض یہ عنوانات اور مضامین اپنی تفاصیل کی مجزی کے لئے خود کافی ہیں ۱۲

[۲] بروایت مجاہد الاتقان ص۱۸۴ ج۲

نصراللہ والفتح کی تفسیر حضّار مجلس سے دریافت کی بہت سوں نے سکوت اختیار کیا کسی نے صرف ظاہری اور لفظی مراد بیان کرنے پر کفایت کی کہ حق تعالیٰ نے اپنی فتح و نصرت کی بشارت سنائی ہے اور اس پر حمد و پاکی کے بیان کا امر فرمایا۔ اور توبہ و استغفار کی طرف اپنے پیغمبر کو متوجہ فرمایا۔ ابن عباس نے بتایا کہ یہ سورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات ہے۔ ابن عباس کی اس علمی بصیرت اور تفسیر کلام اللہ میں مہارت کو دکھاتے ہوئے عمر فاروق نے فرمایا یہی امر باعث ہے اس نوعمر کی برتری اور فوقیت کا۔

ابن ابی ملیکہ کی اسناد سے مروی ہے کہ ابن عباس رض نے فرمایا ایک روز عمر بن الخطاب رضی اپنے اصحاب و رفقاء سے فرمایا کہ آپ لوگ آیت اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ الخ کی کیا مراد سمجھتے ہو۔ لوگوں نے کہا "اللہ اعلم" عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس پر غصہ آیا اور فرمانے لگے یا تو یہ کہو کہ ہم جانتے ہیں یا یہ کہو کہ ہم نہیں جانتے۔ ابن عباس عرض کرنے لگے میرے دل میں اس آیت کے کچھ معنی ہیں۔ اس پر فرمایا اے بھتیجے کہو اور اپنے کو حقیر نہ خیال کرو۔

ابن عباس نے بیان کیا کہ یہ آیت عمل کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت نے دریافت کیا کس قسم کے عمل کی؟ تو ابن عباس نے وضاحت و تفسیر کی کہ یہ اس تونگر و مالدار انسان کے عمل کی مثال ہے جو اللہ کی طاعت میں ایک عرصہ تک لگا رہا۔ پھر اس پر شیطان مسلط ہو گیا اور معصیتوں میں مبتلا ہو کر اس نے اپنے سارے اعمال کو برباد کر ڈالا۔

ابن عباس رض کی طرف تفسیر کے متعدد مجموعے منسوب ہیں تمام اسانید میں زائد معتبر سند تفاسیر ابن عباس کے لئے علی بن ابی طلحۃ الہاشمی کی ہے۔ احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ ان کی سند سے ایک صحیفہ مصر میں موجود تھا۔ حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ابو صالح کاتب اللیث محدث کے پاس تھا جس کو وہ بروایت معاویہ بن صالح بواسطہ ابو طلحۃ۔ ابن عباس سے روایت کرتے تھے۔ ابو جعفر نحاس اپنی کتاب ناسخ میں اسی سلسلہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری رح نے اپنی کتاب صحیح میں ابو صالح کی روایت سے اسی مجموعہ پر اعتماد کرتے ہوئے ابن عباس کی تفاسیر کو تعلیقات کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن ابی المنذر بھی متعدد وسائط کے ساتھ ابو صالح ہی کے سلسلہ سے ابن عباس کی روایات لاتے ہیں ؎۔

بعض حفاظ محدثین کا خیال ہے کہ علی بن ابی طلحہ کو براہ راست ابن عباس سے سماع نہیں ہے۔ بلکہ ابن عباس اور ان کے درمیان مجاہد یا سعید بن جبیر کا واسطہ ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مجاہد اور سعید بن جبیر چونکہ ثقہ اور ائمہ کے نزدیک قابل اعتبار ہستیاں ہیں اس لئے روایت میں کوئی حرج اور ضعف نہیں۔

؎ الاتقان ص ۱۸۸ ج ۲

خلیلی اپنی کتاب "ارشاد" میں بیان کرتے ہیں کہ ابو صالح کے شیخ معاویہ بن ابی صالح القاضی اندلس کی روایت کو جو وہ اپنے شیخ علی بن ابی طلحہ اور وہ ابن عباس سے کرتے ہیں۔ بڑے بڑے محدثین نے معتبر جانا ہے اور قبول کیا ہے۔ (البیان فی علوم القرآن ص۵۶)

عبداللہ بن عباس رض کے بعد مفسرین صحابہ میں عبداللہ بن مسعود رض کا درجہ ہے۔ ابن مسعود رض کے شرف وفضل کے لئے صرف یہ کافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار حضرات صحابہ سے علوم قرآن سیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا ان میں سب سے مقدم ابن مسعود ہیں۔ تفسیری روایات کا عدد حضرت علی رض کی روایات سے بھی زائد ہے۔ ان کے بعد ابی بن کعب رض زید بن ثابت۔ ابو موسیٰ اشعری رض اور عبداللہ بن الزبیر رض کا درجہ ہے شیخ سیوطی فرماتے ہیں۔ ابی بن کعب رض سے تفسیر میں ایک بڑا مجموعہ سند صحیح سے ثابت ہے۔ جس کو ابو جعفر الرازی بروایہ ربیع بن انس ابو العالیہ سے نقل کرتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس میں کا بہت سا ذخیرہ روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں بھی ابی بن کعب رض کی روایات تخریج کی ہیں۔

ان حضرات صحابہ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی روایاتِ تفسیر منقول ہیں لیکن ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ جیسے انس بن مالک رض ابو ہریرہ رض ابن عمر رض جابر رض اور عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ عبداللہ بن عمرو رض سے بہت روایات قصص وواقعات اور احوال فتن اور احوال آخرت سے متعلق منقول ہیں۔ جن میں بعض قصص وواقعات پر مشتمل روایات اہل کتاب سے بھی منقول ہو گئی ہیں[۱]۔

دوسرا طبقہ

مفسرین میں دوسرا طبقہ تابعین کا ہے۔ یعنی وہ حضرات جن کو حضرات صحابہ سے فیضِ تلمذ حاصل ہے جیسے مجاہد۔ عکرمہ۔ عطاء بن ابی رباح۔ طاؤس اور سعید بن جبیر وغیرہ۔

حافظ ابن تیمیہ بیان کرتے ہیں کہ تفسیر کے سب سے زیادہ عالم اہل مکہ ہیں۔ کیونکہ اہل مکہ کثرت سے ابن عباس کے شاگرد ہیں۔ اور عکرمہ تو ان کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اور تمام متاخرین کی کتب تفسیر انہی کی روایات تفسیر سے بھری ہوئی ہیں۔

کوفہ میں عبداللہ بن مسعود رض کے شاگردوں کی کثیر جماعت تھی اور اہل مدینہ میں بھی ایک جماعت حضرات صحابہ کے شاگردوں میں سے مفسرین کی تھی جیسے۔ زید بن اسلم جن سے ان کے بیٹے عبدالرحمن بن زید اور انس بن مالک روایات کرتے ہیں۔ حسن بصری۔ عطاء بن ابی سلمہ خراسانی۔ محمد بن کعب قرظی۔ ابو العالیہ

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن ج۲ ص۱۳

ضحاک بن مزاحم۔ عطیۃ عوفی اور قتادہ یہ تمام حضرات علم تفسیر کے امام تھے اور جو کچھ کہتے تھے وہ حضرات صحابہؓ سے سُنا ہوا ہوتا تھا[۱]

اور ان تمام ائمہ کے درمیان سب سے فائق فن تفسیر میں مجاہدؒ ہیں فضل بن میمون سے منقول ہے کہ میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابن عباس کے روبرو قرآن کریم کو تیس بار پیش کیا جس میں ہر آیت کی مراد اس کا شان نزول اور یہ کہ وہ کب نازل ہوئی دریافت کرتا تھا۔

امام نوویؒ نے فرمایا جب کسی آیت کی تفسیر مجاہد کے منقول ہو تو بس وہ کافی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور اکثر ائمہ مجاہد ہی کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔ سفیان ثوری کا مقولہ ہے تفسیر قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو۔ سعید بن جبیر مجاہد۔ عکرمہ اور ضحاک۔ قتادہ سے منقول ہے کہ تابعین میں سب سے زائد اُعلم چار شخص ہیں۔ عطاء بن ابی رباح مناسک (احکام حج) کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ اور سعید بن جبیر اعلم بالتفسیر اور عکرمہ اعلم بالسیر (مغازی) اور حسن اعلم بالحلال والحرام ہیں۔ اور شعبی فرمایا کرتے تھے اس وقت روئے زمین پر عکرمہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں ہے[۲]۔ ان ائمہ مفسرین کے بعد وہ طبقہ ہے جو حضرات صحابہ اور تابعین کے اقوال کو جمع کرنے والا ہے۔ تو طبقات کی ترتیب میں یہ تیسرا طبقہ ہوگا۔

تیسرا طبقہ

اس طبقہ میں باضابطہ کتب تفسیر کی تصنیف کا دور شروع ہوا۔ اور اس طبقہ کے مفسرین نے متقدمین تابعین اور صحابہ کے اقوال اور روایات جمع کرکے قرآن کریم کی تفسیروں کی تصنیف شروع کی۔ اور اس دور میں بکثرت تفسیریں لکھی گئیں۔

مثلاً تفسیر سفیان بن عیینہ۔ تفسیر وکیع بن الجراح۔ تفسیر شعبۃ بن الحجاج تفسیر یزید بن ہارون۔ تفسیر عبدالرزاق۔ تفسیر آدم بن ابی ایاس۔ تفسیر اسحاق بن راہویہ۔ تفسیر رَوح بن عبادہ۔ تفسیر عبد بن حُمید۔ تفسیر سعید۔ تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ۔ اسی طبقہ میں ابن جریج۔ سُدّیؒ[۴] ابن قتیبۃ اور ابو محمد عبداللہ بن مسلم دینوری صاحب مشکل القرآن و غریب القرآن ہیں[۳]۔

---

[۱] البیان فی علوم القرآن۔ [۲] الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۹۰/۲ [۳] البیان فی علوم القرآن۔

[۴] سُدّی کا نام اسماعیل بن عبدالرحمٰن ہے۔ شعبہ اور سفیان ثوری کے شاگردوں میں سے ہیں۔ سُدّہ عربی زبان میں چبوترہ کو کہتے ہیں۔ ان کا یہ لقب اس لئے مشہور ہو گیا تھا کہ یہ جامع مسجد کوفہ کے چبوترہ پر بیٹھ کر درس حدیث و تفسیر دیا کرتے تھے تفسیر و حدیث کے امام تھے۔ ان کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دور میں ایک شخص مقاتل بن سلیمان گذرا ہے جس کو بعض مورخین اور ائمہ رجال شیعی بتاتے ہیں۔ کلبی ائمہ تفسیر میں اکثر کے نزدیک مستند اور معتمد نہیں شمار کئے (بقیہ ص ۱۳۵ پر)

چوتھا طبقہ

تیسرے طبقہ کی تفاسیر میں بعض روایات ضعیف اور منکر درج ہوگئی تھیں اس لئے اس کے بعد چوتھے طبقہ کے مفسرین نے قدرے تنقیح و تحقیق کی رعایت کے ساتھ کلام اللہ کی تفسیر میں وجوہ اعراب اور احکام ومسائل کے استنباط کا بھی لحاظ کیا۔ اگرچہ ان کی تنقیح و تحقیق اور تصحیح کا وہ معیار نہ تھا جو کہ امام بخاری اور مسلم نے اپنی کتابوں کے لئے اختیار فرمایا۔ اس طبقہ کی تفاسیر میں سب سے زائد عظیم المرتبت تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۱ھ کی تفسیر ہے شیخ جلال الدین سیوطی رح نے ان کی تفسیر کی بہت تعریف کی ہے۔ ہر دور اور طبقہ کے ائمہ مفسرین نے ابن جریر طبری کی تفسیر کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام نووی رح فرماتے ہیں کہ ابن جریر کی کتاب تفسیر میں ایسی بے مثال ہے کہ کسی نے ایسی کتاب نہیں تصنیف کی۔ روایات تفسیر کا پورے طور پر استیعاب کیا ہے۔ اہل علم میں تفسیر ابن جریر مشہور و معروف تفسیر ہے۔ ابن جریر طبری نامی ایک اور شخص گذرا ہے۔ جو فرقہ کرامیہ اور شیعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نام کے اشتراک سے دھوکہ ہو جاتا ہے۔ اسی طبقہ میں ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن حبان، ابن مردویہ، ابو الشیخ۔ ابن المنذر اور احمد بن داؤد نحوی دینوری ہیں۔ اور ان ائمہ نے تفسیر میں متعدد مجموعے تصنیف کئے۔ مثلاً شفاء الصدور کتاب الاشارات لابن ابی حاتم متوفی ۳۰۶ھ اور تفسیر ابواب القرآن بھی اسی دور کی تصنیف ہے۔

پانچواں طبقہ

اس طبقہ میں بہت سے مفسرین گذرے ہیں جنھوں نے اپنی کتب میں اسناد حذف کر کے صحابہ اور تابعین کی طرف اقوال تفسیر کی نسبت کی ہے۔ اور انہی کی روایات اپنی کتب میں جمع کیں۔ امام ابو محمد عبداللہ جوینی رح امام الحرمین کے والد متوفی ۴۳۸ھ شیخ ابو القاسم عبدالکریم قشیری رح متوفی ۴۶۵ھ اور ابو الحسن احمد واحدی ۴۶۸ھ ـــــــــ طبقہ خامسہ کے ممتاز اور نمایاں مفسرین ہیں۔ اس طبقہ میں بعض لوگ غیر مستند اور اہل سنت والجماعت کے مسلک سے منحرف تھے انھوں نے اپنی تفاسیر میں رطب و یابس روایات جمع کیں بلکہ اعتقاداً ان پر تشیع اور رفض کا اثر تھا۔ چنانچہ ابو اسحاق احمد ثعلبی کہ جن کی طرف ایک بڑی تفسیر کی نسبت ہے مگر اس میں بہت کچھ جھوٹے قصے اور غلط روایات کو جمع کیا ہوا ہے

(صـ۱۲۷ کا بقیہ حاشیہ ملاحظہ کیجئے) جانتے ہیں قبیلہ کلب کی طرف نسبت کی وجہ سے یہ لقب مشہور ہوا نام ابو نصر محمد محمد بن سائب ہے کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ سفیان ثوری اور محمد بن اسحاق کے شاگردوں میں سے ہیں ۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ ابو بکر بن شیبہ مشہور امام اور محدث ہیں انہی کی کتاب مسند ابن ابی شیبہ کے نام سے مشہور ہے ۲۳۲ھ میں وفات ہوئی۔ تفسیر کے موضوع پر کتاب فضائل القرآن تصنیف کی (البیان فی علوم القرآن)

مرتضیٰ علم الہدیٰ شیعی نے ان کو اپنا ہم مسلک شمار کیا ہے۔ اسی طرح ابو عبد الرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیشاپوری متوفی ۴۱۲ھ کی تفسیر میں بھی بے اصل روایات اور بہت کچھ خرافات کا ذخیرہ بھرا پڑا ہے۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کی تفاسیر غیر معتبر ہیں۔

چھٹا طبقہ

اس طبقہ کے مفسرین سے وہ متأخرین مراد ہیں جو چھٹی صدی میں گذرے ہیں۔ گذشتہ پانچ طبقات کے مصنفین نے اپنی تصانیف میں روایات و آثار ہی کو جمع کرنے کا زائد لحاظ رکھا تھا۔ ان کے بعد چھٹے طبقہ کے ائمہ نے مختلف حیثیات کے پیش نظر تفسیر قرآن کی جانب توجہ کی۔ کسی نے اپنا مطمح نظر علوم صرف و نحو اور قواعد عربیہ کو بنا کر تفسیر کی جیسے شیخ نور الدین ابو الحسن علی بن الحسین بن علی باقولی متوفی ۵۴۳ھ انھوں نے کتاب الکشف تصنیف کی۔ کسی نے فقہی مسائل اور احکام کے استنباط اور ان کی تائید و تثبیت کو مد نظر رکھتے ہوئے تفسیر کی کسی نے متکلمانہ اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے فلاسفہ کے مسائل کا رد کیا۔ عارفین و صوفیائے کے سلوک و تصوف کے نکات و لطائف ہی کو مقصد ٹھیرایا۔ کسی نے مفردات قرآن کی تحقیق کو اپنی تصنیف کا مقصد قرار دیا جیسے امام راغب اصفہانی کی کتاب مفردات۔ اور کسی نے فصاحت و بلاغت کے قواعد کے ماتحت اعجاز قرآن اور اس سے متعلق لطائف کو اپنی تفسیر میں جمع کیا۔ جیسے امام ابو القاسم محمد بن عمر زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی

لہ اسی موضوع پر دوسرے مفسرین نے بھی تصانیف کیں جیسے ابوحیان کی کتاب بحر اور ان کے شاگرد شہاب الدین احمد بن یوسف الحلبی کی کتاب "الدر المصون فی علم الکتاب المکنون" اور اسی موضوع پر ابراہیم بن محمد سفاقسی متوفی ۷۴۲ھ کی کتاب "المجید" ہے اور امام ابو البقاء عکبری نحوی متوفی ۶۱۶ھ کی کتاب البیان اور امام ابو الحسن علی بن ابراہیم حوفی متوفی ۵۶۲ھ کی کتاب دس جلدوں اور شیخ مکی بن ابی طالب حموشی بن محمد قیسی نحوی متوفی ۴۳۷ھ کی کتاب بالخصوص آیات مشکلہ کے اعراب میں ہے۔ متقدمین نے بھی اعراب قرآن پر بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ بعض ائمہ نے صرف فضائل قرآن کے موضوع پر تفسیریں لکھیں جس میں امام شافعی رح کی تفسیر بنیاد ہے اور بعض نے احکام قرآن کے عنوان پر تفسیر کی۔ اس موضوع پر ہر دور میں کثرت سے تفسیریں لکھی گئیں۔ جیسے کہ تفسیر امام شافعی رح۔ شیخ ابو الحسن علی بن حجر سعدی متوفی ۲۲۴ھ شیخ ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی متوفی ۳۲۱ھ۔ قاضی ابی اسحاق اسماعیل ازدی متوفی ۲۸۲ھ۔ شیخ ابو الحسن علی بن موسیٰ حنفی متوفی ۳۰۵ھ۔ شیخ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۲۵۸ھ اور شیخ ابو بکر احمد بن محمد جصاص رازی حنفی متوفی ۳۷۰ھ

اسباب نزول پر بھی اکثر حضرات کی تصانیف قرون اولیٰ سے پائی جاتی ہیں جیسے کہ شیخ المحدثین علی ابن المدینی متوفی ۲۳۴ھ۔ شیخ ابو الحسن علی بن احمد واحدی ۴۶۸ھ اور ابن الجوزی وغیرہ۔ ان حضرات نے شان نزول ہی کے عنوان پر خصوصیت کے ساتھ تفسیریں لکھیں۔ (البیان فی علوم القرآن)

تفسیر کشاف انہی کو جار اللہ زمخشری بھی کہتے ہیں۔ اصول عربیہ میں یہ تفسیر تمام متاخرین کے لئے بنیاد ہے سب انہی کی اتباع کرتے ہیں۔ قاضی بیضاوی رح اپنی تفسیر میں خصوصیت کے ساتھ لطائف عربیہ اور نکات بلاغت تفسیر کشاف ہی سے لیتے ہیں۔ علامہ زمخشری حنفی المسلک لیکن اعتزال کی جانب مائل تھے۔ اس وجہ سے بہت سی باتیں ان کی تفسیر میں مسلک اعتزال کی آگئیں۔ اس طبقہ میں امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی رح متوفی ۵۰۵ھ ہیں۔ جواہر القرآن اور یاقوت التاویل امام رح کی تصانیف میں سے ہیں۔

امام ابو محمد حسین بن محمود بغوی بھی اسی طبقہ کے مفسرین میں سے ہیں جن کی تفسیر معالم التنزیل اہل علم کے درمیان معروف تفسیر ہے۔ (البیان فی علوم القرآن)

ساتواں طبقہ

ساتویں صدی ہجری کے ائمہ اور مفسرین اس طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس طبقہ کے ممتاز و نمایاں اور قابل فخر اماموں میں امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کی تفسیر "مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر"، علوم عقلیہ اور معارف و حکم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ اور بہترین خزانہ ہے۔ لطائف و اسرار کلام اللہ اور اصول دین کی تحقیق میں ایسی تفسیر امت میں شاید کسی نے تصنیف نہ کی ہو۔ فلاسفہ اور ملحدین کا رد دلائل عقلیہ اور اصول کلام سے خوب کیا ہے۔ اثبات ربوبیت و الوہیت کے وہ نادر اور گرانقدر مباحث ہیں کہ ان کی برتری اور اظہار عظمت کے لئے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ امام رح کا امت مسلمہ پر یہ ایک ایسا احسان ہے کہ جس کا بدلہ صرف حق تعالیٰ کی رحمتیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔

فلاسفہ کے رد میں بعض ضمنی مسائل اور مباحث سے بعض لوگوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ امور تفسیر سے خارج ہیں اس لئے اس طرز پر نکتہ چینی اور کتاب کی عظمت پر اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت شاہ انور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تفسیر کبیر کے بارہ میں یہ کہنا کہ فیہ کل شئی الا التفسیر (یعنی اس میں سب چیز ہے سوائے تفسیر کلام اللہ کے) اس کے بلند ترین مرتبہ سے گرانا ہے۔

اسی طبقہ میں امام محمد بن ابی بکر رازی متوفی ۶۰۶ھ بھی ہیں جن کی تفسیر لغات قرآن کے موضوع پر ہے۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ اس طبقہ کے بے نظیر امام اور محقق ہیں۔ ان کی تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل" جو بالعموم تفسیر بیضاوی کے نام سے معروف ہے۔ نہایت نافع اور جامع تفسیر ہے اس کے فوائد اور لطائف احاطۂ بیان سے خارج ہیں۔ عنوان کے اعتبار سے بظاہر ایک کتاب ہے لیکن درحقیقت یہ بہت سی عظیم الشان تفاسیر کا لباب اور جوہر ہے۔ قواعد عربیہ اور معانی و بیان سے تعلق رکھنے والے حقائق و معارف تفسیر کشاف زمخشری سے ماخوذ ہیں۔ علوم عقلیہ اور حکمت و کلام اور اسرار کلام اللہ سے متعلق مباحث

تفسیر کبیر سے ماخوذ ہیں۔ اور لغات قرآن کی تحقیق میں ان کی یہ تفسیر مفردات القرآن امام راغب اصفہانی رح کا جوہر ہے۔ خود اپنی طبعی اور ذہنی پرواز اور فن کلام میں مہارت کے باعث تفسیر قرآن میں جن محاسن اور خوبیوں کا جگہ جگہ اضافہ فرماتے ہیں وہ اپنی جگہ دُر یکتا ہوتے ہیں۔ پھر ان لطیف اور دقیق مباحث کو جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا اس پر اہل نظر و فکر متحیر ہیں۔ اور معترف ہیں۔ ایسی شان جامعیت میں تفسیر بیضاوی بے مثال تفسیر ہے۔ جو صدیوں سے درس تفسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ہر قرن اور ہر دور میں علماء امت اس کے حواشی اور شروح لکھتے رہے۔ روایتی حیثیت سے محدثانہ اصول کے ماتحت مرتبہ ہلکا ہے۔ فضائل سور میں بعض مقام پر روایات ضعیف اور موضوع بھی آگئی ہیں۔

آٹھواں طبقہ

آٹھویں طبقہ میں امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمود نسفی ۷۰۱ھ ہیں جو حنفی المسلک تھے اور اصول فقہ میں اپنے دور کے یکتا امام اور محقق شمار ہوتے تھے۔ ان کی تفسیر "مدارک" ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت مفید اور عمدہ تفسیر ہے۔ اسی طبقہ میں امام ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ ہیں جو حافظ ابن کثیر کے عنوان سے علماء کے درمیان مشہور و معروف ہیں۔ شافعی المسلک اور حافظ ابن تیمیہ رح کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کی تفسیر ابن جریر کی تفسیر کا خلاصہ اور لباب ہے روایات تفسیر کا نہایت ہی معتمد ذخیرہ ہے اور روایت و درایت کی جامعیت میں وہ شان حاصل ہے کہ محدثین کی تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ حضرت شاہ انور رح کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے مستغنی کرسکتی ہے تو وہ صرف تفسیر ابن کثیر ہے جو تفسیر ابن جریر سے بے نیاز کر دینے والی ہے۔

امام شرف الدین حسن بن محمد جو علامہ طیبی کے عنوان سے مشہور ہیں اسی طبقہ کے علماء میں سے ہیں۔ ان کی ایک تفسیر "فتوح الغیب عن قناع الریب" نہایت عمدہ اور نافع تفسیر ہے۔ علامہ طیبی رح کا کشاف پر چھ جلدوں میں ایک حاشیہ ہے مشکوۃ المصابیح کی بے مثال شرح بھی انہی کی ہے۔ صاحب مشکوٰۃ شیخ ولی الدین عراقی کے شیخ ہیں۔ اس دور کے آخری حصہ کے علماء میں علامہ سعد الدین تفتازانی مشہور و معروف امام ہیں

نواں طبقہ اور اس کے بعد کے مفسرین

اس کے بعد نویں صدی اور اس کے بعد کے ائمہ اور مفسرین ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ شیخ جلال الدین محلی شافعی متوفی ۸۶۴ھ اپنے فضل و کمال کے باعث ممتاز اور فائق ہیں۔ جلالین شریف کے آخری حصہ سورۂ اسراء سے ختم قرآن تک انہی کا ہے۔ عمر نے وفا نہ کی اس لئے تکمیل نہ فرما سکے۔ اسی طبقہ میں ملا مخدوم مہائمی متوفی ۸۳۵ھ ہیں جن کی تفسیر تبصیر الرحمٰن نہایت ہی عجیب و غریب ہے نہایت ہی لطیف انداز میں ربط آیات و سورہ کا التزام

کیا ہے اور صوفیانہ معارف ولطائف بھی بکثرت ہیں ۔ قرآن کریم کی معجز انہ شان کے لئے ایک آئینہ ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے روحانی طور پر حضرت خضر علیہ السلام سے علوم حاصل کئے جو اسرار تکوینیہ کی تفہیم میں حضرت موسیٰؑ کے لئے معلم بنائے گئے تھے۔ شیخ محلی کے بعد شیخ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اسی طرز پر حصہ اول کی تفسیر کرکے تفسیر قرآن مکمل کردی۔ اسی وجہ سے یہ کتاب تفسیر جلالین کے نام سے مشہور ہے۔ نہایت اختصار بلکہ چند الفاظ اور کلمات ہی سے آیات کی تفسیر کی گئی اپنے اس طرز میں یہ کتاب بے نظیر تفسیر ہے۔ اسی طبقہ میں شیخ عبدالرحمٰن ابن عمر بلیقنی اور شیخ ابوالسعود محمد بن عمادی حنفی متوفی ۹۵۲ھ ہیں جن کی تفسیر اپنی شان افادیت میں تفسیر کشاف اور بیضاوی کے قریب اور ہم پلہ شمار ہوتی ہے۔

ان طبقات کے بعد سے آج تک ہر دور کے علماء اور مفسرین ومحققین تفاسیر لکھتے رہے اور قیامت تک انشاء اللہ علماء امت کتاب اللہ کی شرح وتفسیر میں مصروف ومنہمک رہیں گے۔ اور اپنے علمی کارناموں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تصدیق کرتے رہیں گے۔ "ھوالذی لا تنقضی عجائبہ" قرآن اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب اور لطائف کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔[۵]

امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ متوفی ۱۱۷۶ھ کی ایک مختصر اور نفیس تفسیر تالیف کی جس کا نام "فتح الخبیر بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر" ہے۔ اس مختصر تفسیر میں حل الفاظ اور تشریح کلام اللہ بالخصوص ابن عباس رضؓ کے آثار وروایات سے کی ہے۔ اور اسباب نزول میں صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مستدرک حاکم سے احادیث نقل کی ہیں۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر جو اصول تفسیر میں نہایت محققانہ اور جامع تصنیف ہے وہ درحقیقت اسی تفسیر کا مقدمہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی فرمایا ہے جس کا نام فتح الرحمٰن ہے نہایت ہی نافع اور بہترین اسلوب پر ہے۔ علماء اور مفسرین بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ محدث دہلوی ۱۲۳۹ھ ابن شاہ ولی اللہ الدہلوی نے فارسی میں تفسیر فتح العزیز تصنیف فرمائی جو نا تمام رہی۔ پہلا حصہ سورۂ فاتحہ سے آیت وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ تک ہے۔ اور دوسرا حصہ تبارک الذی بیدہ الملک پ ۲۹ سے ختم قرآن تک نہایت ہی محققانہ مباحث اور کلام اللہ کے لطائف معارف وصناحت وتفصیل کے ساتھ جمع فرما دیئے ہیں۔ یہ تفسیر اگرچہ بہت ہی مختصر حصہ کی ہے لیکن اس کے مضامین تمام قرآن کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں فہم قرآن میں بڑی بصیرت اور اصولی معرفت پیدا کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم کے حقیقی مقاصد کے ساتھ قلوب وابستہ کرنے میں نہایت ہی مؤثر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس

---

[۵] تفصیل کے لئے کشف الظنون اور مفتاح السعادۃ کی مراجعت کی جائے۔

اللہ سرہٗ کے شاگردوں میں محقق علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ہیں جن کی تفسیر عربی زبان میں تفسیر مظہری کے نام سے معروف ہے۔ مضامین قرآن کی بڑی عجیب و غریب تفسیر ہے۔ مذاہب فقہیہ کی تحقیق و تفصیل اور ان کے دلائل کے لئے بے نظیر تفسیر ہے۔ مختلف اجزاء مختلف مطابع میں طبع ہوئے تھے اور اہل علم اس تفسیر کے علوم و فیوض کے لئے تشنہ تھے۔ الحمدللہ اب کامل تفسیر طبع ہو کر شائع ہو چکی۔

علامہ محمد بن علی محمد یمنی شوکانی رح متوفی ۱۲۵۵ھ کی تفسیر فتح القدیر بھی ذخیرہ تفاسیر میں ایک گرانقدر تفسیر ہے۔ محدثانہ طرز پر علوم کلام اللہ کو واضح فرمایا ہے۔ نقلیات میں بہت احتیاط کی ہے۔ نواب صدیق خاں صاحب مرحوم ۱۳۰۷ھ کی تفسیر فتح البیان کا ماخذ علامہ شوکانی کی یہی تفسیر ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر ۱۲۳۰ھ ابن شاہ ولی اللہ نے اردو زبان میں سب سے پہلے ترجمہ فرمایا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحت اللفظ ترجمہ کا التزام فرمایا۔ گو کہ اس ترجمہ کے تحت اللفظ ہونے کی وجہ سے عوام الناس کے لئے فہم مراد میں صعوبت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کلام اللہ کی حقیقی عظمت و ہیبت اور کلام الٰہی کا جمال و جلال اگر کسی ترجمہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف حضرت شاہ عبدالقادر رح ہی کا ترجمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ گویا اردو زبان کا قرآن ہے۔ ترجمہ کے ساتھ فوائد بھی ہیں جو نہایت ٹھوس اور جامع ہیں اور تنقیح مطالب میں ایک مختصر تفسیر کے قائم مقام ہیں۔ اس کے بعد اردو زبان میں دوسرا ترجمہ شاہ عبدالقادر رح کے بھائی شاہ رفیع الدین دہلوی رح ۱۲۳۳ھ کا ہے۔ یہ بھی نہایت مفید اور جامع ترجمہ ہے اور کلام اللہ کے لطائف و حقائق کی طرف ارباب بصیرت کے لئے بڑی رہنمائی کرتا ہے۔

متاخرین مفسرین میں فخر المفسرین عمدۃ المتکلمین مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی رح کی تفسیر فتح المنان جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے اردو زبان میں بے نظیر تفسیر ہے جس میں حل لغات اعراب، فصاحت و بلاغت کے نکات مطالب قرآن اور ان کی تشریح معترضین و مخالفین کے اعتراضات کے جواب کا خاص اہتمام ہے گویا متقدمین کے علوم کو اس تفسیر میں بڑی خوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ زیادہ تر تفسیر کا ماخذ تفسیر امام رازی تفسیر قاضی بیضاوی اور کشاف ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ اس تفسیر کی امتیازی شان یہ ہے کہ زمانۂ حال کے فلسفہ اور یورپ کے مستشرقین کے مقابلہ میں اصول اسلام کا ایک مدلل مجموعہ ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تفسیر بیان القرآن بھی اردو زبان میں متقدمین کے علوم کا لباب اور جوہر ہے۔ نہایت ہی پاکیزہ اسلوب سے معانی کلام اللہ کی توضیح و تفصیل کی گئی ہے۔ آیات کا شان نزول اور مسائل فقہیہ اور لطائف و معارف کے بیان کا اہتمام و التزام فرمایا ہے۔ تفسیر درمنثور تفسیر کبیر کشاف بیضاوی اور تفسیر روح المعانی اس کا ماخذ ہیں۔

اردو تفاسیر اور تراجم میں حضرت الشیخ المحقق مولانا محمود الحسن الدیوبندیؒ المتوفی ۱۳۳۹ھ کا ترجمہ قرآن اور فوائد سورۂ بقرہ و سورۂ نسا، امت کے پاس علوم قرآن کا ایک بہترین خزانہ ہے جس کے بقیہ تمام فوائد کی تکمیل محقق عصر شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہٗ نے فرمائی۔ حضرت شیخ نے بڑے ہی محققانہ انداز میں مطالب کلام اللہ کی تشریح کی ہے۔ لطائف و معارف کا ایک سمندر ان فوائد میں جمع کر دیا ہے۔ بہت سے اشکالات جن کے حل کے لئے بڑے بڑے دفتر بھی شاید کفایت نہ کر سکیں ان کا حل نہایت سہل اور لطیف انداز میں موتیوں کی طرح چند پاکیزہ کلمات میں کر دیا۔ بالخصوص اہل باطل اور ملحدین نے اپنی تفاسیر میں جو جو تحریفات کی تھیں ان کا اس حسن اسلوب سے رد فرمایا کہ دیکھنے والے کو اس کے مطالعہ کے بعد ادنیٰ تردد اور التباس نہیں رہتا۔ بارہا یہ فوائد طبع ہو چکے (اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے) اور امت ان علوم سے مستفیض ہو رہی ہے۔ حکومت افغانستان نے ان فوائد کا ترجمہ فارسی زبان میں بڑے اہتمام سے طبع کرا کر شائع کرایا ہے۔

تفاسیر علماء ہند میں والد محترم حضرت الحاج مولانا محمد ادریس کاندھلوی دامت برکاتہم کی تفسیر "معارف القرآن" علوم قرآن کا ایک جامع ذخیرہ ہے۔ اور متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر کا جوہر و لباب ہے۔ حقائق و معارف قرآن میں یہ تفسیر مخصوصاً امام رازی کی تفسیر کبیر علامہ ابوحیان کی تفسیر البحر المحیط علامہ سید محمود آلوسی کی تفسیر روح المعانی اور قاضی ابوبکر بن العربی کی تفسیر احکام القرآن اور تفسیر ابوالسعود کا انتخاب ہے۔ عارفانہ اسرار اور باطنی لطائف میں ملا مخدوم مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن عربیہ و بلاغت کے نکات میں علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف اور تفسیر قاضی بیضاوی کی تلخیص ہے۔ بیان احکام میں احکام القرآن للجصاص اور تفسیر مظہری مولانا ثناء اللہ پانی پتی اس کی بنیاد ہے۔ تحقیق مفردات میں امام راغب کی مفردات اس کا اہم ترین ماٰخذ ہے۔ جگہ جگہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خصوصی علوم اس تفسیر کی نمایاں زینت ہیں تفسیر مذکور ابھی زیر تالیف ہے سورۂ نسا تک کا حصہ تالیف ہو چکا۔

خداوند عالم جلد از جلد اس تفسیر سے اہل علم کو مستفیض فرمائے آمین۔ اور والد محترم اور ان کی اولاد کے لئے ذخیرۂ علم و معرفت و سرمایۂ آخرت بنائے آمین۔

علوم قرآن

قرآن کریم اللہ کی وہ کتاب ہے جس میں اولین اور آخرین کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں۔ جیساکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ فیہ نبأ ما قبلکم و خبر ما بعدکم و حکم ما بینکم۔ کہ اس میں احوال تم سے پہلوں کے ہیں اور بعد والوں کے بھی اور جو کچھ تمھارے درمیان واقعات پیش آئیں ان کا فیصلہ بھی یہی کتاب اللہ ہے۔

قرآن کی یہ شان جامعیت خود قرآن ہی نے بیان کر دی مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ کہ ہم نے کمی نہیں چھوڑی اس کتاب میں کسی بھی چیز کی اس لئے معلوم ہوا کہ قرآن بے شمار اور غیر متناہی علوم کا خزانہ اور سرچشمہ ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی ؒ بروایت سعید بن منصور ابن مسعودؓ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی سا بھی علم درکار ہو اسے چاہیئے کہ وہ قرآن سیکھے کیونکہ اس میں اولین و آخرین کی خبریں اور علوم ہیں۔

امام بیہقی نے حسن سے روایت کی ہے کہ اللہ رب العزت نے ایک سو چار کتابیں آسمان سے نازل کیں جن کے تمام علوم توراۃ و انجیل اور زبور میں جمع کر دیئے گئے۔ پھر ان کے تمام علوم کو اللہ نے فرقان (قرآن) میں ودیعت فرمایا۔ (۱) جس طرح سے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انبیا سابقین کے کمالات نبوت کو جامع ہے اسی طرح آپ پر نازل کی ہوئی کتاب (قرآن) بھی تمام آسمانی صحیفوں اور کتب الٰہیہ کے علوم کو جامع ہے۔

امام شافعی ؒ فرماتے ہیں کہ فقہا امت جو کچھ کہتے ہیں وہ شرح ہے سنت کی۔ اور جو کچھ سنت میں ہے وہ شرح قرآن ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی کوئی فیصلہ فرمایا وہ قرآن ہی سے سمجھ کر فرمایا۔ چنانچہ یہی معنی ہیں آپ کے اس فرمان کے اِنِّیْ لَا اُحِلُّ اِلَّا مَا اَحَلَّ اللہُ وَاِنِّیْ لَا اُحَرِّمُ اِلَّا مَا حَرَّمَ اللہُ کہ بے شک میں نہیں حلال کرتا کسی چیز کو بجز اس کے کہ جس کو اللہ نے حلال کیا اور نہ میں حرام کرتا ہوں کسی شئے کو بجز اس کے کہ جس کو اللہ نے حرام کیا۔

سعید بن جبیر کا قول ہے کہ جو بھی کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے پہنچی میں نے ضرور اس کا مصداق کتاب اللہ سے پالیا۔ ابن ابی الفضل المرسی سے منقول ہے کہ قرآن کریم ان بے شمار علوم پر مشتمل ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں جو حق تعالےٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے۔ پھر ان میں بہت سے علوم کے وارث کبار صحابہ ہوئے جیسے خلفاء راشدین عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم پھر ان سے علوم کتاب اللہ کی وراثت حضرات تابعین نے حاصل کی۔ قرون اولیٰ کی یہ پاکیزہ ہستیاں ان تمام علوم قرآن کو جامع تھیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثۃً پہنچے تھے۔ بعد کے طبقات میں ہمتوں میں ضعف اور عزائم میں اضمحلال پیدا ہوا اور جن علوم و فنون کے حامل حضرات صحابہ اور تابعین تھے بعد والے ان کا تحمل نہ کر سکے۔

(۱) الاتقان۔

اس وجہ سے ایک ایک گروہ قرآن کریم کے علوم میں سے کسی ایک خاص علم کی طرف متوجہ ہوا اور اسی میں اپنی کوششوں کو صرف کیا۔ کسی کی توجہ ضبط لغات اور مخارج حروف کی تحقیق کی طرف مبذول ہوئی تو اس نے علم القرأۃ کو اپنا موضوع بنایا کوئی قواعد عربیہ اور اصول بلاغت کی طرف متوجہ ہوا۔

حضرات اصولیین اور متکلمین نے دلائل عقلیہ اور شواہد اصلیہ کی بنیاد آیت "لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا" کو بنیاد ٹھہراتے ہوئے حق تعالیٰ کی وحدانیت اس کے وجود و قِدم اور بقا و ازلیت اور اس کے علم و قدرت پر دلائل کا استنباط فرمایا اور اس علم کا نام علم اصول الدین یا علم الکلام متعین ہوا۔ ایک گروہ نے معانی خطاب پر نظر کرتے ہوئے عموم و خصوص۔ اطلاق و تقیید اور حقیقۃ و مجاز۔ ظاہر نص و مفسر و محکم اور مجمل خفی متشابہ سے بحثیں کیں اور انہی مباحث و اصول کا علم اصول فقہ کے نام سے موسوم ہوا۔ کسی نے حلال و حرام فرض و واجب اور تمام احکام عملیہ فرعیہ کو مطمح نظر بنایا جس کا مجموعہ علم فقہ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کسی کی نگاہیں امم سابقہ کے احوال و واقعات کی جانب مائل ہوئیں اور بدء دنیا اور ایجاد کائنات کے مضامین کو دیکھا تو اس سے اصول تاریخ مدون کئے اور اس طرح فن تاریخ کا استنباط کیا گیا۔ بعض حضرات مضامین وعد و عید انذار و تبشیر مبدأ و معاد۔ حشر و نشر۔ جزاء و سزا اور جنت و جہنم پر متنبہ ہوئے انھوں نے علم الموعظہ کے اصول و فروع کا ان سے استنباط کیا۔ کسی نے حضرت یوسف کے قصہ میں جیل خانہ کے دو ساتھیوں کے خواب اور بادشاہ مصر کے خواب "سبع بقرات" سے اصول تعبیر کا استنباط کیا اور اسی سے فن تعبیر مدون کیا۔ اختلاف لیل و نہار اور شمس و قمر اور کواکب کی رفتار کے مضامین سے بعضوں نے علم ہیئۃ کا استنباط کیا۔ اور بعضوں نے آیت "شَرَابٌ مختلف الوانہٗ فیہ شفاء للناس" کو علم صحۃ الابدان اور طب کے لئے بنیاد و معیار قرار دیا۔ غرض اسی طرح بہت سے علوم ہیں جن کا ماخذ کتاب اللہ ہے بطور مثال ان چند علوم کا ذکر کر دیا گیا۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ جس طرح انبیاء سابقین کی نبوت اور ان کی شریعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور شریعت کے ذریعہ مختتم اور من وجہ منسوخ کر دی گئی تو اسی طرح آپ کی کتاب (قرآن) کے ذریعہ تمام کتب سماویہ کو مختتم اور منسوخ کیا گیا۔ تو ایک حیثیت سے آپ کی کتاب ناسخ ہے تو دوسری جہت سے آپ کی کتاب تمام کتب سماویہ کے واسطے متمم اور مکمل بھی ہے بلکہ حقیقت یہی ہے آپ کی شریعت اور آپ کی نبوت اور کتاب تمام شرائع اور ادیان کی تکمیل ہی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

دین تو یہ وہی تھا جو بنیادی اور اصولی طور پر حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی عطا کیا گیا۔ بقول اللہ تعالیٰ شَرَعَ لکم من الدین ما وصّی بہ نوحًا والذی اوحینا الیک و ما

وصینا بہ ابراھیم و موسیٰ وعیسیٰ۔

لیکن ان تمام ادیان و شرائع کی تکمیل حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و شریعت سے فرمائی اسی وجہ سے آپ نے ختم نبوت کی تمثیل میں اپنی ذات کو قصر نبوت کی وہ آخری اینٹ فرمایا جس کے ذریعہ اس قصر نبوت کی تکمیل ہو رہی ہے۔

بلاشبہ یہ امر قرآن کے اعظم معجزات میں سے ہے کہ ضخامت کی قلت کے باوجود وسعت علوم کی کوئی حد اور انتہا نہیں تمام علوم الٰہیہ اور کتب سماویہ کا جوہر اور لباب قرآن کریم ہے۔ عقول بشریہ اور کسب اکتساب کے الآت ان علوم کی حد و غایت کے احاطہ اور ادراک سے عاجز ہیں۔

اور کیونکر ممکن ہے اس لئے کہ۔

ولوان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ۔

اور اگر روئے زمین کے سب درخت قلم ہوں اور سمندر اس کی روشنائی اس حال میں اس کے بعد اور سات سمندر اس میں اضافہ کردیں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہونگے۔

قرآن کریم کے ان بے شمار علوم کا استیعاب تو بہر کیف ممکن نہیں البتہ وہ علوم جن پر انسان کی اعتقادی عملی اخلاقی اور تمدنی اصلاح اور اس کی سعادت عظمیٰ (یعنی فلاح دارین) کا دار و مدار ہے ان کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی ہے۔ اول علوم نظریہ اور دوم علوم عملیہ۔ عملیہ کے تحت (الف) علم تہذیب النفس (ب) علم تدبیر المنزل اور (ج) علم سیاست مدن داخل ہیں۔ اس لئے کہ انسان میں خداوند عالم نے دو قوتیں ایسی رکھی ہیں کہ اگر ان کی اصلاح ہو جائے تو وہ نجات اور سعادت دارین کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اب اس کے بعد جس قدر بھی ان میں ترقی کرے گا اسی قدر اس کی سعادت میں بھی ترقی ہوگی۔ ایک قوت نظریہ یعنی وہ علم و ادراک حقیقی اور مطابق واقع۔ اور یہ قوت سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ انسان کی عملی زندگی اسی کے تابع ہے یہی قوت اعمال پر برانگیختہ اور آمادہ کرتی ہے اور مرنے کے بعد بھی یہی قوت اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی اصلاح اور تکمیل یہ ہے کہ حقائق و موجودات کو صحیح طور پر جانے مجردات ہوں یا مادیات عالم محسوس ہو یا معقول۔ محسوسات اور مادیات کے علوم اور ان کا انکشاف مجردات کے علوم وانکشاف کے مقابلہ میں نہایت ہی ناقص اور ہیچ ہے۔ کیونکہ مادیات متغیر ہیں اور ان کے تغیر سے علم کا متغیر ہونا لازم ہے نیز یہ کہ مادیات بہ نسبت مجردات کے خسیس و ارذل ہیں تو ان کا علم بھی ایسا ہی ہوگا انسانی ابدان کے صحت و مرض کا علم، حیوانات کے صحت و مرض کے علم سے یقیناً اشرف و افضل ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں حیوانات سے متعلق علم الابدان خسیس اور کمتر کیونکہ بہائم کا مرتبہ ان سے بہت ہی گھٹا ہوا اور خسیس ہے۔

۱؎ الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۳۰

یہی تفاوت مادیات اور مجردات کے علوم میں ہے۔ اور مجردات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت اور اس کا علم سب سے اعلیٰ اور افضل ہوگا۔

تو قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ اس علم سے متعلق ہے۔ جس سے انسانی علوم نظریہ کو گمراہی سے بچانا اور ان کی اصلاح وتکمیل مقصود ہے۔

چنانچہ قرآن نے پہلے ہی جملہ (آیت) سے خداوند عالم کی ذات بابرکات اور اس کی صفاتِ عظیمہ کا اس طرح ثبوت کر دکھایا کہ وہ ایک حکیم دانا اور فیلسوف کے مذاق پر برہان ودلیل بھی ہے اور عوام کے اذہان ودماغ بھی اپنے سادہ مذاق کے بموجب اس سے یقین حاصل کر سکتے ہیں (مثلاً) الحمد للہ رب العالمین۔ یہاں چار لفظ ہیں۔ حمد یعنی ستائش وخوبی۔ اللہ جو اس ذات واجب الوجود کا نام ہے جس میں جملہ صفات کاملہ حاصل ہیں۔ ربّ پرورش کرنے والا درجہ بدرجہ کسی چیز کو اس کی حد کمال تک پہنچانے والا جس سے وہ شئے کسی وقت اور کسی حال میں بھی اپنے مربی سے مستغنی نہیں رہ سکتی۔ ہر آن اور لمحہ اس کا دست احتیاج اپنے مربی کی طرف پھیلا ہوا رہتا ہے۔ عالمین۔ عالم کی جمع یعنی بہت سے عالم۔ عالم جواہر۔ عالم مجردات۔ عالم اجسام۔ عالم مادیات۔ عالم سفلیات۔ عالم عناصر وبسائط۔ عالم نباتات۔ عالم حیوانات۔ عالم انسان۔ عالم محسوس۔ عالم معقول۔ اب اگر عاقل آخر سے اول تک نظر کرتا چلا آئے تو خود بخود اشیاء مذکورہ میں سے ایک دوسرے کے لئے ثابت ہوتی جائیں گی جب کوئی ذی عقل محسوسات میں سے صرف عالم نباتات عالم حیوان اور عالم انسان ہی کو غور سے دیکھے گا تو اس کو یہ چیز صاف اور بالکل بے حجاب نظر آجائے گی کہ ان میں سے کسی کا وجود اپنا ذاتی نہیں اور نہ اس میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو بنایا ہے۔ انسانی اعضاء کی ساخت کیسی عجیب وغریب ہے۔ ان میں کس قدر صنعتیں اور حکمتیں رکھی ہوئی ہیں (یہی حال تمام انواع حیوانات اور نباتات کا ہے) پھر سلسلۂ توالد وتناسل اور ان کا نشوونما اور ان کے واسطے آلات ادراک اور سمع وبصر اور قوت گویائی کا عطا کیا جانا یہ سب حیرت انگیز باتیں اس پر مجبور کرتی ہیں کہ تسلیم کیا جائے کہ ان کا بنانے والا یقیناً کوئی بڑا ہی حکیم ومدبّر اور زبردست طاقت رکھنے والا ہے جس کی طرف یہ تمام اشیاء عالم وجود میں آنے کے بعد بھی سراپا محتاج ہیں۔

وہ کون ہے؟

اس جگہ آکر سائنس اور مغربی فلسفہ کا قدم تو پھسل گیا اور اس نے کبھی مادہ کبھی طبیعت اور کبھی نیچر کا نام لیا عالم کائنات کی ایسی عجیب وغریب اور محیر العقول صناعی اور کاریگری کی نسبت مادہ اور نیچر جیسی بے حس

ھ البیان فی علوم القرآن۔

وشعور اور بے ارادہ شئے کی طرف کرکے اشکالات واوھام کی دلدل میں ایسے پھنس گئے کہ اس سے نکلنے کے لئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں مگر قرآن نے دنیا کو یہ سبق پڑھایا اور عقل وبصیرت کے ساتھ سمجھنے کی دعوت دی کہ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيْلٌ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہے ہر چیز پر وکیل (ونگراں بھی) ہے۔

کہ ان تمام موجودات کا خالق اور عدم سے وجود میں لانے والا وہی زبردست قدرت اور علم وحکمت والا خدا ہے اسی کو اللہ کہتے ہیں۔ اور وہی موجودات کا ہر طرح سے احاطہ کرنے والا ہے "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ" یہ سب کچھ اسی رب العزت کی کاریگری ہے[1]۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شئ انہ خبیر بما تفعلون۔ غرض جب یہ ثابت ہوگیا کہ عالم کا خالق اور مربی اللہ ہے اور جملہ موجودات اپنے وجود اور بقاء میں سرتاپا اسی کے ہر آن اور لمحہ محتاج ہیں۔ اسی نے اپنے فیض عام اور حکمت سے مخلوق کی آفرینش میں حکمت واتقان کو ملحوظ رکھا وہی اپنے انعام وکرم سے سب کو سرفراز فرماتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس ذات میں تمام صفات کمالیہ موجود ہیں۔ اور جو ذات جملہ کمالات کے ساتھ متصف ہو وہ ہر طرح کی حمد وستائش کی مستحق ہے۔ اب اس جملہ کو دوسری طرح سے بقاعدۂ حکماء ترتیب دے لو تو پوری برہان خدا تعالیٰ کے وجود اور صفاتِ کمال پر قائم ہو جائے گی۔ بایں طور کہ تمام عالم اور اس کے جملہ افراد وموجودات مؤثر سے مستغنی نہیں۔ کیونکہ ان کا تدریجی وجود اور بقاء کی احتیاج یہی بتا رہی ہے کہ وہ مؤثر سے کسی حال میں بھی مستغنی نہیں۔ جیسے کہ ایک چلتی ہوئی ریل کو کسی چلانے والے ڈرائیور سے مستغنی اور بے نیاز سمجھ لینا عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح موجودات عالم کو بھی مدبر اور مربی حقیقی سے بے نیاز خیال کرنا مقتضائے عقل کے صریح خلاف ہوگا۔ اور جو چیز مؤثر سے مستغنی نہیں وہ حادث ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عالم بجمیع افراد جس میں جواہر اعراض معقولات اور محسوسات سب داخل ہیں حادث ہے۔ اور اس عالم کا جو پیدا کرنے والا ہے اور جس کی طرف یہ تمام عالم ہمہ وقت محتاج ہے وہی کاریگر علیم وقدیر اللہ ہے۔ عالم کائنات اپنے خالق حقیقی اور رب کی توصیف اور حمد وستائش میں یہی کہہ رہا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

غرض اس ایک آیۃ ہی میں اپنی ذات وصفات کا ثبوت دکھا کر اپنی غیر متناہی صفات میں سے ایک ایسی صفت کو اس کے بعد بیان فرما دیا جو خدا اور بندہ کے درمیان رشتۂ محبت قائم کرتی ہے وہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ کہ صفت رحمانیت ہی کا مقتضیٰ ہے تمام مخلوقات کو وجود عطا کرنا اور پھر تربیت کرنا اور رحیمیت کا اقتضاء ہے ایک دوسرے عالم میں مطیعین اور نیکوں پر انعام فرمانا جس کی طرف مالک یوم الدین

---

[1] تفصیل کیلئے والد محترم حضرت مولانا محمد ادریس الکاندھلوی ادام اللہ ظلہ کی کتاب "علم الکلام" کی مراجعت کی جائے۔

سے اشارہ کر دیا گیا۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ کے انعامات اخرویہ کا استحقاق انسان کے کسی ذاتی فضل و کمال سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کا ذریعہ حق تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت کا قلب میں استحکام اور عملی زندگی سے اس کی مطابقت ہے جس کو ایمان واطاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا جامع عنوان عبادت (بندگی) ہے اور ایمان واطاعت جیسی عظیم سعادت خود اس کے کسب واکتساب پر تمام تر موقوف نہیں بلکہ وہ توفیق واعانت خداوندی پر موقوف ہے تو اس کے واسطے ایاک نعبد وایاک نستعین کو ذکر کر دیا گیا۔

پھر اس اقرار نامہ پر قائم رہنا بلحاظ اس کے کہ انسان میں قوائے ملکیہ کے ساتھ قوائے بہیمہ کا بھی اجتماع ہے جو اس کو توہمات میں مبتلا کرتے ہیں بے صبری ناعاقبت اندیشی کی وادی میں ڈال کر شہوات نفسانیہ اور دنیوی لذتوں کے تابع کر دیتے ہیں۔ انسان معبود حقیقی کو چھوڑ کر خیالاتی معبودوں کے پیچھے لگ جاتا ہے تو اس پر قائم رہنے کے لئے اسی رحمٰن ورحیم سے توفیق استقامت طلب کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے اھدنا الصراط المستقیم میں ایما فرمایا۔ کہ ہم کو سیدھی راہ دکھا۔ اور یہ ایک ایسا عام لفظ ہے جو دینوی اور اخروی تمام معاملات کو شامل ہے۔ راہ راست ہی ہر امر میں صحیح مقصد کی طرف لیجاتی اور پہنچاتی ہے۔ انسان کو قدرت نے جو دو قوتیں عنایت کی ہیں ان میں سے قوت نظریہ ان تمام علوم اور اعتقادات کو شامل ہے جن میں کیفیت عمل کا تعلق نہیں خدا تعالیٰ کی ذات وصفات ملائکہ وانبیاء حشر ونشر جزاء وسزا اور سعادت وشقاوت کے جملہ علوم قوت نظریہ سے متعلق ہیں تو الحمد للہ رب العالمین اور اس کے بعد کے چند کلمات نے ان مضامین کی طرف رہنمائی کی۔ ان کلمات سے قوت نظریہ کی اصلاح وہدایت کے بعد انسان کی دوسری قوت عملیہ کی اصلاح کے لئے بھی صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرنے سے اشارہ فرمایا گیا۔ کیونکہ انسان کا افراط وتفریط میں مبتلا ہو جانا اس کی عملی صلاحیتوں کو فاسد کر دینے والی چیز ہے۔ اعتدال وتوسط ہی تمام ترخوبیوں کو متضمن ہے مثلاً سخاوت وجود ایک عمدہ اخلاقی وصف ہے لیکن اس میں افراط کا نام اسراف و تبذیر ہے جس سے اہل وعیال کے حقوق فوت ہوتے ہوں۔ اور تفریط بخل ہے اس کی تعیین اس طرح کی گئی کہ وہ راستہ ان لوگوں کا جن پر انعام فرمایا جو انبیاء، وصدیقین اور شہداء وصالحین کا گروہ ہے جیسے کہ ارشاد فرمایا۔ انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین۔ افراط وتفریط کی دونوں جانبیں موجب غضب اور قہر خداوندی اور باعث ضلال وگمراہی ہیں اس وجہ سے اس کی مزید توضیح غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَالضَّآلِّیْنَ سے کر دی گئی۔

بہر کیف کلام اللہ کا وہ تمام حصہ جو امور اعتقادیہ ایمان باللہ والملٰئکۃ والرسل والیوم الآخر اور مضامین جزاء وسزا جنت وجہنم اور دلائل آفاق وانفس میں غور وفکر اور صانع عالم کی ربوبیت وتوحید پر استدلال سے متعلق ہے۔ وہ علوم نظریہ پر مشتمل ہے۔ صرف ایک مثال کے درجہ میں سورۂ فاتحہ کے کلمات مبارکہ

سے کچھ اشارات و رموز پر اکتفا کیا۔ امثلہ اور آیات قرآنی سے علوم نظریہ کی تفصیل اور اس کے تمام شعبوں کی تحقیق کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیے جس کی ان مختصر سطور میں گنجائش نہیں (تفصیل کے لئے البیان فی علوم القرآن کی مراجعت فرمائی جائے)

انسان میں دوسری قوت عملیہ اس کے متعلق تین علم ہیں۔ اگر شخص واحد کی انفرادی اصلاح اور فلاح کا علم ہے تو علم تہذیب النفس۔ اور اگر ان عملی باتوں کا علم ہے جو چند افراد کے باہمی معاملات سے متعلق ہیں تو اس کو علم تدبیر المنزل کہتے ہیں۔ اور اگر ان چیزوں کا علم ہے جو انتظام مملکت اور سلطنت سے تعلق رکھتی ہیں تو پھر علم سیاست مدن (سیاست مدنیہ) ہے۔ ہر علم کے تحت بہت سے شعبے ہیں جن کی ہدایت و تفصیل قرآن نے فرمائی۔

علم تہذیب نفس کے شعبے

طہارت بدن و لباس اور ماکل و مشرب یعنی ان امور کا بیان کہ یہ چیزیں شریعت کی نظر میں نجاسات ہیں کن نجاستوں (احداث) کے ازالہ کے لئے وضو ہے اور کون سی نجاست (حدث) کے لئے غسل بدن اور لباس کی تطہیر کا کیا ضابطہ ہے لباس و بدن کی طہارت کے ساتھ مکان کی پاکی بھی ضروری ہے۔ طہارت اللہ کے نزدیک نہایت محبوب چیز ہے۔ اور ظاہری نجاست و گندگیوں کا اثر باطن اور روح تک سرایت کرتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی نافرمانی ایسی گندگی ہے جس کے باعث انسان نجس کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ان تمام احکام و مسائل کو جو علم جامع ہے اس کو علم الطہارت کہتے ہیں۔ چنانچہ اس علم کے لئے قرآن کریم کی یہ آیات مثلاً بنیاد ہیں۔

فِیۡہِ رجال یحبون ان یتطھروا واللّٰہُ یحب المُطّھرین۔	اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاکی کو اور اللہ محبوب رکھتا ہے پاکباز لوگوں کو۔
وثیابك فطھر والرُّجۡزَ فاھجر	اور دلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے کپڑے پاک رکھئے اور گندگی کو چھوڑ رکھئے
واجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزُّور۔	اور پرہیز کرو اے لوگو بتوں کی گندگی سے۔ اور پرہیز کرو جھوٹے قول سے۔
یاایھا الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین وان کنتم جنبًا فاطّھرُوا۔	اے مسلمانو! جب تم کھڑے ہو نماز کی طرف تو دھو لیا کرو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔ اور دھویا کرو اپنے پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو خوب پاکی حاصل کیا کرو (بصورت غسل کرنے کے)

فاعتزلوا النساء فی المحیض۔ اور اے مسلمانو تم جدا رہا کرو۔ اپنی عورتوں سے حالت حیض میں

علم الطہارت کے تحت بہت سے اقسام ہیں اور ہر قسم کے ماتحت بکثرت احکام و مسائل اور فروع و جزئیات ہیں جن کی شرح و تفصیل شارح وحی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی وہ تفصیل و شرح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے جس کو محدثین ایک ایک باب اور عنوان مقرر کرکے پیش کرتے ہیں۔ ارباب طہارت اسی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اور جن کی فطرتیں مسخ ہو چکنے کے باعث طہارت و پاکی سے متنفر ہیں وہ اس سے انحراف کرتے ہیں۔ اس حسی و ظاہری طہارت کے علاوہ ایک اور بھی طہارت ہے جو اخلاق و باطن کی طہارت ہے قرآن کریم میں جگہ جگہ اسی طرح جیسے کہ ظاہری نجاستوں سے پرہیز کا حکم دیا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زائد تاکید و تنبیہ کے ساتھ باطنی گندگیوں سے بچنے کا امر فرمایا۔ اور جس طرح طہارت بدن ولباس وغیرہ کے حصول کا حکم دیا اسی طرح بلکہ اس سے زائد اور باربار تاکید و اصرار کے ساتھ باطنی تزکیہ اور تطہیر کا حکم دیا۔ بلکہ قرآن کا بیشتر حصہ اسی تطہیر و تزکیہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور قرآن نے اسی تزکیہ باطن کو آنحضرت کی غرض بعثت بتایا۔ غرض ہر معصیت اور گناہ باطن کے لئے گندگی ہے۔ اور کفر و شرک تمام نجاستوں سے بڑھ کر شدید ترین نجاست ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔

واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسًا الی رجسھم۔

اور بہر حال جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے تو ان کے واسطے (یہ آیات) اور اضافہ کر دیتی ہیں ان کی گندگی پر ایک اور گندگی کا۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔

جز این نیست کہ اللہ ارادہ کرتا ہے اس امر کا کہ دور کر دے تم کو گندگی اے اہل بیت اور پاک کر دے تم کو پوری طرح پاک کر دینا

قد افلح من زکاھا وقد خاب من دسّاھا

یقیناً کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور ناکام و رسوا ہوا وہ شخص جس نے اس نفس کو گندگیوں میں آلودہ کر دیا

انّما المشرکون نجسٌ۔

سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مشرکین سراپا نجاست ہیں۔

یاایُّھا الذین اٰمنوا لا یسخر قوم من قوم عسٰی ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء عسٰی ان یکن خیرا منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔ ومن لم یتب فاولٰئک ھم الظالمون۔

اے ایمان والو (تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے) ہر گز ہنسنے کوئی قوم دوسری قوم پر (اور اس کو ذلیل نہ کرے) بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہنسیں بعض عورتیں دوسری بعض عورتوں پر بہت ممکن ہے کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو۔ اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو (کیونکہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں) ایمان کے بعد فسق کا نام لگنا بہت برا ہے

(ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں گے تو وہ ظلم کرنے والے ہوں گے ۔

یا ایہا الذین اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضًا۔ ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتًا فکرھتموہ واتقوا اللہ۔

اور اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ کسی کے عیب کا سراغ لگایا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا کوئی تم میں سے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تو تم ضرور ناگوار سمجھتے ہو تو پھر اللہ سے ڈرو۔

الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون

وہ لوگ جن کی روحیں قبض کرتے ہوں گے ملائکہ اس حال میں کہ وہ پاکیزہ ہوں گے کہتے ہوں گے خدا کے فرشتے (ان کو) سلامتی ہو تم پر (خدا کی) داخل ہو جاؤ جنت میں ان اعمال (کی قبولیت) کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔

تو جو شخص دنیا میں اعمال خبیثہ اور اخلاق رذیلہ کی گندگی سے پاک ہوگا ایسے ہی پاکباز کو دار الطیبین میں داخل ہونے کی بشارت سنائی جائے گی۔ اور جس کسی میں ادنیٰ نجاست وگندگی کا اثر باقی رہے گا وہ پاکیزہ نفوس کی اقامت گاہ میں قدم بھی نہ رکھ سکے گا۔ اسی معنی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اشارہ کر رہا ہے لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من کبریاء (صحیح مسلم)

وضو کرنے کے بعد متوضی کو اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد عبدہ ورسولہ اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین کے ذکر کی تعلیم دی گئی تاکہ بدنی طہارت کو حاصل کرنے کے بعد اقرار توحید و رسالت اور توابین ومتطہرین کے گروہ میں سے ہو جانے کی دعا مانگ کر ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت کو بھی جمع کر لے۔

ماکل ومشرب اور لباس کی پاکی کے احکام ان آیات سے ماخوذ ہیں۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔

اے ایمان والو نہ کھایا کرو تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل اور حرام طریقہ سے۔

کلوا من طیبات مارزقنکم۔

کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دیں۔

یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث

(وہ پیغمبر) حلال کریں گے ان کے واسطے پاکیزہ چیزیں اور حرام کریں گے ان پر گندہ چیزوں کو۔

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج

کہدیجئے کون ہے وہ جس نے حرام کیا اللہ کی اس زینت کو

لعبادہ من الطیبات والرزق۔

جو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پاکیزہ چیزوں میں پیدا فرمائی اور رزق بھی۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر۔

اے لوگو! بے شک ہم نے پیدا کیا تم کو ایک مرد اور عورت سے اور پھر بنایا تمھیں مختلف شاخیں اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ کرامت کا مستحق وہی ہے جو تم میں سب سے زاہد صاحب تقویٰ ہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی علم والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

علم الطہارت ہی سے وہ تمام آیات بھی متعلق ہیں جن میں انسان کو قوت شہویہ قوت نفسانیہ اور قوت غضبیہ کے مفاسد سے بچنے بلکہ ان کے مبادی سے بھی پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے۔

ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن۔

اور قریب بھی نہ جاؤ فواحش (بیحیائیوں) کے جوان میں ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ۔

اور قریب بھی نہ جاؤ زنا کے کیونکہ یہ بہت ہی بے حیائی ہے

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل۔

اور نہ قتل کرو تم کسی ایسے نفس کو جس کو اللہ نے تم پر محترم بنادیا ہے (اس کے قتل کو حرام کر دیا ہے) بجز کسی حق میں میں قتل کرنے کے (جیسے قصاص اور رجم کی سزا میں) اور جو شخص کسی کو قتل کرے گا دراں حالیکہ وہ مظلوم ہو تو پھر ہم نے اس کے ولی کو قدرت دیدی ہے (قصاص کی) تو وہ زیادتی نہ کرے قتل میں۔

ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما۔

اور جو شخص قتل کرے کسی مومن کو جان بوجھ کر تو اس کی جزاء جہنم ہے کہ ہمیشہ اسی میں رہے گا اور غضبناک ہوا خداوند عالم اس پر اور لعنت ہے خدا کی اس پر اور اس نے تیار رکھا ہے اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔

مدافعت کیجئے ایسے طریقہ سے کہ جو بہتر سے بہتر ہو ایسی صورت میں تو یقیناً وہ شخص جس کے درمیان اور آپ کے درمیان عداوت ہے گویا کہ وہ نہایت ہی مخلص دوست ہو جائے گا۔

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔ اور وہ لوگ جو غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں (قابل تعریف اور احسان کرنے والے ہیں) اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اس لئے کہ یہی وہ قوتیں ہیں جن سے حسد بغض غرور و تکبر حرص و طمع چوری رہزنی قتل و غارت گری اور عیاشی جیسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور یہ تمام انسانی گندگیاں قوت شہویہ نفسانیہ اور غضبیہ کے گندہ چشموں سے نکلتی ہیں تو قرآن کریم نے اس قسم کی تمام آیات میں ایسی عملی ناپاکیوں سے پاک رہنے کی تعلیم فرمائی۔

علم تہذیب النفس کے انواع و اقسام پر نظر کرنے سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ اصولی اور بنیادی طور پر اس کے تمام شعبوں کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق معائب گندگیوں اور جرائم و معاصی سے اجتناب اور پرہیز سے ہے۔ تو یہ درجہ صفائی کا ہوا اس لئے اس پہلو کے تمام شعبوں کو علم التخلیہ کے عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا پہلو کمالات اور خوبیوں سے اتصاف کا ہے جس کو علم التحلیۃ کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مقصود کی تکمیل دونوں ہی پہلوؤں کو مقتضی ہے۔ صفائی اور پھر زینت۔ اس لئے انسان کی عملی زندگی کی تکمیل بھی عیوب سے پاکی اور کمالات سے مزین ہونے سے ہی ہوگی یعنی اولاً روح اور باطن کو نجاست و آلائشوں سے پاک کرے پھر اس پر عبادات و کمالات کا رنگ و روغن چڑھائے۔ تو اس طرح علم تہذیب النفس دو قسموں پر منقسم ہوا۔ علم التخلیۃ اور علم التحلیہ۔ علم التخلیہ کی طرح علم تحلیہ کے انواع بھی کثیر ہیں جن کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا۔

علم تہذیب نفس کی دوسری شاخ علم التحلیہ کے اقسام

علم التحلیہ یعنی وہ علوم اور ملکات فاضلہ جن سے انسان کی زندگی مزین اور باکمال ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور اس کے آئینۂ قلب پر جس کو وہ صاف اور صیقل کر چکا ہے حق تعالیٰ کی تجلیات فائض ہوتی ہیں"۔ بہت سے اقسام پر مشتمل ہے۔ جن میں سب سے مقدم نماز ہے۔

نماز تہذیب نفس کے دونوں پہلوؤں تزکیہ اور تحلیہ کو جامع ہے۔ تزکیہ و تطہیر کے تمام شعبوں کو جامع ہونے کی طرف تو "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ" اشارہ ہے اور کمال زینت کے لئے جامع ہونا اس کی ہیئت وضعیہ سے ظاہر ہے کہ قولی عملی اور اعتقادی ہر نوع کی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ جس میں قلب اور قالب کو ماسوی اللہ سے ہٹا کر اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے اور گویا کہ بندہ بحالت صلوٰۃ "بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ" اور "انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" کی عملی تصویر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی تسبیح و تحمید اور تمجید و کبریائی ادا کرنے کے ساتھ بندہ کا اظہار عجز اور اسی

استعانت اور راہ مستقیم کی طلب وہدایت بھی شامل ہے۔ ریب سے بڑھ کر قرب خداوندی اور مناجات مع اللہ کا لطف و سرفرازی۔

خدا کے تمام پیغمبر اس عبادت کو قائم کرتے رہے اس عبادت میں ملائکۃ اللہ کی عبادت کی وہ متعدد اور مختلف ہیئتیں جمع کر دی گئیں جن پر ملائکۃ اللہ کے مختلف گروہ قائم ہیں کہ بعضے صرف تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں اور بعضے صرف رکوع ہی کی حالت میں اور بعضے صرف بحالت سجود ہی اظہار عبودیت میں لگے ہوئے ہیں تو اس عظیم الشان عبادت میں ان تمام ہیئات اور احوال عبادت و عبودیت کو جمع کر دیا گیا اسی منقبت و فضیلت کو "اَلَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا۔ اور سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" میں ظاہر فرمایا۔

روزہ بھی ایک جامع عبادت ہے انہی دو پہلوؤں کو کیونکہ اس کی حقیقت شہوات نفسانیہ کے مفاسد سے بچانے والی ہے اور اس کی تاثیر ذاتی تقویٰ ہی جو مبدا اور بنیاد ہے تمام امور خیر اور صلاح و فلاح کیلئے چنانچہ قرآن کریم نے روزہ کا ثمرہ لعلکم تتقون کے عنوان سے ظاہر فرمایا۔ تمام انبیاء سابقین بھی روزہ رکھا کرتے تھے اس لئے یہ عبادت ان کے انوار و برکات کو بھی جامع ہوئی۔ غرض اس وجہ سے صوم بھی تہذیب نفس کے دونوں پہلوؤں یعنی تزکیہ و تطہیر اور تحلیہ و تزیین کو جامع ہوا۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہوا کہ انسان بہیمیت کے آثار سے بعید ہو کر ملکیت کے اوصاف کے ساتھ متصف ہو جاتا ہے قوائے نفسانیہ کو مقہور و مغلوب کر کے روحانیت کو اس قدر جلا اور قوت بخشتا ہے کہ صفات تقدیسیہ اور شئون ربوبیت کا ایک معمولی سا مظہر بن جاتا ہے جس کے باعث حق تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا جاتا ہے کہ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ۔ کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دیتا ہوں۔

زکوٰۃ۔ بھی ایک ایسی پاکیزہ عبادت ہے جو تہذیب نفس کی ہر دو جانبوں کو شامل ہے۔ اس سے حب مال، بخل، حرص، خیانت، حسد، اور بغض جیسے ذمیم اور ناپاک امراض سے تطہیر و پاکی ہے اور ایثار و سخاوت، غریبوں معذوروں کی ہمدردی لاچار مفلس اور تنگدستوں کی امداد و اعانت یتیموں بے سہارا بیواؤں کی تربیت اور عزیزوں کے ساتھ صلہ رحمی جیسے کمالات و فضائل کا حصول ہے۔ زکوٰۃ کے وضعی معنی ہی پاکی کے ہیں۔ تو طہارت و تزکیہ کا مفہوم اور اثر اس عبادت سے کیسے جدا ہو سکتا ہے۔

تزکیۂ نفس کا یہ شعبہ خداوند عالم کی نظر میں بڑا ہی محبوب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرا وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم ولا

(بے شک جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات دن چھپا کر اور (لوگوں کے درمیان) ظاہر طور پر تو ان کے واسطے اجر ہے

خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ | ان کے رب کے نزدیک اور نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

والذین یؤتون ما اٰتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون اولٰئک یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون۔

اور وہ لوگ جو دیتے ہیں (اللہ کی راہ میں) جو کچھ بھی انھوں نے دیا اور حال یہ کہ ان کے دل ڈرتے ہوئے ہیں اس بات سے کہ بیشک وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں یہی ہیں وہ لوگ جو خیر کے کاموں میں دوڑنے والے ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ ہی ان کی طرف سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔

ویطعمون الطعام علٰی حبہٖ مسکیناً ویتیماً واسیراً۔ انّما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً۔

اور کھلاتے ہیں وہ کھانا باوجود اس کے ردلوں میں محبوب ہونے کے مسکین ویتیم اور گرفتار (مصائب) کو جن کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ کہتے ہوتے ہیں جزیں نیست کہ کھلاتے ہیں ہم تم کو صرف اللہ کی رضامندی کے لئے نہیں چاہتے ہم تم سے کسی بدلہ کو اور نہ شکر گذاری۔

تہذیب نفس کے ماتحت علم التحلیۃ کی چوتھی قسم حج ہے۔

حج بھی تزکیہ نفس اور تحلیہ دونوں ہی کو جامع ہے کیونکہ اس کی حقیقت شہوات نفسانیہ اور لذائذ طبعیہ سے اجتناب کے ساتھ اصول ملت ابراہیمیہ کی عملی تکمیل ہے شعائر اللہ کی تعظیم، مقامات مقدسہ کی حاضری خانۂ خدا کا طواف۔ حجر اسود کی تقبیل (چومنا) نحر و قربانی مشعر حرام پر حق تعالےٰ کا ذکر اور دعائیں غرض یہ سب کچھ عشق و محبتِ خداوندی کی والہانہ ادائیں ہیں جن کو اس پاکیزہ عبادت میں جمع کر دیا گیا کہ ایک انسان اپنے وطن گھر بار راحت و آرام کو چھوڑ کر بیت عتیق کی جانب پراگندہ بال اور خستہ حال چلا آرہا ہے نہ اس کو زیب و زینت کے لباس کی اجازت ہے اور نہ خوشبوؤں سے دل بہلانے کی گنجائش اور نہ ہی عورتوں کی طرف میلان و توجہ کی اجازت۔ نہ جنگ وجدل اور زبان سے بے ہودہ الفاظ کے تلفظ کا امکان غرض عالم کے گوشہ گوشہ سے اس حالت کے ساتھ اپنے رب کے گھر کی جانب چلا آرہا ہے۔

واذّن فی النّاس بالحج یاتوک رجالاً وعلٰی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق۔ لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات۔

وللہ علی النّاس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً۔

اسلام کے ان بنیادی اور عظیم المرتبت ارکان و فرائض کے علاوہ علم تہذیب نفس کے ماتحت اور بھی بہت سے

علوم ہیں جن پر انسان کی سعادت، کا دارومدار ہے۔ اور قرآن کریم میں ان علوم کی ہدایت فرمائی جن کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے [۱]۔

(۱) ذکراللہ یعنی حق تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور تہلیل وتقدیس چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے غرض انسان کے جملہ احوال زندگی میں ذکراللہ بڑی عظیم سعادت ہے۔ ادیان سماویہ میں ذکراللہ سے بڑھ کر کوئی چیز روح کو روشنی بخشنے والی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ان لکل شیئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ۔ کیونکہ انوار الٰہیہ سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں اور روح سے زائد کوئی متاثر نہیں۔ جب مادیات میں یہ بات جاری ہے کہ ایک چیز دوسری میں مل کر اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ گلاب اور چنبیلی کے پھول پانی میں پڑنے کے بعد پانی کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں۔ تو ذکراللہ کے انوار قلب میں سرایت کرنے کے بعد قلب وروح کو اپنے انوار میں کیوں نہ رنگیں گے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا۔

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم۔ یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً وسبحوہ بکرۃً واصیلاً۔

(۲) آیات قدرت دلائل آفاق وانفس میں غور وفکر اور مراقبہ کرنا۔ یعنی ان کے احوال وتغیرات میں نظر وفکر کر کے خدائے قادر تک پہنچنا۔ گویا جملہ مخلوق اس کے کمالات اور آثار قدرت اور جمال ربوبیت کا ایک صاف وشفاف آئینہ ہے۔ اس لئے جب بھی انسان کسی چیز کو نظر صحیح سے دیکھے گا تو اس کو خدا ہی نظر آئے گا۔ یہ ایک وسیع علم ہے جسکو قرآن نے بڑی اہمیت اور عظمت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیی بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیات لقوم یعقلون (بقرہ)

تو کائنات حسی کا یہ مجموعہ ارباب عقل کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ان میں حق تعالیٰ کے جمال ربوبیت کا پورا پورا مشاہدہ کرلو۔ آسمان وزمین کی پیدائش اور ان میں بسنے والی مخلوقات شمس وقمر اور تمام کواکب کی تخلیق اور انکی نورانیت کی کمی بیشی ان کا طلوع وغروب پھر ان کی کشش اور تاثیرات۔ رات دن کا انقلاب۔ سمندروں کی سطح پر کشتیوں اور جہازوں کا دوڑنا اور سمندروں میں سے انسانوں کا کارآمد اور قیمتی اشیاء کا نکالنا۔ بادلوں سے بارش کا برسنا اور اس سے خشک اور بنجر زمین کا تروتازہ اور شاداب ہوجانا۔ ہواؤں کا لوٹنا پلٹنا۔

---

[۱] البیان فی علوم القرآن ص ۳۶۲

آسمان و زمین کے درمیان فضا میں بادلوں کا پیدا ہونا اور ان کا مسخر رہنا۔ ان میں سے بجلی کی چمک اور کڑک کا پیدا ہونا یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی کمال قدرت اور اس کی خالقیت کے نمونے اور دلائل ہیں جو ان میں غور و فکر کرتے ہیں وہ بول اٹھتے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

(۳) توکل علی اللہ۔ یعنی ہر ایک کام اور ہر حال میں اسی کے دستِ قدرت کا نگران رہنا اسی پر بھروسہ کرنا مادی اسباب اور ظاہری وسائل سے نظریں ہٹا کر مسبب الاسباب اور خالق کائنات کی قدرت پر اعتماد و بھروسہ کرنا توکل کی حقیقت ہے۔ اور اسباب کو مؤثر بالذات سمجھنا یا ایسا طریقہ اختیار کرنا جیسا کہ مؤثر بالذات ہونے کا اعتقاد رکھنے پر مرتب ہو سکتا ہے تو یہ قدرت خداوندی میں غیر اللہ کا شریک کرنا ہوگا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ (اور جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہے بس وہی اس کا چارہ ساز ہے)

(۴) شکر۔ کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں پر زبان و دل اور اپنے عمل سے شکر گذار رہے۔

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ اور جو شخص شکر کرتا ہے (حق تعالیٰ کی نعمتوں پر) تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی نفع کے لئے اور جو شخص ناشکری کرے تو پھر اللہ بھی (ا س سے) بے نیاز (اور ہر حال میں) مستحق حمد و ثنا ہے۔

اس کی نعمتیں بے شمار ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ مگر انسان کفرانِ نعمت کر کے ظلوم کفار بن جاتا ہے۔

(۵) صبر۔ مصائب و تکالیف پر صبر و تحمل کرنا اور جو کچھ تقدیر خداوندی ہو اس پر راضی رہنا اور ہر تکلیف و پریشانی کو اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اس پر ثواب آخرت کا امیدوار رہنا۔ انسان کی دو حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں وہ غافل ہو جاتا ہے۔ حالتِ نعمت کہ جس میں آدمی مست اور مغرور ہو جاتا ہے۔ اور مصیبت کہ جس میں ناامید ہو کر رشتۂ محبت و اخلاص توڑ ڈالتا ہے۔ صبر کی تعلیم میں دونوں کی اصلاح مضمر ہے۔ فرمایا۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ الآیۃ

(۶) صداقت و راستی۔ ہر قول و فعل میں صدق و سچائی کا پابند رہنا خواہ کوئی معاملہ خدا کے ساتھ یا بندوں کے ساتھ ہو جیسا کہ ارشاد ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین۔

(۷) زہد و تقویٰ۔ کہ دنیا کے لذائذ و شہوات اور زیب و زینت سے دل کو پاک رکھے اور اپنی زندگی پورے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مصداق بنالے کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ

سبیلٍ - کہ تو دنیا میں رہ اس طرح کہ گویا ایک مسافر ہے یا راستہ طے کر رہا ہے ۔

اس علم کو خداوند عالم نے بڑی عظمت اور اہمیت کے ساتھ قرآن کریم میں مختلف پیراؤں میں بیان فرمایا۔ بلکہ قرآن کا بہت بڑا حصہ زہد و تقویٰ اور قناعت ہی کی تعلیم پر مشتمل ہے ۔ مثلاً

واضرب لهم مثل الحيوة الدنيا كماء انزلناه من السماء فاختلط به نبات الارض فاصبح هشيما تذروه الرياح وكان الله على كل شئ مقتدرا۔ المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والباقيات الصالحات خير عند ربك ثوابا وخير املاً (کہف)

اور آپ بیان کر دیجئے ان لوگوں کے لئے مثال دنیوی زندگانی کی کہ وہ (ایسی ہے) جیسے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی کے ذریعہ زمین کے نباتات خوب گنجان ہو گئے ہوں پھر وہ بعد اس کے کہ تروتازہ اور سرسبز تھے خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاویں کہ اس کو ہوائیں اُڑائے پھرتی ہو (یہی حال بس حیات دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آرہی ہے کل اس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا) اور اللہ تعالیٰ تو بڑا قادر ہے ہر چیز پر (جب چاہے کسی چیز کو پیدا کرے اور جب چاہے شاداب و سرسبز بنائے اور پھر جب چاہے پارہ پارہ کر ڈالے) مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے (جو سبزوں کی شادابی کی طرح بہت ہی جلد زوال پذیر رونق ہے) اور جو اعمال صالحہ (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے) باقی رہنے والے ہیں وہی آپ کے رب کے نزدیک بہتر ہے باعتبار ثواب کے اور باعتبار امید امید قائم کرنے کے ۔

(۸) اعتبار و تذکیر۔ یعنی گذشتہ واقعات اور امم سابقہ کے احوال کو بیکار اور محض تاریخ کے اوراق پارینہ نہ سمجھنا بلکہ ان میں غور و فکر کر کے عبرت و نصیحت حاصل کرنا اور گذشتہ زمانہ کے نیک و بد اعمال پر اچھے اور برے مرتب شدہ آثار و نتائج کو دیکھ کر یہ جان لینا کہ ہمارے نیک و بد اعمال و احوال بھی انہی نتائج اور ثمرات کا باعث ہو سکتے ہیں اس لئے قرآن کریم نے گذشتہ اقوام کے واقعات قرآن کریم میں ظاہر کر دیے کہ اب ان پر اپنی حالتوں کا خود اندازہ کرلو۔ عبرت کے کانوں سے سنو اور عبرت کی نگاہوں سے دیکھو اور قلبی صلاحیتوں کے ذریعہ ان سے نتائج اخذ کرو اسی وجہ سے ہر موقعہ پر اس کی تصریح اور تنبیہ فرما دی گئی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور فرعون کا واقعہ ۔ اس میں کہیں تو فرعونیوں کے ظلم و ستم ظاہر کر کے ان سے بنی اسرائیل کی خلاصی دینے کی نعمت کا اظہار مقصود ہے ۔ اور کسی موقع پر فرعون کی سرکشی اور خدا کے پیغمبر کے ساتھ مقابلہ کرنے کا انجام تباہی اور غرق ہو جانا مقصد بیان ہے جس کے ذریعہ قریش مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر تمہارا بھی یہی طرز رہا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا تو تم بھی تباہ ہو جاؤ۔ اسی نوع کی بربادی اور تباہی کے لئے اس کے ساتھ ان واقعات میں اہل ایمان کو صبر و استقامت کی تعلیم اور تسلی دینا مقصود ہوتی ہے کہ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ

الصّابِرِین۔ اور فاصبِر اِنَّ العاقِبۃَ لِلمُتَّقِینَ ۔ کہ حق تعالیٰ کی سنت اسی طرح ہے کہ جب کوئی قوم اہلِ حق پر ظلم و تعدی کرتی ہے تو ایک عرصہ تک اللہ ان کو مہلت دیتا ہے۔ پھر ناگہاں قہر خداوندی ان پر ایسا مسلط ہوتا ہے کہ ان کی ساری طاقت اور سب شان و شوکت پامال ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ ان طاقتور لوگوں کے مال و دولت کا اس قوم کو وارث بنا دیتا ہے جو انتہائی حقیر اور ذلیل خیال کیے جاتے تھے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْھَا۔

اور وارث بنا دیا ہم نے اس قوم کو جو کہ ضعیف اور کمزور سمجھے جاتے تھے زمین کے مشرق و مغرب کے ان کناروں کا جن میں ہم نے بڑی برکتیں رکھی تھیں۔

کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ وَّنَعْمَۃٍ کَانُوْا فِیْھَا فٰکِھِیْنَ کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ

ان فرعونیوں نے چھوڑ دیے (اپنی ہلاکت کے بعد) بہت سے باغ چشمے عمدہ مکان اور عیش و راحت کے وہ سامان جن میں وہ مست تھے۔ بات یوں ہی ہے (خدا کی طرف سے طے کردہ) اور وارث بنایا ہم نے ان چیزوں کا ایک دوسری قوم کو۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ۔

اور ہم ارادہ کرتے ہیں اس کا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو سرزمین مصر میں حقیر و کمزور سمجھے گئے اور انہی کو ہم امام بنائیں اور انہی کو فرعونیوں کا وارث بنا دیں۔

بہر کیف اسی طرح قرآن کریم میں بیان کردہ تمام واقعات سے مخاطبین کو درس عبرت دینا مقصود ہوتا ہے۔

(۹) علم التواضع ۔ کہ انسان کی گفتار و رفتار نشست و برخاست لباس وضع قطع کے وہ تمام آداب جنکی رعایت سے انسان کی زندگی نہایت ہی شائستہ اور قابلِ تحسین زندگی ہو۔ قرآن کریم نے اس علم کو بھی خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی نرمی اخلاق اور محاسن آداب کا ایک کامل پیکر دنیا کے سامنے کر دیا۔ جیسے کہ ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ۔

اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ اس کے باعث آپ ان لوگوں کے لئے نرم مزاج ہیں اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اطراف سے منتشر اور دور ہو جاتے۔

اور مثلاً فرمایا۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔

کہ لوگوں کے سامنے گال نہ پھلا (یعنی تکبرانہ صورت نہ بنا) اور نہ زمین پر اتراتا ہوا اکڑتا ہوا چل۔ بے شک تو زمین نہ پھاڑ سکے گا۔ اپنے مغرورانہ انداز رفتار سے

اور نہ ہی اکڑ کر چلنے میں، تو پہاڑوں سے زائد بلندی میں پہنچ جائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ یقیناً اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا ہے کسی بھی اکڑ کر چلنے والے متکبر انسان کو۔

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ۔ تو اپنی رفتار میں درمیانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ کیونکہ آوازوں میں بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

(۱۰) امر بالمعروف نہی عن المنکر یعنی بھلائیوں کا حکم اور ان کی تبلیغ و اشاعت اور برائیوں سے روکنا۔ یہ بھی ایک نہایت وسیع علم ہے فرمایا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اے امت محمدیہ! تم وہ بہترین امت ہو جو دنیا والوں کے لئے پیدا کی گئی اس حال میں کہ تم امر بالمعروف کرتے ہو اور نہی عن المنکر۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر حسن تمدن اور اصلاح معاشرہ کی حقیقی روح ہے۔

(۱۱) استغفار۔ خدا سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگنا اور ان پر ندامت و شرمندگی کے ساتھ یہ عزم کرنا کہ آئندہ اس معصیت کا مرتکب نہیں بنوں گا۔

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ اے مومنو تم سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو گناہوں سے تائب ہوتے ہوئے شاید یہ کہ تم فلاح و کامیابی حاصل کر لو۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ جز این نیست کہ توبہ اللہ کی بارگاہ میں ان لوگوں کے لئے (لائق قبول) ہے کہ جو برائی کا کام کر لیتے ہیں غفلت اور جہالت سے پھر فوراً ہی وہ تائب ہوتے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رجوع فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

(۱۲) رجاء و امید برحمت خداوندی یعنی استغفار و توبہ کے بعد حق تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بخشش کا امیدوار رہنا۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ کہدیجئے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و تعدی کی ہے، مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دے گا تمام گناہوں کی بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

(۱۳) خوف و خشیۃ از عذاب خداوندی۔ کہ ہمیشہ اپنی معصیتوں پر ڈرتا رہے کہ کوئی عذاب و قہر نہ مسلط ہو جائے۔ ارشاد فرمایا۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ ڈرتے رہنا چاہئے ان لوگوں کو جو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی

تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ۔

کرتے ہیں اس بات سے کہ ان کو کوئی فتنہ (مصیبت) نہ پہنچ جائے (دنیا میں) یا آخرت میں (بھی) دردناک عذاب ان کو پہنچے۔

(۳) دعا۔ بارگاہِ خداوندی ہی سے انسان کا اپنی تمام حاجتوں کا طالب ہونا۔

اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ

اے میرے بندو! تم مجھے پکارو (اور مجھ سے مانگو) میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔

علم تہذیب نفس کے یہ تمام شعبے وہ ہیں جو انسان کی انفرادی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصولی اور اجمالی طور پر جن کے صرف عنوانات اور بطور مثال بعض آیات سے استشہاد کے ساتھ پیش کردیئے گئے

علم تدبیر منزل

قوتِ عملیہ کا دوسرا شعبہ علم تدبیر المنزل ہے یعنی وہ امور اور احوال جو باہمی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں ان کے جاننے کو علم تدبیر المنزل کہتے ہیں۔ جیسے کہ بیع و شراء نکاح و طلاق اور میراث وغیرہ اس شعبہ سے متعلق بھی بہت سے آداب و علوم ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا۔ مثلاً

(۱) والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لاتعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا۔

اور یاد کرو جبکہ ہم نے عہد لیا بنی اسرائیل سے اس بات کا کہ نہ عبادت کرنا تم کسی کی سوائے اللہ کے! اور (عہد لیا ہم نے) والدین کے ساتھ احسان کا۔

واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رّب ارحمهما كما ربّياني صغيرا۔

اور جھکا دے اے انسان تو اپنے ماں باپ کے سامنے ذلت و تواضع کی بازو اور دعا کر ان کے لئے کہا ے پروردگار رحم فرما ان پر جیسا کہ یہ دونوں مجھ پر رحمت و شفقت کے ساتھ تربیت کیا کرتے تھے۔

ووصينا الانسان بوالديه احسانا اما يبلغنّ عندك الكبر احدهما او كلاهما فلا تقل لهما اُفٍّ ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما۔

اور وصیت کی ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی — اگر ترے پاس رہتے ہوئے پہنچ جائے بڑھاپے کو کوئی ایک ان میں سے یا دونوں تو پھر اُف بھی نہ کر ان کے سامنے اور نہ ان کو جھڑک (بلکہ) ان سے بات کر عزت و احترام کی۔

(۲) صلہ رحمی۔ جس کے لئے حق تعالےٰ کا یہ فرمان بنیاد اور اصل الاصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔ حق ادا کر قرابت داروں کا اور مسکین و مسافر کا بھی۔

حقوق قرابت میں تمام انواع کی قرابتیں شامل ہیں۔ قرابت نسبی۔ قرابت سببی یعنی دامادی وغیرہ کے رشتے۔ قرابت محبت و دوستی۔ قرابت وطن و ہمسائگی۔ قرابت کی ہر قسم کے احکام متعدد ہیں جو اصولِ شریعت میں بیان کیے گئے۔

(۳) ان تمام امور سے اجتناب و پرہیز جو امن عام میں خلل انداز ہوں مثلاً زنا قتل نفس چوری ڈکیتی خیانت و دغابازی۔

(۴) باہمی اتفاق و محبت۔

وكنتم اعداءً فالّف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔ اے لوگو! تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی تو تم ہوگئے حق تعالے کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی۔

(۵) سخاوت و ایثار۔ اور ہمدردی۔ اور امور خیر و فلاح میں ایک دوسرے کی مدد۔

تعاونوا على البرّ والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان واتقوا الله۔

(۶) قوانین معاملات۔ یہ بڑا ہی وسیع علم ہے۔ معاملاتی زندگی کی جملہ رہنمائی قرآن کریم کے انہی اصول و قوانین سے ہے۔ مثلاً قوانین بیع و شراء۔ رہن و استقراض قانون تزویج اور نکاح و طلاق اور خلع۔ قانونِ حدود و قصاص۔ قرآن کا بہت بڑا حصہ ان احکام و قوانین پر مشتمل ہے۔

(۷) باہمی معاہدات کی پابندی۔ جس کے لئے بنیادی امر "یاایھاالذین اٰمنوا اوفوا بالعقود" ہے۔

(۸) جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے اصول۔ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔

(۹) خودداری اور کسب معاش کے قوانین۔ اَحلّ اللہ البیع وحرم الربوا۔

(۱۰) کسب و اکتساب اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے بحری اور بری سفر۔ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔

(۱۱) تحصیل علم اور اس کی اشاعت کے لئے سفر۔ مثلاً فرمایا۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ کیوں نہ نکلا ہر قوم میں سے ایک گروہ تاکہ وہ لوگ احکام

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ۔ دین سیکھتے اور ڈراتے (عتاب خداوندی سے) اپنی قوم کو جبکہ وہ لوٹتے ان کی طرف۔

(۱۲) کفایت شعاری اور درمیانہ روی کی تعلیم تاکہ بخل اور اسراف کی ذلت سے قوم کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔

وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔

(۱۳) لغو اور بیہودہ کاموں اور باتوں سے اعراض اور نفرت کرنے کی تعلیم۔

هم عن اللغو معرضون۔ ناچ رنگ گانے بجانے اور وہ تمام بیہودگیاں جو معاشرہ کو تباہ کرنے والی ہیں ان سے پرہیز کرنے کی ہدایت۔

(۱۴) خصوصاً شراب خوری اور قمار بازی کی ممانعت۔ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(۱۵) بدگوئی، بدکلامی، تفاخر و تعلی اور لوگوں کے انساب پر طعنہ زنی کی ممانعت۔ یہ باتیں قوم میں باہمی عداوت اور منافرت پیدا کرتی ہیں تو ان عیوب سے معاشرہ کو پاک رکھنے کی تعلیم بہت اہمیت کے ساتھ فرمائی گئی۔ یہ علم بہت وسیع علم ہے۔ اور علم الاخلاق کے ہی یہ تمام شعبے ہیں۔ جس کی قدرے وضاحت تہذیب نفس کی پہلی شاخ میں گذر چکی۔

(۱۶) انسانی حقوق کا تحفظ اور ان میں مساوات کی تعلیم۔ جیسے کہ فرمایا گیا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ تمام مومن آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس اے لوگو! اپنے بھائیوں سے معاملات بہتر رکھو۔

إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ بے شک جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ ناک کے بدلے ناک کان کے بدلہ کان دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں (کے حکم) میں برابری ہے۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثٰى بِالْأُنْثٰى۔ حُر یعنی آزاد قتل کیا جائیگا حُر کے بدلے اور غلام قتل کیا جائیگا غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے میں (یہ نہیں کہ غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کیا جائے یا آزاد کے بدلہ قصاص میں اس کے قاتل آزاد شخص کو نہ مارا جائے بلکہ کسی غلام کو بطور فدیہ قصاصاً قتل کر دیا جائے۔)

غرض یہ سب احکام انسانی حقوق مساوات کے لئے معیار اور بنیاد ہیں۔ یہ تمام علوم تدبیر منزل سے متعلق ہیں اور ان کو کلام اللہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

علم سیاست مدنیہ

جو امور نظام سلطنت و مملکت سے تعلق رکھتے ہیں ان کے جاننے کو علم السیاستہ کہا جاتا ہے۔ انسان کی عملی قوتوں کی درستگی اور سعادت اس علم پر بھی موقوف ہے۔ اس لئے قرآن میں علم سیاست مدنیہ کے متعلق بھی بہت کچھ اصولی اور بنیادی احکام موجود ہیں۔ تاکہ ان اصول و قوانین کی اتباع سے کائنات دنیا میں اسی مالک و شہنشاہ کا نظام جاری ہو جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔

"کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ" اسی تکوینی مقصد کا اعلان ہے۔ اس کے تحت بہت سے علوم ہیں جو آیات قرآنیہ سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔

(۱) جمہوری طرز پر نظام سلطنت کا قیام جس کی بنیاد شوریٰ ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔

"وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ۔ کیونکہ انسانی حقوق کا تحفظ اور مساوات شورائی نظام میں محدود و منحصر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس حالانکہ معصوم تھی۔ ہر امر اور معاملہ میں وحی خداوندی آپ پر اترتی تھی۔ آپ کا ہر لفظ اور ہر خطاب وحی الٰہی تھا "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ آپ کا ہر عمل اور ہر حال قانون شریعت تھا مگر بایں ہمہ آپ کو بھی خداوند عالم نے "وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ" کے خطاب سے جماعت کے درمیان ارباب حل و عقد سے مشورہ کا مامور فرمایا تاکہ یہ شورائی نظام امت کے لئے آپ کی حیات مبارکہ سے نمونۂ عمل اور لائحہ زندگی بن سکے۔ اسی وجہ سے ابوبکرؓ کے لئے خلافت کا مسئلہ شوریٰ اور عامۃ المسلمین کے رائے ہی کے ذریعہ طے پایا۔ عمر فاروق نے اپنے بعد جانشینی کا مسئلہ ارباب حل و عقد کی ایک مجلس شوریٰ تشکیل فرما کر اس کے حوالہ کر دیا۔ تو یہ سب امور نظام مملکت کے بنیادی طور پر وامرھم شوریٰ بینھم کے قانون پر دائر ہو رہے تھے۔

(۲) اولو الامر کی اطاعت جبکہ ان کی اطاعت اطاعۃ اللہ اور اطاعت رسول کی فرع ہو اور ان کی اطاعت سے کسی حکم خداوندی یا فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت صراحۃً یا دلالۃً لازم نہ آتی ہو یعنی اولو الامر کے احکام قوانین الٰہیہ کی تنفیذ و اشاعت کا درجہ رکھتے ہوں نہ کہ تنسیخ و تردید کا۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ — اے مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مؤمنین میں سے اولو الامر کی۔

تو یہ بھی علم سیاست کے ماتحت ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ جس کے احکام و فروع کی تفاصیل احادیث میں کی گئی جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ وان امر علیکم عَبْدٌ حَبَشِیٌّ (الحدیث) — کہ تم پر لازم ہے امیر کے احکام سننا اور ان کی اطاعت

کرنا اگرچہ امیر بنا دیا جائے تم پر کوئی حبشی غلام۔

(۳) سلطنت کی جان و مال سے مدد کرنا۔ قرآن نے اس بنیادی اصل کو بکثرت مختلف عنوان اور پیراؤں میں بیان کیا۔ مثلاً

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔

بے شک اللہ نے خرید لیا ہے مؤمنین سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو بعوض اس کے کہ ان کے واسطے جنت ہے اس طرح کہ قتال کرتے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں پس وہ قتل کریں گے کافروں کو اور شہید ہو جائیں گے

(۴) ظاہر و باطن اور ہر حال میں باہمی اتحاد۔ شقاق و نفاق اور باہمی اختلاف کی ممانعت۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ مملکت کے استحکام کے لئے رعیت کا باہمی اتفاق ضروری ہے تشتت وانتشار اور فرقہ بندیاں قوم اور ملک کو تباہ و برباد کرکے چھوڑتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس عظیم اصل کو بیان فرمایا۔

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا۔ حَتّٰى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔

(۵) اخفاء تدابیر اور مہمات امور یا سلطنت کے راز محفوظ رکھنا۔

(۶) دشمنوں کے احوال ان کی تدبیروں اور سازشوں سے مطلع رہنا۔ کلام اللہ میں رباط کا حکم اس کی بنیاد و اصل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا۔

(۷) اعداد قوت یعنی سامان حرب اور اسلحہ کا مہیا اور تیار کرنا۔ قوم کو مضبوط بہادر اور جفاکش ہونے کا حکم دینا اور اس کے اسباب مہیا کرنا۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

اور مہیا کرو کافروں (سے قتال) کے لئے جہاں تک ہو سکے طاقت (اسلحہ اور سامان حرب کی) اور گھوڑوں کا باندھنا جس سے مرعوب کرو تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔

اے ایمان والو! جب مقابلہ کرو تم کافروں کا میدان جنگ میں تم پیٹھ پھیر کر نہ بھاگو ان سے اور جو شخص بھی اس روز پیٹھ پھیر کر بھاگے گا بجز اس کے کہ جو کوئی تدبیر کرنے والا ہو قتال کی یا (پیچھے ہٹ کر) مل جانے والا ہو وہ اپنے گروہ سے تو ان دو کے علاوہ جو بھی پیچھے بھاگنے والا ہوگا وہ لیکر لوٹے گا خدا کے عذاب کو اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت ہی بدترین ٹھکانا ہے۔

(۸) صبر و استقامت اور تحمل شدائد۔ اگرچہ یہ علم تہذیب نفس سے متعلق ہے لیکن جس طرح کہ یہ وصف انفرادی زندگی میں مطلوب اور انسانی زندگی کے لئے باعث کمال اور سبب زینت ہے اسی طرح یہ صفت کسی قوم کی حیات اجتماعی کیلئے بھی فوز و فلاح کی بنیاد ہے۔ کیونکہ کسی ملک کی سیاست اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم میں من حیث المجموع صبر و استقامت اور تحمل شدائد کا وصف موجود نہ ہو۔ قرآن کریم نے نمایاں طور پر اس وصف کو تائید غیبی اور فتح و کامرانی کا سبب فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا۔

اور اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کا فریب تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ

ہاں! بیشک اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو اور دشمن کی کمک فوراً تمہارے سامنے پہنچ جائے تو اللہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہیں کمک پہنچائے گا جو علامت و نشان لگے ہوئے ہوں گے

تو معلوم ہوا کہ صبر و تقویٰ وہ چیز ہے جس کے اختیار کرنے پر آسمان سے مدد پہنچتی ہے۔ قید و بند کے تمام شدائد برداشت کرنے کے بعد قدرت خداوندی نے اسی سرزمین پر یوسف علیہ السلام کو غلبہ اور حاکمیت کی شان عطا فرمائی۔ اور خزائن ارض پر متصرف بنایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلمات نے تائید غیبی کے اس معیار کو ان الفاظ میں تعبیر فرمایا۔

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

اللہ نے ہم پر یقیناً احسان فرمایا۔ بلاشبہ جو شخص تقویٰ اور صبر اختیار کرے تو حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتا نیکو کاروں کے اجر کو۔

ان علوم و مسائل کو قرآن کریم نے سیاست مدنیہ کے بنیادی اصول کے طور پر بیان کیا ہے جن کی تفصیل بڑے شرح و بسط کے ساتھ احادیث نبویہ میں موجود ہے[1]

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ۔ الفوز الکبیر میں بیان فرماتے ہیں، تمام علوم قرآنیہ کو پانچ علم جامع ہیں جن پر تمام مضامین دائر ہیں۔ اور یہ علوم پنجگانہ ان سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

اول علم الاحکام۔ یعنی بندوں کے لئے دین و دنیا میں جو امور ضروری اور نافع ہیں ان کا بیان کرنا جن کے تحت فرض، واجب اور مستحب کی تمام قسمیں داخل ہیں۔ اور جو چیزیں مضر ہیں ان کے ضرر کے درجہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے روکنا جس کے تحت حرام، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کی قسمیں شمار کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ ارشاد

[1] ملخص من الاتقان والبیان فی علوم القرآن وغیرہما من کتب الاصول ۱۲

فرمایا ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث علم الاحکام ہی کے ماتحت علم تہذیب نفس تدبیر منزل اور سیاست مدینہ کے تمام شعبے داخل ہیں۔

دوم علم التذکیر بآلاء اللہ یعنی آسمانوں زمینوں اور جملہ مخلوقات کی پیدائش اور کائنات میں ودیعت فرمودہ انعامات کا بیان فرمانا جس سے مقصد حق تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کی معرفت کے بعد اس کی اطاعت وبندگی پر انسانوں کو آمادہ کرنا ہوتا ہے مثلاً۔

اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانھار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار واٰتاکم من کل ما سألتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار۔ (ابراھیم)

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے واسطے رزق پیدا فرمایا۔ اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی اور جہازوں کو مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم سے دریا میں چلے اور تمہارے نفع کے لئے نہروں (سمندروں) کو بھی تابع بنایا اور تمہارے ہی نفع کے لئے سورج اور چاند کو اپنی قدرت کا مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو مسخر بنایا اور وہی تم کو ہر وہ چیز جو تم نے مانگی (اپنی فطری تقاضوں سے یعنی انسانی زندگی جن اشیاء کی محتاج ہے اور جو چیز انسان ایسی طلب کرے جس میں اس کے واسطے فلاح و منفعت ہے) اور اگر تم شمار کرنے لگو اللہ کی نعمتوں کو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ انسان بہت ہی ناانصاف اور ناشکرا ہے۔

اسی طرح اس مضمون کی تمام آیات قرآنیہ جن میں سورۂ انعام کا رکوع ان اللہ فالق الحب والنوی تذکیر بآلاء اللہ کی نمایاں خصوصیت اور جامعیت کی شان رکھتا ہے (تفاسیر میں ملاحظہ فرمایا جائے)

سوم علم التذکیر بایام اللہ۔ یعنی ان واقعات و حوادث کا بیان جن میں حق تعالیٰ نے مطیعین و فرمانبرداروں کی خوبیاں اور انعامات و جزاء کا اور نافرمانوں اور سرکشوں کی برائیاں اور ان پر دنیوی اور اخروی عذاب و سزا کا ذکر فرمایا۔

چہارم علم المخاصمہ یعنی گمراہوں کے عقائد باطلہ کا رد جن میں خصوصیت کے ساتھ قرآن کے مخاطب چار گمراہ فرقے ہیں۔ یہود۔ نصاریٰ۔ مشرکین اور منافقین۔

پنجم علم التذکیر بالموت یعنی انسان بلکہ تمام عالم کے فنا کے احوال بیان کرنا کہ انسان و عالم کی ابتداء آفرینش کیونکر ہوئی پھر اس پر کس طرح موت طاری ہوتی ہے۔ اور اس دنیوی موت کے بعد کیا احوال و کیفیات اس پر حشر و نشر حساب وزن اعمال اور جزاء و سزا کے پیش آئیں گے مثلاً۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۔

اور بیشک پیدا کیا ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے پھر ہم نے اس کو بنایا نطفہ جو کہ ایک مدت تک ایک محفوظ مقام (رحم) میں رہا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر اس بستہ خون کو گوشت کی بوٹی بنا ئی۔ اور پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ان تمام تغیرات کے بعد ہم نے (اس میں روح پھونک کر) ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا جو حالات سابقہ کے اعتبار سے ایک نئی مخلوق معلوم ہوتی ہے) پھر تم بعد اس تمام قصہ (اور احوال) کے ضرور مرنے والے ہو اور پھر بے شک تم سب قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

یہ علوم پنجگانہ قرآن کریم کے بنیادی مضامین ہیں ان پر حق تعالےٰ نے اس قدر کثرت سے دلائل و براہین قائم فرمائے کہ ادنیٰ تردد اور شبہ کا مقام نہ رہا بجز اس کے کہ معاند قسم کے انسان دیدہ و دانستہ حقانیت کے واضح ہونے کے بعد بھی اپنی ضد اور مخالفت پر ڈٹے رہیں۔ وہ تو بس اس کا مصداق ہیں وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا کہ انکار کیا ان لوگوں نے آیات قرآنیہ کا (اور حال یہ کہ یقین کئے تھے ان باتوں پر ان کے دل) محض ظلم اور غرور و تکبر کی وجہ سے۔

وہ گمراہ فرقے جن کا قرآن کریم نے رد فرمایا

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے ایک ہی سچا دین رہا۔ اور تمام دنیا اسی پر متفق رہی پھر ایک مدت دراز اور بہت سے قرن گذرنے پر دین میں حق اور باطل کا اختلاف لوگوں نے ڈالا تو حق تعالےٰ نے ایسے انبیاء کے مبعوث فرمانے کا سلسلہ شروع فرمایا جو لوگوں کے اعمال اور عقائد کی اصلاح فرمائیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔

سب لوگ تھے ایک ہی دین پر پھر اللہ تعالیٰ نے بھیجان میں پیغمبر بشارت سنانے والے (اہل ایمان و صلاح کو) اور ڈرانے والے (نافرمانوں کو)

اسی مضمون کی دوسری متعدد آیات میں بھی یہی فرمایا گیا کہ سب لوگ قوانین ملت اور اصول فطرت میں ایک تھے اور جس فطرت صحیحہ اور سلیمہ پر حق تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اسی پر قائم تھے مگر بعد میں خلاف فطرت امور اختیار کرنے لگے تو اس کی اصلاح کے لئے انبیاء بھیجے گئے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ اسی وجہ سے تمام پیغمبر

اصول دین میں مشترک ہیں کیونکہ سب کا مقصد انسانوں کو گمراہی کے طریقہ سے ہٹا کر اصل فطرت کے تقاضے کے مطابق معبود حقیقی کی عبادت کی طرف ان کے رخ پھیر دینا ہے۔ اختلاف محض فروع اور جزئیات میں ہے یہی وہ چیز ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات اشارہ کر رہے ہیں کہ کل انبیاء علاتی بھائی ہیں باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں یعنی اصول شریعت میں متحد ہیں اور فروع میں اختلاف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تندرستی ایک شئے ہے (تمام اولاد آدم کے لئے) اور بیماریاں بے شمار جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز تجویز کر دیا گیا۔ جب کوئی دوسرا مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق کوئی اور دوا پرہیز متعین کر دیا گیا یہی حال انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ہے کہ ان کی شریعتیں روحانی امراض کے علاج ہیں۔ ایک عرصہ تک یوں ہی تدریجی رفتار اصلاح امراض اور ان کے واسطے دواؤں اور معالجات کی جاری رہی یہاں تک کہ آخر میں ایک ایسا طریقہ اور نسخہ تجویز فرمادیا جو سب بیماریوں سے تحفظ کے لئے کافی ہو اور تمام دواؤں اور نسخوں کے بدلے (کام دے اور) کفایت کرے۔ وہ طریقہ اسلام ہے جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا اور قرآن کریم نازل کیا۔

علامہ ابو الشکور سالمی اپنی کتاب التمہید[۵۲] میں فرماتے ہیں کہ شرک کی ابتداء اور ظہور حضرت اخنوخ علیہ السلام (جن کو حضرت ادریس کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے زمانہ سے ہوئی۔ اس دور سے قبل مخلوق نے کبھی کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا البتہ جزئی اور انفرادی طور پر معصیت اور نافرمانی کا صدور ہوا جیسے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے ارتکاب معصیت کیا۔ تو عالم میں جب شرک کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شرک کا رد اور مقابلہ کرنے کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کو دنیا میں مبعوث فرمایا۔ یہی معنی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے اَوَّلُ رسولٍ بُعِثَ اِلی الارضِ نُوحٌ علیہ السلام کہ سب سے پہلے وہ رسول جو مشرکین کے ڈرانے اور ان کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجے گئے وہ نوح ہیں۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو معجزانہ طور پر علم النجوم والرمل عطا فرمایا گیا ہے۔ ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد[۵۳] ان کے چند شاگرد اور خصوصی تلامذہ لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ جن کے نام وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔ یہ پانچوں حضرت ادریس کے

---

۵۱ از فوائد حضرت الشیخ مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ۔ سورۂ بقرہ) ۵۲ التمہید ص ۲۰

۵۳ بعض علماء مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت ادریس پر موت طاری ہوئی۔ اور بعض کا قول ہے کہ ان کو زندہ ہی چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اور یہی معنی "واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقا نبیا ورفعناہ مکانا علیا" کی تفسیر میں بیان کئے۔ تفصیل کے لئے کتب تفسیر کی مراجعت فرمائی جائے۔

بعد شب و روز عبادتِ خداوندی اور قوم کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔ جب یہ بھی اس عالم سے اٹھ گئے تو قوم متحیر اور پریشان رہ گئی کہ اب کس سے احکام دین سیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں۔ کسی نے یہ کہا مناسب ہوگا کہ ہم ان حضرات کے مجسمے بنالیں تاکہ ان کو دیکھنے سے ان کے طور طریق اور ان کی تعلیمات کا تذکرہ رہے۔ اور جو ہدایات ان سے حاصل کی ہیں ان کی یاد دلوں میں تازہ رہے۔ اس پر قوم نے ایسا ہی کیا ان کی تصویریں اور مجسمے بنا کر ہر تصویر کے لئے وہی اسمار تجویز کردیئے۔ اول امر میں تو بات صرف اسی قدر تھی کہ عبادت خدا کی کرتے تھے اور ان تصاویر کو سامنے رکھتے اور ان میں نظر کرنے کو وہ اپنے حق میں عبادت خداوندی میں خشوع و خضوع کا ذریعہ خیال کرتے رہے۔ مگر اس جماعت کے گذر جانے پر ان کی اولاد کے سامنے شیطان آیا۔ اور جو میدان شیطان اس سے قبل ہموار کر چکا تھا اس پر اس نئی ذریت کو ڈالنے کے لئے کھلم کھلا ان بتوں کے توسط ان کے سامنے یہ اعلان کردیا کہ " اے لوگو میں ہی تمہارا معبود اور رب ہوں تمہارا اور تمہارے آبار کا سو تم میری ہی عبادت کرو تمہارے آبار بھی میری عبادت کیا کرتے تھے " اس غافل قوم نے جب یہ ندارِ ابلیس سُنی اور سابق دور میں یہ دیکھے ہوئے تھے کہ ہمارے بزرگوں کی عبادت کے وقت یہ تصویریں ان کے سامنے ہوتی تھیں تو بس سمجھ بیٹھے کہ واقعی ہمارے آباؤ اجداد کے یہی رب اور معبود تھے۔ چنانچہ جب شیطان نے ان کے دلوں میں یہ اعتقاد خوب راسخ کردیا اور وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئے اور ان تصاویر و مجسموں کو سونے چاندی اور پیتل سے تیار کرنا شروع کردیا۔ اور شرک کی خوبُو ان کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گئی کہ اس کے خلاف کوئی آواز بھی سننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ان پہلے مشرکوں کی طرف حضرت نوحؑ کو بھیجا تاکہ وہ ان کو حق تعالیٰ کی عبادت و الوہیت کی طرف دعوت دیں کہ حضرت نوح خدا کا یہ پیغام لیکر قوم کے سامنے آئے۔

یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو تمہارے واسطے کوئی معبود نہیں سوائے اس خدا کے لیکن اس بدنصیب قوم (جن کے دل و دماغ کفر و شرک سے ماؤف ہو چکے تھے) کی طرف سے دعوت نوح کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا۔

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔

اور کہا ان لوگوں نے نہ چھوڑو ہرگز تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو وَدّ کو اور سواع کو اور نہ یغوث و یعوق و نسر کو۔

حضرت نوح ان کو توحید کی طرف دعوت دیتے رہے لیکن وہ کسی طرح باز نہ آئے تا آنکہ ساڑھے نو سو سال کے بعد اللہ کی وحی نے یہ بتادیا

اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

کہ اب کوئی شخص ایمان نہ لائے گا۔ آپکی قوم میں سے بجز اس کے جو لا چکا تو آپ غمگین نہ ہوں ان اعمال کی وجہ جو یہ کر رہے ہیں۔

تو مایوسی کے بعد دعا فرمائی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔

اے میرے پروردگار مت چھوڑ تو زمین پر کافروں میں سے ایک بھی باشندہ بیشک اگر تو چھوڑ یگا ان کو تو گمراہ کریں گے وہ تیرے بندوں کو اور نہیں جنیں گے وہ مگر بدکار کافر کو۔

حق تعالےٰ نے دعا قبول فرماتے ہوئے فرمایا اے نوح تم کشتی تیار کرلو جو تم کو اس طوفان سے بچائے گی جو اس نافرمان قوم کو غرق کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار فرمایا ان میں سے سب دفات پا گئے اور ان میں سے سام حام اور یافث مع اپنی عورتوں کے باقی رہے۔ جن سے بنو آدم کا سلسلۂ نسل جاری رہا۔

شرک و بت پرستی کا ناپاک مرض نسلاً بعد نسلٍ قوموں میں سرایت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سرزمین عرب پر بھی یہ ناپاک اثرات پہنچے۔ عرب میں بت پرستی کو رواج دینے والا سب سے پہلا شخص عمرو بن لحی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین سو سال پہلے گذرا ہے۔ اہل عرب نے اس میں اس قدر ترقی کی کہ یہ ہی نہیں کہ مجموعی طور پر قوم چند بتوں اور تصویروں کی پوجا کرنے لگے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر قبیلہ نے اپنا ایک ایک معبود مستقل تجویز کیا۔ بنو کلب نے وَدّ کا بت اپنا معبود بنایا اور اس کی پرستش میں لگ گئے۔ ھذیل قبیلہ نے سُوَاع۔ مذحج نے یغوث۔ ہمدان نے یعوق اور قوم حمیر نے سبا میں نسر بت بنایا۔ اور قریش نے خاص مسجد حرام اور خانہ کعبہ میں بہت سے بت بنا کر رکھ لئے۔ کوئی حضرت ابراہیم اور کوئی حضرت اسمٰعیل کے نام پر اور بہت سے چھوٹے چھوٹے معبود اپنے ہاتھوں سے پتھروں کے تراش لئے اور ایک بہت بڑا بت خانہ کعبہ کے گرد رکھا جس کا نام ھُبَل تجویز کیا۔ اکثر عرب اسی بت کے نام کی دُھائی دیتے تھے۔ عرب نے کچھ بت لات، عُزّیٰ، مناۃ اور ذوالخلصہ وغیرہ نام کے بھی بنائے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ عرب کے لوگ بالعموم شرک و بت پرستی کی گمراہی میں مبتلا تھے۔ سوائے معدودے چند افراد کے کہ وہ تو اصل فطرت اور توحید پر قائم رہے اور نبی کے بھی منتظر تھے جنکو عرب مُحَصَّلہ[ف] کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور گمراہ طبقہ کو عرب معطلہ کہتے ہیں جن کے بہت سے فرقے تھے۔ ایک فرقہ تو ان میں یہی بت پرستوں کا تھا جن کا قرآن نے جا بجا رد فرمایا۔

ف ان حضرات میں زید بن عمرو بن نفیل تھے جو کعبہ کا تکیہ لگا کر توحید پر مشتمل قصائد پڑھا کرتے تھے اور اسی کا بیان کرتے تھے اور شرک سے نفرت دلاتے تھے۔ انہی لوگوں میں قیس بن ساعدہ عامر عدوانی۔ قیس بن عاصم تمیمی صفوان بن امیہ اور عفیف بن معدیکرب ہیں (تفصیل کے لئے مقدمہ تفسیر حقانی جلد اول ص۴۹ کی مراجعت کریں)

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون۔

بیشک تم سب کے سب اور خدا کو چھوڑ کر جن تمام معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں۔

ویعبدون من دون الله ما لا ینفعهم ولا یضرهم۔

اور یہ مشرکین عبادت کرتے ہیں خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ضرر۔

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا لله الذی خلقهن ان کنتم ایاه تعبدون۔

اے لوگو! ہرگز سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو بلکہ سجدہ کرو اس ذات کے لئے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم عبادت کرنا چاہتے ہو اسی ذات معبود کی۔

اور ایک فرقہ وہ تھا جو خالق کائنات کا انکار کرتا تھا اور نیز مرکر دوبارہ زندہ ہونے اور حساب و کتاب جزا و سزا کو بھی تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس فرقہ کا دعویٰ تھا کہ طبیعت اور مادہ زندہ کرنے والا ہے اور دہر فنا کرنے والا ہے انسان حیوانات اور نباتات ترکیب اجسام کے طبعی تقاضہ سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی تحلیل ہوتے ہوئے گردش زمانہ سے فنا ہو جاتے ہیں۔ اور بعد موت و فنا کے عدم محض کا درجہ واقع ہو جاتا ہے نہ حساب ہے نہ کتاب اور نہ جنت و جہنم۔ اس قسم کے لوگوں کو دہریہ کہا جاتا ہے۔ انگلستان اور جرمن میں ان کی ذریت موجود ہے۔ اور روس ان کا سب سے بڑا مقتدیٰ اور پیشوا ہے۔ اس فرقہ کا رد بھی قرآن میں بکثرت ہے مثلاً۔

وقالوا ما هی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یهلکنا الا الدهر وما لهم بذلک من علم ان هم الا یظنون۔

اور کہا ان مشرکوں نے نہیں ہے ہماری یہ زندگی کوئی چیز بجز اس کے کہ بس یہ ہماری دنیوی زندگی ہے۔ اسی میں مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور نہیں ہلاک کرتی ہم کو کوئی چیز بجز دہر اور گردش (زمانہ) کے حالانکہ ان کو کچھ بھی علم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ محض ظن اور تخمین کی باتیں کہتے ہیں

ان کے اس بیہودہ اور لغو خیال کو رد کرنے کے لئے فرمایا۔

اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق الله من شیء۔

اور کیا یہ لوگ نظر نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کی موجودات میں اور جو کچھ بھی اللہ نے پیدا کیا کسی مخلوق کو۔

قال من یحیی العظام وهی رمیم قل یحییها الذی انشأها اول مرة وهو بکل خلق علیم۔

کہا (حق تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرتے ہوئے) کون ہے ہڈیوں کو زندہ کرنے والا جبکہ وہ بوسیدہ اور پارہ پارہ ہو چکی ہوں گی۔ کہہ دیجئے زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو وہی جس نے کہ ان کو پیدا کیا پہلی مرتبہ اور وہ تو ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے (انسانی اجزاء کسی بھی جگہ منتشر اور کسی حال

میں بھی متغیر ہو جائیں وہ ذات ان کا علم رکھتی ہے اس لئے ان کو پھر ترکیب دے کر زندہ کرنے پر قادر ہے)

وَقَالُوا ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا۔

اور کہا ان مشرکین نے کہ کیا جبکہ ہم (ہمارے جسم) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو چکیں گے تو کیا پھر بھی ایک نئی پیدائش کے ساتھ ہم مبعوث کئے جائیں گے۔

قُلْ ءَإِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔

کہدیجئے کہ کیا تم کفر کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا کیا زمین کو دو روز میں اور حال یہ کہ تم اس کے لئے شریک بناتے ہو یہی ذات تو رب العالمین ہے (جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور افسوس اے کفار کہ تم خالق حقیقی کے ساتھ غیر خالق کو شریک کر رہے ہو)

غرض اسی طرح بہت سی آیات اور سورتوں کے درمیان مختلف عنوان اور پیراؤں میں اس باطل عقیدہ کا رد فرمایا گیا۔

ایک فرقہ وہ تھا جو خالق کائنات کا تو قائل تھا اور یہ تسلیم کرتا تھا کہ ایجاد خلق اللہ کی طرف سے ہے۔ مگر بعث اور حشر ونشر کا منکر تھا۔ قرآن نے اس فرقہ کا بھی رد کیا۔ فرمایا۔

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ۔

کہ کیا ہم عاجز رہے پہلی بار پیدا کرنے سے (کہ ہم دوبارہ زندہ کر سکیں گے) بلکہ یہ لوگ تو از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے محض بلا دلیل) شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ۔

جس طرح کہ ہم نے ایجاد کیا مخلوقات کو پہلی مرتبہ اسی طرح ہم مخلوق کا اعادہ بھی کریں گے۔

ایک فرقہ وہ تھا جو خالق کائنات اور ایجاد خلق اور کسی قدر اعادۂ خلق (یعنی بعث اور حشر ونشر) کا بھی قائل تھا مگر رسولوں کی رسالت کا انکار کرتا تھا اور بت پرستی پر آمادہ تھا۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ یہ بت ہمارے واسطے اللہ کے یہاں شفیع ہوں گے اور ان کی شفاعت ہمیں نجات دلائے گی جیسے کہ ارشاد فرمایا وَمَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ؎ تو اس فرقہ کی تردید ان آیات میں کی گئی۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا۔

وہ دن تو ایسا ہو گا کہ کوئی شفاعت نفع نہ پہنچائے گی بجز اس کے کہ جس کے لئے اجازت دیدے رحمٰن اور راضی ہو اس کے قول سے

؎ (ترجمہ) اور نہیں عبادت کرتے ہیں ہم ان بتوں کی کسی وجہ سے بھی بجز اس غرض کے کہ یہ قریب کر دیں ہم کو اللہ کے کسی قدر۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ — کون ہے جو شفاعت کر سکے اللہ کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے

یہ فرقہ جانوروں میں ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا حصہ لگایا کرتا تھا۔ اور اپنے زعم فاسد سے یہ بھی طریقہ اختیار کیا ہوا تھا کہ کوئی چیز کسی کے لئے حلال کر دی جیسے کہ ارشاد فرمایا۔

وَقَالُوْا ھٰذِہٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُھَا اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِھِمْ۔ الآیۃ — اور کہا ان لوگوں نے یہ چوپائے اور کھیتیاں ممنوع ہیں کوئی نہیں کھا سکتا ان کو بجز اس کے کہ جس کو ہم چاہیں (یہ ممانعت) محض اپنے گمان سے الخ

اس فرقہ کو رسولوں کی رسالت کے ماننے سے اس لئے انکار تھا کہ رسول تو ہم جیسے بشر ہیں کھاتے پیتے ہیں ان کی اولاد اور بیویاں ہیں تو یہ ہم جیسے بشر رسول کیسے ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس باطل عقیدے کا بہت سی آیات میں رد کیا۔

وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ۔ — اور کہا مشرکین مکہ نے کیا ہوا اس رسول کو کہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا۔ — اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے کسی چیز نے بھی جبکہ ان کے پاس ہدایت آچکی (اور وہ اس کو سمجھ گئے) بجز اس کے کہ انھوں نے کہا کہ کیا بھیجا ہے اللہ نے ایک بشر (انسان) کو رسول بنا کر کہدیجئے اگر ہوتے زمین پر بسنے والے فرشتے جو چلتے پھرتے ہوتے اطمینان کے ساتھ تو البتہ اتارتے ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر لیکن جبکہ زمین پر بسنے والی آبادی تو انسانوں کی ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان کے لئے پیغمبر کسی فرشتہ کو بنایا جائے۔

اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ۔ — اور اگر ہم بنا بھی دیتے رسول کسی فرشتہ کو تو بھی اس کو بناتے بشکل آدمی ہی اور پھر وہ اسی شبہ اور التباس میں پڑے رہتے۔

کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ فرشتہ بحیثیت فرشتہ انسانی ہدایات کے لئے کافی ہوتا۔ اس لئے لامحالہ اس کو بھی بشر ہی کی شکل دے کر مبعوث کیا جاتا۔ تو بات پھر وہی رہتی التباس و شبہ کی اور پھر یہ کہ یہ تو کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا اِنَّھُمْ — اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے رسولوں میں کسی کو مگر یہ کہ البتہ

لَيَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْأَسْوَاقِ۔ — وہ کھانا بھی کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے۔

عرب کا ایک گروہ تناسخ کا قائل تھا تو اس کی تردید حق تعالیٰ نے ان کلمات میں فرما دی۔

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا — کہدیجیے ہرگز نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی چیز بجز اس کے جو اللہ نے ہمارے واسطے لکھدی (طے کردی) وہی ہمارا مولا ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ — اور اگر پہنچے تجھ کو کوئی تکلیف تو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اس کو بجز اس پروردگار کے۔ اور اگر وہ پہنچائے تجھ کو خیر تو بیشک وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

اس مضمون کی تمام آیات اسی فرقہ کے رد میں ہیں۔

ایک گروہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں تجویز کرتا تھا جن کا رد اس طرح فرمایا گیا۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا۔ — اور بنایا ہے ان مشرکوں نے فرشتوں کو کہ جو اللہ رحمٰن کے بندے ہیں اللہ کی بیٹیاں۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ — خبردار ہو جاؤ یقیناً وہ لوگ اپنے بہتان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے بیٹا جنا ہے۔ اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے پسند کرلیا بیٹیوں کو بیٹوں پر (تعجب و افسوس) کیا ہوا تم کو کیسے فیصلے کرتے ہو۔

ایک گروہ جنوں کی عبادت کرتا تھا اور یہ لوگ جنات کو حق تعالیٰ کی الوہیت میں شریک جانتے تھے۔ تو اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔ — اور ان لوگوں نے خدا اور جنوں کے درمیان ایک نسب قائم کرلیا اور اس وجہ سے جنوں کو عبادت خداوندی میں کر رہے شریک قرار دیا حالانکہ جن یہ بات جانتے ہیں کہ وہ تو پیش کئے جائیں گے (بارگاہ خداوندی میں)

ایک گروہ وہ تھا جو ستاروں کی تاثیر کا قائل تھا۔ اور یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ بارش انہی کے سبب برستی ہے اور یہ لوگ کہا کرتے کہ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا یعنی ستاروں کے اجتماع اور طلوع و غروب کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی۔ اس فاسد عقیدہ اور لغو خیال کی بھی قرآن نے تردید کی اور اس بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ — اور بناتے ہو تم اپنا رزق یہ کہ تم (خدا کی قدرت کو) جھٹلاتے ہو۔

مسئلہ تناسخ کی تفصیل مستقلاً اس عنوان کے تحت آئے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام حدیبیہ میں ایک روز صبح کو بعد اس کے کہ شب میں بارش برسی تھی۔ فرمانے لگے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں بعضے کفر اختیار کرتے ہیں اور بعضے مجھ پر ایمان لاتے ہیں جنھوں نے یہ کہا کہ بارش ہوئی ہم پران ستاروں کی وجہ سے تو وہ کفر کرتے ہیں میرا اور ایمان لاتے ہیں ستاروں کی تاثیر پر اور جو یہ کہتے ہیں بارش برسی ہم پر اللہ کے فضل سے تو وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور کوکب کا انکار کرنے والے ہیں (صحیح مسلم)

عرب کے ان مختلف فرقوں کے علاوہ بعض فرقے کچھ میلان یہود کی طرف رکھتے تھے اور بعض عیسائیوں کی طرف اور بعض مجوس کی طرف کیونکہ ایک عرصہ سے یمن اور عراق میں ایرانیوں کی سلطنت تھی جو کہ آتش پرست مجوس تھے تو اس وجہ سے عرب کی یہ قومیں ان اثرات سے متاثر ہوئیں۔

غرض یہ تمام فرقے عرب معطلہ یعنی قرآن کے فریق اول ہیں جو ان انواع و اقسام کی گمراہیوں میں مبتلا تھے قرآن کریم نے مختلف مواضع اور سورتوں میں ان تمام اقسام کی گمراہیوں کا رد کیا لیکن ان کے رد میں اہل منطق اور اہل فلسفہ کا طرز نہیں اختیار کیا کہ مقدمات یقینیہ اور عقلیہ سے قیاس مرکب کر کے پیش کر دیا جائے بلکہ ایسا عام فہم سلیس اور لطیف طرز اختیار کیا کہ جس کو ایک فلسفی اور محقق معقولی اور ان پڑھ عامی آدمی حتیٰ کہ اونٹ اور بکریوں کا چرانے والا بھی مساوی طور پر سمجھتا ہے۔ جو دلائل کے وزن میں ایسا لذیذ اور دلکش ہے کہ اگر ذرا بھی نظر انصاف کے ساتھ تعصب اور عناد سے کنارہ کشی اختیار کرتے اس کو دیکھا جائے تو قلب و دماغ اس کے قبول کرنے میں ادنیٰ تردد نہ کرے۔ دلائل و براہین کو کچھ ایسے رنگ میں پیش کیا گیا کہ وہ براہین منطقیہ کے بجائے موعظہ حسنہ معلوم ہوتے ہیں[۱]۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انبیاء سابقین نے اگرچہ حشر و نشر اور قیامت کا ذکر فرمایا لیکن اس بسط و شرح سے نہیں جیسا کہ قرآن نے ان مسائل کو واضح اور ثابت کیا۔ اور یہ جماعت اگرچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا بھی اعتراف کرتے تھے لیکن انبیاء علیہم السلام کی صفات بشریہ میں تردد اور شبہات میں مبتلا ہوتے اور یہ کہ یہ تو کھاتے پیتے ہیں ہماری ہی طرح اور بازاروں میں آمد و رفت بھی ہے پھر یہ کس طرح نبی ہو گئے (یہ جماعت صرف تردد اور شبہ میں تھی برخلاف پہلے ایک فرقے کے کہ وہ شد و مد کے ساتھ انکار رسالت کرتے تھے) اور حق تعالیٰ کی اس حکمت کو نہ پہچانا کہ کیوں جنس بشر سے اللہ نے انبیاء بنائے اور نہ ہی مقتضائے بعثت کو سمجھا اس وجہ سے ان اوہام میں پڑ گئے۔

حق تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہوا کہ ایسی گمراہ قوم میں اس نے اپنی رحمت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ تاکہ آپ ملت حنیفیہ کی اقامت فرمائیں (جیسا کہ ارشاد ہے قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا)

---

[۱] مقدمہ تفسیر حقانی ص ۹ اور الفوز الکبیر کی طرف تفصیل کے لئے رجوع فرمایا جاوے ۱۲

آپ نے آیات قرآنیہ کے ذریعہ ان سے مخاصمہ فرمایا اور ان ہی چیزوں سے استدلال فرمایا جو ان میں ملت ابراہیمیہ کے بقایا میں سے تھیں اور وہ ان کو تسلیم کرتے تھے تاکہ ان پر اتمام حجت ہو سکے۔

خلاصہ ان تمام دلائل والزامات کا جو قرآن نے ردِ شرک کے لئے اختیار کئے ہیں چار امر ہیں۔

(۱) حق تعالیٰ کی عبادت والوہیت میں غیر اللہ کو شریک کرنے کے لئے مطالبۂ دلیل اور یہ کہنا دلیل آباؤ اجداد کے طریقہ کی پیروی کا بہانہ محض حماقت ہے۔ (۲) غیر اللہ کو ذات خداوندی کے ساتھ مساوات و برابری تو کیا بلکہ کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور خدا ہی انتہائی تعظیم اور عبودیت کا مستحق ہے۔ اور جو ذات کسی عظمت کی مستحق نہیں وہ لائق تعظیم اور مستحق تعبّد نہیں۔ (۳) خدا کے تمام پیغمبروں کا اسی بات پر اجماع اور اتفاق رہا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کی عبادت و بندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ (۴) عبادت اصنام (بت پرستی) کی برائی اور یہ کہ پتھروں کا درجہ تو مخلوقات میں نہایت کم ترین اور ارذل ہے پتھر تو کمالاتِ انسانیت سے بھی عاری اور خالی ہیں چہ جائیکہ ان میں کمالاتِ الوہیت کا اثبات کیا جائے۔ اور پھر انسان جیسی اشرف مخلوق ایک ارذل مخلوق کی عبادت کرے۔ اور حشر ونشر کے استبعاد کو بہت سی حسی مثالیں اور نظیریں بیان کرکے رد کیا۔

مزید برآں اس کے امکان و ثبوت پر دلائل عقلیہ ایسے قائم کئے کہ اس میں تردد کا کوئی امکان بھی باقی نہ چھوڑا۔

انبیاء کی نبوت و رسالت کے تسلیم کرنے میں جو چیز ان کے واسطے رکاوٹ کا سبب بنی ہوئی تھی وہ حضرات انبیاء کی بشریت تھی تو اس کا ازالہ بھی بہت سی حکمتوں اور کمالات بشریت کے ذکر کے ساتھ اس طرح کیا کہ دلیل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ بہر کیف انسان کی رہنمائی کے لئے تو پیغمبری بشر ہی کو دی جا سکتی ہے۔

غرض ان اصولی اور بنیادی طریقوں اور دلائل سے عرب کے تمام گمراہ فرقوں کا قرآن نے رد کیا

(فریق دوم یہود) قرآن کے مدمقابل دوسرا فریق جس سے مناظرہ واقع ہوا اور اس کے عقائد باطلہ کی تردید کی وہ یہود ہے۔ جن کی افتادِ طبع فطری زیغ اور بے راہ روی سے انبیاء علیہم السلام طرح طرح کی ایذائیں اٹھاتے تھے۔ شقاوت و بدبختی کی انتہا ہو گئی تھی کہ ایسی لغو اور بیہودہ باتیں بھی اپنے پیغمبروں کی طرف نسبت کرنے میں کوئی تأمل نہ کرتے جن کی اجازت شرافت انسانی کبھی بھی نہیں دے سکتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حیا اور پردہ فرماتے تو یہ بیہودہ اور بدبخت لوگ کہتے کہ ان کی یہ حیا اور پردہ کسی جسمانی عیب اور بیماری کے سبب ہے کہ اس کے ظاہر ہونے سے شرماتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے

---

۵ الفوز الکبیر۔

اسی کی طرف اپنے کلام میں اشارہ فرمایا یا ایّھا الذین آمنوا لاتکونوا کالذین اٰذوا موسیٰ فبرّأہ اللّٰہ مما قالوا وکان عند اللّٰہ وجیھا۔ کہ اے مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ کہ جنھوں نے ایذا پہنچائی (حضرت موسیٰ علیہ السّلام) کو (ایک بیہودہ بات اور جسمانی مرض کی ان کی طرف نسبت کرکے) پھر اللہ نے برأت ظاہر کردی۔ موسیٰ علیہ السلام کی اس عیب سے کہ جو انھوں نے کہا اور وہ (تو) تھے اللہ کے نزدیک بڑی ہی وجاہت رکھنے والے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نسبت بہتان باندھ رکھے تھے۔ بظاہر مدعی تھے کہ ہم تورات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی عملی زندگی کا ایک ایک پہلو اس کی تردید کرتا تھا۔ قرآن کریم کے مدمقابل فریقوں میں یہ فریق شدید مخاصم اور جھگڑالو قسم کا فریق ہے ان کی ضلالت و گمراہی کی صورتیں بھی فریق اول کی طرح بہت سی تھیں۔ تحریف کتاب اللہ یعنی تورات میں تحریف خواہ لفظی ہو یا معنوی کتمان آیات یعنی اصل احکام تورات کا چھپانا اور جو چیزیں اس کے احکام میں سے نہ تھیں ان کا الحاق کرنا۔ اقامت احکام میں تساہل۔ مذہبی تعصب فی عناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا استبعاد و انکار، آپ کی شان مبارک میں طعن اور گستاخی۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عظمت و جلال کی تنقیص۔ اور بخل و حرص حب جاہ اور حب مال جیسے امراض میں مبتلا ہونا۔ قرآن نے ان تمام عیوب اور گمراہیوں کو وضاحت و تفصیل اور تکرار و تاکید کے ساتھ بیان کرکے خوب رد کیا۔

تحریف لفظی کی صورت تو ظاہر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کلام اللہ میں ردوبدل کرنا اور اپنی طرف سے تراشیدہ چیزیں اللہ کی طرف منسوب کرنا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللّٰہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلاً۔

ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں (کتاب الٰہی میں) کوئی نوشتہ اپنے ہاتھوں سے اور پھر کہتے ہیں یہ ہے اللہ کی جانب سے اس غرض سے کہ حاصل کریں اس کے ذریعہ (دنیا کی) معمولی دولت۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظاً مما ذکروا بہ۔

تحریف کرتے ہیں کلمات (الٰہیہ) کی اپنے مواقع سے اور بھلا دیا بہت سا حصہ ان چیزوں کا جن کی ان کو یاد دہانی کرائی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ بروایت ابن عباس فرماتے ہیں کہ تحریف معنوی تاویل فاسد کا نام ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم اور معنی کے خلاف کسی اور معنی پر حمل کرنا دیدہ دلیری کے ساتھ راہ مستقیم یعنی صحیح مفہوم سے انحراف کرتے ہوئے یہود کی گمراہیوں میں سے ایک یہ چیز بھی تھی ہر قسم کے عیب نافرمانیوں، شہوت پرستی اور بداخلاقی میں مبتلا ہونے کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ جہنم میں ہم لوگ اگر جائیں گے تو صرف چند روز کے لئے (جتنے روز کہ ان کے آبا و اجداد نے گوسالہ پرستی کی) بلکہ اس سے ترقی

کہہ کے یہ کہا کرتے۔ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصَارٰی کہ ہرگز کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا بجز اس کے کہ جو یہودی ہو اور نصاریٰ یہ کہتے کہ بجز اس کے کہ جو نصرانی ہو۔ اور کبھی یہ کہتے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّاؤُہٗ۔ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں[1]۔

حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ہر ملت اور شریعت نے مومن کافر اور متدین و فاسق مطیع و فرمانبردار اور جاحد و نافرمان کے درمیان فرق رکھا ہے کہ کفار ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے۔ اور فساق و فجار انبیاء کی شفاعت سے عذاب سے نجات پا سکیں گے۔ اور مطیعین اخروی نعمتوں اور راحتوں کے مستحق ہوں گے۔ چنانچہ تورات میں اپنی ملت کے متدین یہودی کو اس مرتبہ میں شمار کیا گیا۔ اور انجیل میں اس نصرانی کو ناجی قرار دیا گیا کہ جو اپنی شریعت کے مطابق عمل پیرا ہو۔ ایمان باللہ والیوم الآخر کے ساتھ اپنے پیغمبر کے تمام احکام کی اطاعت کرے ہر قسم کی نافرمانی سے پرہیز کرے۔ لیکن یہودی یہ گمان کر بیٹھے کہ بہشتی وہی ہے جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ نے یہ سمجھا کہ نجات و کامیابی صرف ہمارا حق ہے۔ اور اس حقیقت سے غافل رہے کہ نجات کا دارومدار حکم خداوندی کے سامنے انقیاد و اطاعت پر ہے۔ قرآن کریم نے ان کے اس جہل و حماقت کا نہایت صاف اور واضح عنوان سے رد فرمایا

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔

ہاں بیشک قانون یہی ہے کہ جس شخص نے برائی کا ارتکاب کیا اور احاطہ کر لیا اس کا اس کی خطاؤں نے تو یقیناً ایسے لوگ جہنمی ہیں اور وہ اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہونگے۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیکی کے کام کئے تو ایسے لوگ بیشک جنتی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

کتمان آیات کے علاوہ تلبیس بین الحق والباطل یہود کا ایک نمایاں عیب تھا۔ اور بلکہ ان میں کے رؤسا اور سربرآوردہ تو اپنے چھوٹوں کو اس بات سے بھی روکا کرتے تھے کوئی کلمۂ حق ہرگز اپنی زبان سے ایسا نہ نکالو جس سے مسلمان ہم پر حجت و استدلال کر سکیں۔ جیسے ارشاد فرمایا گیا۔

اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ (بقرہ)

کیا تم کہدیتے ہو مسلمانوں سے وہ چیزیں جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں۔ اس لئے کہ تاکہ وہ تمھارے مقابلہ میں حجت اختیار کریں تمھارے رب کے نزدیک۔

---

[1] ہر قوم میں کچھ الفاظ محبت اور پیار کے لئے بولے جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں سے اسی قسم کے عنوان سے خطاب فرمایا تو یہود یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم ہی خدا کے پیارے بیٹے ہیں اور اسی بنا پر خدا کی ذات و صفات میں تشبیہ کے قائل ہو گئے اور یہ عقیدہ اختیار کیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا وقالت الیہود عزیر ابن اللہ ۱۲

غرض اسی طرح اعتقاد عمل اخلاق اور معاشرت وتمدن کی بے شمار خرابیوں میں مبتلا تھے جن کی تفصیل قرآن نے جا بجا فرمائی۔

(**فریق سوم** نصاریٰ) تیسرا وہ فریق جس کے ساتھ قرآن میں مناظرہ واقع ہوا نصاریٰ ہے جو اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے تھے لیکن یہود کی طرح یہ بھی مختلف قسم کی گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اور نصاریٰ کی گمراہیاں مجموعی طور پر یہود سے کچھ کم نہ تھیں۔ سب سے بڑی گمراہی اس فرقہ کی یہ تھی کہ اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں ان میں سے بہت سوں نے اعتقاد الوہیت اختیار کیا بہت سوں نے اعتقاد ابنیت کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور بہت سوں نے عقیدۂ اقانیم ثلثہ یعنی عقیدۂ تثلیث اختیار کیا۔ اور قوم نصاریٰ ان مختلف عقائد کو اختیار کر کے تین گروہوں میں منقسم ہو گئی۔

ان تمام بے ہودہ خیالات اور عقائد کو قرآن کریم نے ایسے روشن دلائل سے رد کیا کہ جس کو ہر ذی عقل اور فطرت سلیم رکھنے والا انسان ادنیٰ تامل سے سمجھ سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

لقد كفر الذين قالوا ان الله هو المسيح ابن مريم قل فمن يملك من الله شيئًا ان اراد ان يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے یہ کہا کہ بیشک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ کہد یجئے (اگر بالفرض ایسا ہے تو بتاؤ) پھر کون ہے جو روک سکے اللہ کی طرف سے کسی چیز کو اگر ارادہ فرمائے وہ ہلاک کرنے کا مسیح بن مریم اور ان کی ماں کو اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو۔

توان کلمات میں صاف طور پر بیان کر دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں وہ الوہیت کی صفت کے ساتھ کیونکر متصف ہو سکتے ہیں بلکہ ان پر تو اللہ کی قدرت اور اس کا تصرف اس طرح جاری ہے کہ اگر وہ ان کو اور ان کی والدہ کو بھی ہلاک کر دے اور حتیٰ کہ روئے زمین پر جس قدر انسان ہیں ان کو بھی تو کوئی طاقت اللہ کے اس ارادے کو دفع نہیں کر سکتی۔ تو بتاؤ کیا ایسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ کو خدا کہا جائے اور اگر تم کو یہ خیال ہو کہ وہ تو بلا باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے۔ آخر حضرت آدم بھی تو اللہ کے پیغمبر خلیفہ اور اس کے بندے ہیں اور ان کو تو اللہ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر ہی پیدا فرما دیا۔

اِنَّ مثل عیسیٰ عند اللّٰهِ كمثل اٰدم خلقهٗ مِنْ تراب ثمّ قال لهٗ كن فيكون

بیشک مثال (حضرت) عیسیٰ کی اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ جن کو بنایا اللہ نے مٹی سے پھر ان کو خطاب فرمایا کُنْ ہو جا سو وہ (اسی طرح) ہو گئے۔

تو اسی طرح یہ اعتقاد رکھنا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں باطل اور لغو عقیدہ ہے۔ کیا اس قدر صاف چیز ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا خالق ہے اور عیسیٰ مخلوق ہیں۔ خالق و مخلوق کے درمیان بھلا یہ رشتہ کیونکر متحقق ہو سکتا ہے۔ اور اگر بلا باپ کے پیدا ہونا خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل ہے تو چاہیے کہ حضرت آدم بدرجۂ اولیٰ خدا کے بیٹے ہوں کیونکہ وہ تو ماں اور باپ دونوں ہی کے بغیر پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح عقیدہ تثلیث کا ابطال ورد فرمایا کہ لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ثالث ثلثۃ وما من الہ الا الہ واحد۔

نصاریٰ کے یہاں اسی کو اقانیم ثلثہ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ روح القدس یعنی جبرئیل امین ایک اقنوم۔ باپ یعنی خدا ایک اقنوم۔ ابن یعنی بیٹا حضرت عیسیٰ۔ ایک اقنوم۔ ہر ایک اقنوم خدا پھر تینوں مل کر ایک خدا نہ تین خدا کہ ایک تین ہے اور تین ایک

یہ اعتقاد سب سے زیادہ لغو اور احمقانہ ہے جو کفر صریح اور محال عقلی ہے اور ایسا بدیہی البطلان امر ہے کہ اس پر کسی دلیل و برہان کے قائم کرنے کی بھی حاجت نہیں اس لئے کہ ہر انسان اپنی عقل اور فطرت سے یہ بات جان سکتا ہے کہ یہ تینوں چیزیں اپنے وجود و تشخص اور خدائی میں مستقل ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو پھر تین خدا ہونے میں کیا تأمل اور حجت؟ تو ایسی صورت میں ایک خدا کہنے کے کیا معنیٰ۔ اور اگر نہیں تو پھر ہر ایک کو خدا کہنا اور ازلی سمجھنا لغو اور خلاف عقل ہوا۔ دوسری شکل (کہ یہ تینوں اپنے وجود میں مستقل نہ ہوں) میں قابل سوال یہ امر ہے کہ جو شئے ان اجزاء غیر مستقلہ سے مرکب ہے اس کا کیا نام ہے وہ خدا ہے یا نہیں اگر ہے تو دو خدا مستقل پھر بھی ماننے لازم آئے ایک تو یہ مجموعہ مرکب ان اجزاء ثلثہ سے دوسرا خدا وہ تیسرا جزء اس مرکب کا جس کو اَب یعنی باپ کہا جاتا ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ مجموعہ کا نام "اب" ہے تو پھر تین اقنوم کہاں رہے بلکہ دو رہیں گے۔ ایک ابن (بیٹا) دوسرا روح القدس۔ بہر کیف یہ عقیدہ باطل اور لغو ہونے کے علاوہ کچھ ایسا مضحکہ خیز بھی ہے کوئی سنجیدہ انسان نہ اس کی تفہیم پر قادر ہے اور نہ ہی اس کو قابل فہم تصور کر سکتا ہے۔

خداوند عالم نے اس عقیدہ کو بھی بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ رد فرمایا۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (الآیۃ)

نہیں ہیں مسیح بن مریم مگر اللہ کے رسول یقیناً گذر چکے ان سے پہلے بہت سے رسول اور ان کی والدہ سچائی اور پاکی کا پیکر تھیں۔ وہ دونوں تو کھانا کھایا کرتے تھے

اور ظاہر ہے کہ جو کھانے کا محتاج ہوگا وہ بہت سی چیزوں کا محتاج ہوگا۔ اس لئے ان کو خدا کیسے مانا جا سکتا ہے۔

اور اسی بنا پر حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ پیدائش کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا

ل تفصیل کے لئے البیان فی علوم القرآن تفسیر حقانی جلد اول اور والد محترم دام ظلہ کی احسن الحدیث فی ابطال التثلیث کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ اور علم الکلام کا مطالعہ فرمائیں۔ ۱۲

کہ بلا باپ کے ان کی پیدائش پر نصاریٰ اور یہود نے جو باطل عقائد اور بیہودہ خیالات قائم کر رکھے ہیں ان کا رد ہو جائے کہ عیسیٰ تو خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں وہ خود اللہ کی عبادت کرتے تھے اور اپنی قوم کو بھی کہا کرتے اعبدوا اللہ ربی و ربکم وہ اللہ کے کلمہ اور روح ہیں جن کو اللہ نے بذریعہ جبریل مریم علیہا السلام کی طرف القا فرمایا پھر ان کی ولادت مریم سے اسی طرح ہوئی جس طرح کہ عام طور پر بچوں کی بطن مادر سے ہوتی ہے چنانچہ فرمایا۔ فَاَجَاءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ الخ (سورۂ مریم) یہی وہ حقیقت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے بنیادی اصول میں شمار کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔

(بخاری مسلم)

جس شخص نے گواہی دی اس بات کی کہ سوائے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بے شک محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بے شک عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی بندی (مریم) کے بیٹے اور اس کا وہ کلمہ ہیں جس کو اللہ نے مریم کی جانب القا فرمایا اور اس کی خصوصی روح ہیں۔ اور یہ کہ جنت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا جس کسی عمل پر بھی ہو (طاعت کی کمی زیادتی یا خطاؤں و معصیتوں کے ساتھ)

نصاریٰ کے عقائد باطلہ اور گمراہیوں میں سے ایک یہ چیز بھی تھی کہ وہ گمان کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا ہے اس گمراہی میں یہ لوگ نسلاً بعد نسل مبتلا رہے حتیٰ کہ قرآن نازل ہوا اور نصاریٰ اپنے پیغمبر کے معاملہ میں جس اشتباہ و مغالطہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس سے ان کو نکالا۔ فرمایا۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔

جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ عیسائی یہ گمان کرتے تھے کہ یہود کے ہاتھوں حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے۔ (سولی دئے گئے) اور ان کی مصلوبی تمام اولاد آدم کے گناہوں کا کفارہ ہوئی۔ آدم علیہ السلام نے حکم خداوندی کے خلاف جو درخت کھا لیا تھا وہ گناہ ان سے معاف نہیں ہوا نہ ان کے توبہ و استغفار اور آہ و زاری سے اور نہ جنت سے نکلنے سے۔ یہ گناہ نسلاً بعد نسل ان کی اولاد پر منتقل ہوتا رہا اور خدا کو اس کی سزا دیئے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا تو اس طرح اس موروثی گناہ سے انبیاء بھی پاک نہ تھے تو خداوند نے اس سزا میں اپنے پیارے فرزند مسیح کو یہودیوں کے ہاتھوں سولی پر لٹکوا دیا مسیح آہ و زاری بھی کرتے رہے مگر خدائے عادل کب توجہ کرنے والا تھا اس کو تو مقصود تھا کہ اپنے فرزند کو تمام دنیا کے واسطے کفارہ بنائے۔

(ان خرافات کی تفصیل کے لئے پولوس کے خطوط ملاحظہ ہوں)

(فریق چہارم منافقین) قرآن کریم کے مدمقابل چوتھا فریق منافقین کا گروہ تھا جن کا قرآن نے بڑے شدومد سے رد کیا ان کے کفر اور نفاق کی گندگیوں کو دلائل و تمثیلات کے ساتھ اس طرح طشت از بام کیا کہ دنیا کے سامنے ان کی ذلت و رسوائی اور ان کی منافقانہ فطرت کی خباثتیں ایسی عیاں کی گئیں کہ جس طرح عذاب آخرت کے اعتبار سے انّ المنافقین فی الدرک الاسفل من النار ان کا امتیازی نشان بنا دنیا میں بھی ذلت و خواری کے طبقۂ اسفل السافلین میں پہنچ گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کی دو قسمیں تھیں ایک وہ تھے جو زبان سے ایمان کا دعوٰے کیا کرتے اور کہا کرتے اٰمنّا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر۔ اور جب آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو کہتے نشھد انّک لرسول اللّٰہ مگر دلوں میں کفر کی گندگیاں راسخ تھیں۔ کفر و عناد پر پختگی سے قائم تھے۔ صرف منافع دنیوی حاصل کرنے اور مجاہدین کے سیف و سنان سے محفوظ رہنے کے لئے یہ عیاری اور فریب اختیار کیا ہوا تھا۔

منافقین کا دوسرا گروہ ایسا تھا کہ جو ضعف اعتقاد کے ساتھ اسلام کا اظہار کرتا تھا ان کے دلوں میں تذبذب تھا کبھی اہل ایمان کی طرف مائل ہوتے اور پھر باطنی خبث سے کافروں ہی کی طرف کھلم کھلا لوٹ جاتے خواہشات نفسانیہ اور دنیوی لذتوں نے ان کے دلوں کو مسخ کر رکھا تھا، حرص مال، حب جاہ حسد اور کینہ سے ان کے قلوب اس قدر لبریز تھے کہ مناجات مع اللہ اور عبادت خداوندی کی لذت و شوق کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ تھی انہی کے حق میں یہ ارشاد خداوندی ہے واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ۔ یراؤن الناس ولا یذکرون اللّٰہ الا قلیلا۔ مذبذبین بین ذٰلک لا الیٰ ھؤلاء ولا الیٰ ھؤلاء۔ انہی میں بعض ایسے تھے کہ وہ دنیوی معاملات اور امور معاش میں اس قدر مصروف و منہمک تھے کہ ان کو امور معاد فکر آخرت اور آیات الٰہی میں غور کرنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ ان کے متعلق ارشاد فرمایا گیا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔ کیوں نہیں وہ غور و فکر کرتے قرآن میں (نہیں غور و فکر تو کیا کرتے) بلکہ ان کے دلوں پر تو قفل ہیں۔

اور بعض وہ تھے کہ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارہ میں طرح طرح کے خیالات فاسدہ پیدا ہوتے تھے۔ آپس میں گاہ بگاہ ان خیالات کا ذکر بھی کرتے اور کچھ طعن و تشنیع اور

عہ البیان فی علوم القرآن ۱۲

تمسخر بھی کیا کرتے پھر جب قرآن کریم ان کو ان امور پر تہدید و تنبیہ فرماتا تو حیران و ششدر رہ جاتے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ۔

ڈرتے ہیں منافقین اس بات سے (الیسا نہ ہو) کہ کوئی سورت نازل کردی جائے ان کے بارہ میں جو ظاہر کر دے ان چیزوں کو جو ان کے دلوں میں ہیں کہہ دیجئے کر لو مذاق (خدا اور رسول کی باتوں سے) اللہ تعالیٰ ظاہر کر دینے والا ہے اس چیز کو جس کا تم اندیشہ کرتے ہو

غرض قرآن نے منافقین کے مکر و فریب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو کچھ دشمنی کا برتاؤ کرتے اس کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور یہ جیسے اسلام کے بدترین دشمن تھے اسی کے مطابق خدا نے ان کو ذلیل و رسوا کیا پوری سورۃ المنافقون (پ ۲۸) انہی کے بارہ میں نازل ہوئی اور بہت سی مثالوں کے ذریعہ ان کی منافقانہ گندگیوں فطری خباثتوں اور ان کے تحیّر و تذبذب کو خوب بیان کیا۔ تفصیل کے لئے ان تمام آیات کی تفسیر کی جانب رجوع فرمایا جائے جو اس فرقہ کے حق میں نازل ہوئیں۔

یہ تفصیل تو نفاق اعتقادی کی تھی۔ اس اعتقادی اور باطنی نفاق کے علاوہ ایک قسم نفاقِ عملی کی ہے جو اس زمانہ میں کثیر الوقوع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات مبارکہ

ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

تین خصلتیں ہیں ایسی کہ جس کسی میں وہ تینوں ہوں گی وہ منافق خالص (کامل) ہوگا۔ جب بات کہے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے۔ اور جب اس کے پاس امانت رکھائی جائے تو خیانت کرے

اسی نفاق عملی کی وضاحت فرما رہے ہیں۔ حاصل یہ کہ . . . . . قرآن کریم کے زیادہ تر مد مقابل یہی چار گروہ ہیں جنکو قرآن نے خصوصیت سے مخاطب بنایا۔ اور ان کے عقائد کی نہایت اہمیت کے ساتھ تردید کی گئی مشرکین یہود نصاریٰ اور منافقین قرآنی دلائل کے سامنے کسی فریق کی یہ مجال نہ رہی کہ کسی قسم کی بھی لب کشائی کر سکے۔

قرآن کے تمام دلائل و براہین نے دنیا کو یہ منظر دکھا دیا۔ قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

مسئلہ تناسخ

تمام انبیا علیہم السلام بالاتفاق روح پر عذاب و ثواب ہونے کے قائل ہیں اور اس کے بھی کہ روح انسان کے مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اور اس کو دنیا کے تمام واقعات یاد رہتے ہیں اور اپنے عزیزوں دوستوں سے محبت بھی باقی رہتی ہے اور پھر روح کسی دوسرے جسم عنصری میں جزا و سزا بھگتنے کے لئے نہیں آتی جس کو تناسخ او ہندو میں آوا گون کہتے ہیں قرآن فرماتا ہے۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ سورہ بقرہ رکوع ۱۷۶۔ ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون ۵ فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۵ سورۂ آل عمران رکوع ۱۶۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا نہ سمجھنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں ان کو روزی دی جاتی ہے اور جو کچھ اللہ نے ان کو اپنی عنایت سے بخشا ہے اس میں خوش و خرم رہتے ہیں اور جو ان کے عزیز دوست ابھی مر کر ان کے پاس نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوشی پاتے ہیں کہ ان پر بھی کوئی خوف اور رنج نہیں۔

قیل ادخل الجنۃ قال یٰلیت قومی یعلمون ۵ بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین ۵ سورۂ یٰسین رکوع ۲
کہ جب عیسٰی کے قاصدوں میں سے ایک کو لوگوں نے قتل کر ڈالا تو اس کو حکم ہوا کہ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ جنت میں جا کر اس نے کہا کہ اے کاش میری قوم کو بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے مجھے بخشدیا اور مجھ پر کیا کیا عنایت کی الم یروا کم اھلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لا یرجعون دان کل لما جمیع لدینا محضرون ۵ سورۂ یٰسین رکوع ۲۔ کیا وہ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ انسے پہلے ہمنے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا وہ پھر ان کے پاس نہیں آتے وہ تو سب کے سب ہمارے پاس حاضر کئے جاتے ہیں۔

ان آیات سے یہ باتیں ثابت ہوئیں۔

(۱) یہ کہ مر کر انسان نیست نہیں ہو جاتا جیسا کہ اہل محسوسات (فلسفہ جدید) کہتے ہیں (۲) یہ کہ نیکوں کو ایک دوسرے عالم میں خدا کی طرف سے ہر قسم کی نعمتیں ملتی ہیں اور انتہائی فرحت و سرور میں مسرور رہتے ہیں (۳) یہ کہ ان کو اپنے دنیاوی دوست اور عزیزوں سے علاقۂ ہمدردی اور محبت باقی رہتا ہے جب پر ان کو انکی طرف سے بھی بخشش و عنایت کا اطمینان دلایا جاتا ہے (۴) مر کر دنیا میں پھر واپس نہیں آتے۔ ومن ورائھم برزخ الیٰ یوم یبعثون۔ کہ ان کے سامنے قیامت تک ایک پردا ہے جس سے وہ پھر کر دنیا میں نہیں آتے اسی مضمون کی اور بھی آیات ہیں اور احادیث میں تو نہایت تشریح کے ساتھ اس مسئلہ کو ثابت فرمایا انجیل لوقا میں حضرت

مسیح علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے۔ ایک دولتمند تھا جو مہین اور لال کپڑے پہنتا تھا اور ہر روز شان و شوکت سے عیش کرتا تھا اور ایک دوسرا شخص بھی تھا جس کا نام لعزر تھا جس کے بدن میں ناسور تھے اور وہ اس کی ڈیوڑھی پر پڑا ہوا تھا جس کو آرزو رہتی تھی کہ اس کی میز کے گرے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرے۔ کتے آکر اس کے زخموں کو چاٹا کرتے تھے اور ایسا ہوا کہ غریب لعزر مرگیا اور فرشتوں نے اسے لیجا کر ابراہیم کی گود میں رکھا اور پھر وہ دولتمند بھی مرگیا اور گاڑدیا گیا تو اس نے دوزخ کے اندر سے بڑے عذاب میں سے دور سے آنکھ اٹھا کر ابراہیم کو اور لعزر کو ان کی گود میں دیکھا تب اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ ابراہیم مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی میں تر کر کے میری زبان ٹھنڈی کردے کیونکہ میں اس لَو میں تڑپتا ہوں تب ابراہیم نے فرمایا کہ تو دنیا میں اپنی زندگی کے مزے لے چکا اور لعزر تکلیفیں پاچکا۔ سو اب وہ آرام پاتا ہے اور تو تڑپتا ہے۔ اس کے سوا ہمارے اور تمہارے درمیان ایک خندق حائل ہے جس کے سبب اُدھر کے لوگ اِدھر اور اِدھر کے اُدھر نہیں جاسکتے تب اس نے کہا کہ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ لعزر کو میرے باپ کے گھر بھیجئے کیونکہ میرے پانچ بھائی اور ہیں یہ جاکر ان کو مطلع کرے ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اسی عذاب کی جگہ میں آئیں ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان کے پاس موسیٰ اور دوسرے نبی ہیں چاہیئے کہ وہ ان کی سنیں۔ اس نے کہا اے باپ ابراہیم اگر کوئی مُردوں میں سے ان کے پاس جائے گا تو وہ ضرور توبہ کریں گے ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ جب وہ موسیٰ و دیگر نبیوں کی نہیں سنتے تو اگر مُردوں میں سے بھی کوئی ان کے پاس جائے گا تو وہ کب مانیں گے۔ غرض انجیل کی اس روایت سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) یہ کہ مرتے ہی قیامت سے پہلے ہر شخص پر عذاب و ثواب عالم برزخ میں شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دولتمند کے مرنے سے قیامت قائم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے دنیا میں پانچ بھائی تھے اور نیز مسیح علیہ السلام سے پہلے کا یہ واقعہ ہے اور اسی کو شریعت اسلام میں عذاب و ثواب قبر کہتے ہیں جس پر بعض ناواقف بتقلید فلاسفہ اعتراض کیا کرتے ہیں (۲) یہ کہ اب بھی دوزخ اور بہشت موجود ہے کیونکہ لعزر بہشت میں اور دولتمند دوزخ میں تھا (۳) اس عالم میں نعمت و تکالیف جسمانی بھی ہیں گو یہ جسم عنصری نہو۔ اس لئے کہ لَو اور پانی کا ذکر اس واقعہ میں ہے اسی طرح اور اسباب نعیم و تکالیف بھی ہوں تو قرین قیاس ہے۔ اور نیز انجیل میں انگور کا شیرہ پینے کا بھی ذکر ہے جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوزخ اور بہشت جسمانی راحتوں اور عذاب کا نام ہے کہ جس پر ناواقف عیسائی اور ملحدین اعتراض کیا کرتے ہیں (۴) مرنے کے بعد اس دولتمند کو اپنے بھائیوں کے ساتھ دردمندی تھی جس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی امور کا علم اور محبت باقی رہتی ہے (۵) اُس عالم سے پھر دنیا میں کوئی واپس نہیں آتا۔ (تفصیل کے لئے البیان فی علوم القرآن کا مطالعہ فرمایا جائے)

مسئلہ تناسخ نہ کسی دلیل و برہان عقلی سے ثابت ہے نہ کسی الہامی حجت سے بلکہ محض پنڈتوں کا یہ ایک

خیال فاسد ہے۔ ہنود جس کی تقلید و پیروی کرتے چلے آتے ہیں بلکہ اس کے بطلان پر بکثرت دلائل ہیں۔

دلیل اول: عقل کا مقتضا یہ ہے کہ دار عمل اور دار جزا الگ الگ ہونے چاہئیں۔ تو اگر مرنے کے بعد جزاء و سزا پانے کے لئے روح پھر اسی دنیا میں واپس آتی ہے جو کہ دار العمل ہے تو اس صورت میں دار العمل کا دار الجزاء ہونا لازم آئے گا۔

دلیل دوم: جزاء و سزا سے دو مقصد ہوتے ہیں۔ مجرم کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت تناسخ کا اعتقاد اور قول اختیار کرنے میں دونوں مقصد فوت ہو جاتے ہیں۔ مجرم کو تنبیہ تو اس لئے حاصل نہیں کہ جب اس کو یہی معلوم نہیں کہ یہ کس جرم کی پاداش اور سزا ہے تو پھر تنبیہ ہی کیسے حاصل ہو گی جرم کا علم تو در کنار اس کو تو سابق جنم کے وجود کا تصور بھی نہیں۔ علیٰ ہذا دوسری غرض بھی مفقود ہے۔ کہ خود جب صاحب عمل کو اپنے عمل کی سزا کا احساس نہیں تو دوسروں کو ان برے اعمال پر اس سزا کے ذریعہ عبرت کیسے حاصل ہو گی۔

دلیل سوم: تناسخ کا اعتقاد رکھنے سے حق تعالیٰ کی قدرت و مشیت اور ارادۂ ازلیہ کا تعطل لازم آتا ہے اس لئے کہ حیوانات کا یہ اختلاف حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے اور یہ سب کچھ اس کے ارادۂ ازلیہ کے تابع ہے۔ تو اگر یہ تمام تر اختلاف جرائم و معاصی اور انسانی اعمال و افعال کے درجات پر قائم ہو تو اس میں حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کو کیا دخل رہا۔ حالانکہ دنیا کا ہر ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کائنات کی یہ تمام اشیاء اور ہر ہر ذرہ اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا کرشمہ ہے۔

دلیل چہارم: تناسخ کا اعتقاد انسان کو روحانی سعادت سے مانع ہے اس لئے کہ انسانی سعادت کے لئے جزء اعظم معرفت (گیان) ہے سو وہ تو ایک جنم میں اس نے جہاں تک حاصل کیا تھا دوسرے جنم میں آکر اس کو بالکل زائل کر دیا کیونکہ جب اگلا جنم ہی سرے سے یاد نہیں تو اس جنم کے حاصل کردہ علوم و معارف کیا خاک یاد رہیں گے۔ اب اس جنم میں آکر ان علوم و معارف کا نتیجہ اور تمام ریاضتوں کا ثمرہ اس کو سلطنت دولت عیش و عشرت ملی جس نے اس کو لذات حسیہ اور شہوات میں مبتلا کر کے حیوانوں سے بھی بدتر کر دیا تو اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ اب اس کے بعد والے جنم میں اس جنت کے بدلے اس کو ضرور جہنم ملے گی۔ تو یہ قضیہ معکوس بھی اور عجیب و غریب ہوا کہ جنم کے علوم و معارف اور زہد و تقویٰ ذکر و فکر اور ریاضت کا ثمرہ تو عیش و عشرت کی صورت میں ملا۔ پھر یہ عیش و عشرت و شہوت پرستی کا نتیجہ جہنم اور مصائب کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ ایک انسان جس نے ہر قسم کے نیک اعمال

کئے وہ دوسرے چکر میں سیدھا جہنم میں جائے گا۔ بہر کیف ظاہر ہے کہ اس اعتقاد کے خلاف عقل ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں[1]۔

ابطال تناسخ کے لئے اور بھی بہت سے دلائل ہیں جن کو حضرات متکلمین نے کتب کلام میں جمع فرمایا ہے۔ اس مختصر تحریر میں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ قارئین اصل کتب کلام اور البیان فی علوم القرآن کی مراجعت فرمائیں۔

محکم و متشابہ

آیات قرآنیہ سے اس امر کی تصریح ہو رہی ہے کہ کلام اللہ کا بعض حصہ محکم ہے اور بعض حصہ متشابہ۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا۔

هو الذی انزل علیك الكتاب منه آیات محكمات هن أم الكتاب و أخر متشابهات

حق تعالیٰ نے ہی نازل کی آپ پر کتاب جس میں سے آیات محکمات ہیں کہ جو ام الکتاب (اور مدار احکام شرعیہ) ہیں اور کچھ آیات متشابہات ہیں۔

فقہاء اور مفسرین نے محکم و متشابہ کے مفہوم کی وضاحت مختلف تعبیر اور عنوانات کے ساتھ کی ہے۔ شیخ جلال الدین فرماتے ہیں بعض ائمہ کے نزدیک محکم اس کو کہا جاتا ہے جس کی مراد معلوم ہو خواہ الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر ظاہر اور واضح ہونے کی وجہ سے یا تاویل کے بعد۔ اور متشابہ وہ ہے جس کا علم خداوند عالم نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا قطعی اور یقینی علم کسی کو نہیں عطا کیا۔ جیسے قیام ساعت و خروج دجال کا وقت اور مقطعات قرآنیہ یعنی وہ حروف ہجائیہ جو سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں مثلاً الٓمٓ الٓمٓرٰ حٰمٓ وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ محکم وہ ہے جس کا ایک مفہوم معین ہو اور کسی تاویل کے ذریعہ متعدد احتمالات کا اس میں امکان نہ ہو۔ جیسے آیۃ اقیموا الصلوۃ و اٰتوا الزکوۃ۔ اور متشابہ اس کے بالمقابل اس کو کہا جائے گا جس میں مختلف معنی کا امکان اور متعدد احتمالات ہوں جمہور قول اول ہی کو اختیار اور پسند کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے متشابہات کی تفسیر خود اسی طرح کی کہ ان کا مفہوم سوائے حق تعالیٰ کے اور کسی کو یقینی اور قطعی طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ

بہر حال وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی (ٹیڑھا پن) ہے وہ درپے ہوتے ہیں اس کے جو متشابہ ہے کلام اللہ میں سے فتنہ کو تلاش کرتے ہوئے اور اس کی تاویل کو چاہتے ہوئے اور حالانکہ متشابہ کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ

[1] علم الکلام ۱۲

اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران) کے۔ اور جو لوگ علم میں رسوخ (و پختگی) رکھنے والے ہیں وہ (یوں) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر کہ ہر ایک (ان محکم و متشابہ میں سے) ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے اور نہیں نصیحت قبول کرتے (ان چیزوں سے) کوئی بھی سوائے عقل رکھنے والے لوگوں کے۔

تو اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ متشابہات کی تحقیق کے درپے ہونا زائغین اور کج رفتار لوگوں کا طریقہ ہے۔ اور جو لوگ علما ربانیین اور راسخین فی العلم ہیں وہ اللہ کی طرف حوالہ کرنے کو اپنی سعادت خیال کرتے ہیں۔ اور کوئی معنی متعین نہیں کرتے چہ جائیکہ کسی فاسد معنی اور اصول شریعت کے خلاف تاویل کو اختیار کریں

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسی) آیت ھوالذی انزل علیک الکتاب کو وما یذکر الا اولوالالباب تک تلاوت فرمایا اور اس کے بعد فرمایا۔

فاذا رأیتِ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ فَاُولٰئِکَ الَّذِیْنَ سماھم اللہ فاحذرھم کہ اے عائشہ جب تو دیکھے ان لوگوں کو جو متشابہات میں غور و خوض کرتے ہیں اور اس کی تحقیق کے درپے ہوتے ہیں تو (جان لینا کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کا اللہ نے نام معین کردیا ہے (یعنی ان کو زائغین اور کج رفتار فرمادیا ہے) تو اس قسم کے لوگوں سے پرہیز کرنا۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضؓ سے روایت تخریج کی ہے فرمایا۔

نؤمن بالمحکم وندین بہٖ ونؤمن بالمتشابہ ولاندین بہٖ[۵] کہ ہم محکم پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں (کیونکہ اس کے مکلف ہیں) اور ایمان رکھتے ہیں متشابہ پر لیکن ہم اسپر عمل نہیں کرتے (کیونکہ ہمیں اس کا مکلف نہیں کیا گیا)

مسند دارمی میں سلیمان بن یسار سے منقول ہے کہ ایک شخص جس کو صبیغ کہا جاتا تھا فاروق اعظم کے زمانہ میں مدینہ منورہ آیا اور لوگوں سے متشابہات قرآن کے بارہ میں تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ عمر فاروق نے اس کو طلب فرمایا اور اس کی آمد سے پہلے ہی کھجور کی چھڑیاں منگا کر رکھ لیں۔ اس کی حاضری پر دریافت فرمایا کہ تو کون ہے؟ اس نے بتایا کہ میں عبداللہ بن صبیغ ہوں حضرت عمر رضؓ نے اس کو زدوکوب شروع فرمایا یہاں تک کہ وہ خون آلود ہوگیا۔ اور ابوموسیٰ اشعری رضؓ کے پاس فرمان بھیجا کہ کوئی شخص مسلمانوں میں سے اس کے پاس بھی نہ بیٹھے۔

متشابہات قرآنیہ میں ایک نوع تو ان متشابہات کی ہے جن کے کوئی معنی دلالتِ لغت اور وضع عربیۃ

---

۵ بحوالہ الاتقان ص ۲ ج ۲

کے اعتبار سے معلوم اور معین ہی نہیں جیسے مقطعات قرآنیہ الٓمٓ الٓرا کھٰیٰعص وغیرہ اگرچہ بعض حضرات مفسرین اور صوفیا، و عارفین مقطعات قرآنیہ کے معانی پر کلام فرماتے ہیں لیکن وہ وجدانی اور ذوقی امور ہیں اور ارباب باطن کے لئے الہامی معارف کا درجہ رکھتے ہیں قطع و یقین کے ساتھ ان معارف و لطائف کو مراد کلام اللہ اور تفسیر مقطعات نہیں کہا جا سکتا۔ جمہور کا اختیار کردہ مسلک مقطعات میں یہی ہے اللہ اعلم بمرادہ یعنی کہ خدا ہی خوب جاننے والا ہے کہ اس کی مراد ان حروف سے کیا ہے۔

متشابہات کی نوع ثانی وہ آیات ہیں جن کے معنی وضع عربیت کے اعتبار سے معلوم اور مفہوم ہیں لیکن اس کی حقیقی مراد اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ اس تک عقول و افکار کی پرواز نہیں۔ وہ حق تعالیٰ کی صفات متشابہات[۱] ہیں۔ مثلاً الرحمٰن علی العرش استویٰ۔ رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ ید اللہ فوق ایدیھم (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے) یوم یکشف عن ساق (وہ دن کہ جس میں پنڈلی سے (حجاب کو) کھولا جائے گا۔ ھل ینظرون الا ان یأتیھم اللہ فی ظلل من الغمام (نہیں انتظار کر رہے ہیں وہ کسی چیز کا بجز اس کے کہ اللہ ان کے پاس آجائے بادلوں کے سائبانوں میں) اور اسی طرح وہ تمام آیات قرآنیہ جو اللہ کی صفات متشابہات پر مشتمل ہیں۔ اہل حق کا مسلک ان میں یہ ہے کہ ظاہر پر ایمان لانا ضروری ہے بغیر اس بحث و تحقیق کے کہ اللہ کا ہاتھ کیسا ہے۔ اور اس کا استوا کس کیفیت کے ساتھ ہے۔

امام مالک رحمہ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے۔ تو جواب میں فرمایا۔ اَلْکَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ- وَالاِسْتِوَاءُ غیر مجھول- والایمانُ بہٖ واجبٌ والسُّوال عنہ بِدْعَۃٌ یعنی کیفیت استوا کبھی نہیں جا سکتی۔ استوا معلوم ہے اور اس پر ایمان لازم ہے اور اس کے متعلق سوال (تحقیق) کرنا بدعت ہے۔ اس لئے کہ نہ تو آنحضرت نے اس کی مراد معین فرمائی اور نہ صحابہ نے اس کو دریافت کیا۔ تو جو چیز نہ آنحضرت نے بیان فرمائی ہو اور نہ حضرات صحابہ اس کی تحقیق کی فکر میں پڑے ہوں تو ظاہر ہے اب بعد میں اس کی تحقیق و تفتیش کے درپے ہونا اصول شریعت کی رو سے بدعت ہی ہونا چاہئے صحابہ ایک ایک آیت

---

[۱] صفات خداوندی جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے معنی واضح اور ظاہر ہیں مثلاً علم قدرت ارادہ اور کلام وغیرہ ایسی صفات کو صفات محکمات کہا جاتا ہے اور انہی کو واضحات کے عنوان سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس بارہ میں اہل حق کا اتفاق ہے کہ ان صفات کے ظاہری معنی پر اعتقاد رکھنا اور ایمان لانا ضروری اور لازم ہے۔ اس قسم کی صفات میں کسی قسم کی تاویل جائز نہیں۔ دوسری قسم صفات کی وہ ہے جس کے معنی میں ابہام اور خفاء ہے محض مدلول لفظی اور معنی لغوی سے کوئی علم قطعی اور یقینی نہیں حاصل ہوتا۔ رائے اور قیاس کی وہاں مجال نہیں کشف و الہام کی کوئی رسائی نہیں جیسے وجہ (منہ) ید (ہاتھ) نفس (ذات) عین (آنکھ) ساق (پنڈلی) اصابع (انگلیاں) اور عرش پر مستوی ہونا اس قسم کی صفات کو صفات متشابہات کہا جاتا ہے۔ ۱۲

کی مراد اور اس کا مصداق معین طور پر معلوم کرنے کے لئے برسوں تحقیق اور جستجو میں لگے رہتے تھے جیسا کہ ابن عباس رض اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا کی آیت میں یہ معلوم کرنے کے لئے عمر فاروق رض سے موقعہ کے متلاشی اور منتظر رہے کہ یہ دو عورتیں کون ہیں جن کو اللہ نے اس آیت میں خطاب فرمایا ہے تو اگر آیات متشابہات میں غور وخوض ممنوع نہ ہوتا تو صحابہ سے یہ بات کسی طرح متوقع تھی کہ وہ ان کی مراد معلوم کئے بغیر بیٹھ رہتے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ حدیث نزول الرب تبارک وتعالیٰ اور حدیث رویت باری تعالیٰ پر کلام فرماتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

المذهب فی هذا عند اهل العلم من الائمة مثل سفیان الثوری ومالك وابن المبارك و ابن عیینة ووکیع وغیرهم انهم قالوا نروی هذه الاحادیث کما جاءت ونؤمن بها ولا یقال کیف ولا نفسر ولا نتوهم

پسندیدہ مذہب اس بارہ میں اہل علم میں سے ائمہ کے نزدیک جیسے سفیان ثوری امام مالک عبداللہ بن المبارک ابن عیینہ اور وکیع وغیرہم یہ ہے کہ حضرات فرماتے ہیں کہ ہم ان احادیث کو روایت کرتے ہیں اسی طرح جیسا کہ یہ وارد ہوئیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کیفیت کے ساتھ اور نہ ہم ان کی تحقیق کرتے ہیں اور نہ مخلوق کے ساتھ مشابہت و مماثلت کا) وہم کرتے ہیں۔

پس ان امور کی حقیقت اللہ کے علم کی طرف حوالہ کرتے ہوئے اہل سنت یہی کہتے ہیں کما هو یلیق بشانہ۔ یعنی مثلاً استواء عرش پر ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہو۔

فقہ اکبر میں امام ابوحنیفہ رح سے منقول ہے۔

فما ذکر الله فی القرآن من ذکر الوجه والید والنفس والعین فهوله صفات ولا یقال ان یده قدرته ونعمته لان فیه ابطال الصفة وهو قول اهل القدر والاعتزال ولکن یده صفة بلا کیف۔

کہ جو کچھ اللہ رب العزت نے قرآن میں وجہ ید نفس اور عین کا ذکر فرمایا یہ سب اس کی صفات ہیں اور یہ نہ کہنا چاہئے کہ ید سے مراد اللہ کی قدرت اور نعمت ہے کیونکہ اس صورت میں اللہ کی صفت کا باطل کرنا لازم آتا ہے جو کہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ید اس کی ایک صفت ہے بلا کسی کیفیت اور مثال کے۔

اور ظاہر ہے کہ ایک انسان ضعیف البیان اور قاصر اللسان سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی صفات تک پرواز کر سکے جبکہ اس کی شان "لا تدرکه الابصار" اور "لیس کمثله شیئ" ہے۔ اس لئے جو بھی صفات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں ان پر ایمان لانا اور ان کی حقیقت اللہ کے سپرد کر دینا بغیر اس کے کہ اس کی کوئی کیفیت اور مثال فرض کی جائے۔ یہی اہل حق کا مسلک ہے جس طرح کہ وہ سمیع وبصیر ہے اور اس پر تمام عقلاً کا

اتفاق ہے۔

لیکن اس کا دیکھنا اور سننا ہمارے دیکھنے اور سننے کی طرح نہیں۔ اور نہ اس کا سمیع وبصیر ہونا آنکھ اور کان جیسے اعضاء کا محتاج ہے انسانوں کے سمع وبصر کی طرح۔ بس اسی طرح اس کا قدم ہاتھ نزول اور استوا ہمارے احوال و کیفیات اور اعضاء بدنیہ کے مشابہ نہیں ہوگا۔

فرقہ مشبہہ جس کو فرقہ مجسمہ بھی کہتے ہیں اس نے ان آیات اور احادیث کو دیکھ کر ظاہری معنی پر محمول کیا اور تشبیہ وتمثیل کا قائل ہو کر اس قدر غلو کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء اور جوارح اس کے لئے ہاتھ قدم منھ وغیرہ ثابت کرنے لگا "لیس کمثلہ شیئ" اور "ولم یکن لہ کفوا احد" جیسی صریح نصوص سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور حماقت وجہالت سے حق تعالیٰ شانہ، کو مجسم سمجھ بیٹھا۔ اس گروہ کے برعکس معتزلہ نے ظاہری معنی کی نفی کرنے اور حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنے میں اس قدر غلو کیا کہ حد تعطیل تک پہنچا دیا۔ اور حق تعالیٰ کی ان تمام صفات کا انکار کرتے ہوئے تمام آیات اور احادیث کی تاویلات کرنے لگے (یہ مسئلہ اہل علم کے نزدیک نہایت معرکۃ الآراء ہے اردو میں تحقیق مطلوب ہو تو تفصیل کے لئے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف رجوع فرمایا جاوے۔

غرض ایک گروہ افراط میں مبتلا ہوا دوسرا تفریط میں۔ افراط وتفریط کے درمیان قول معتدل امت وسط کے حق پرست فرقہ کا یہ ہوا کہ ان صفات کو تسلیم کرنا ان پر ایمان لانا اور یہ اعتقاد رکھنا کہ ان صفات کے تسلیم کرنے کے باوجود ذات خداوندی مخلوقات کی مشابہت ومماثلت سے منزہ اور بالا و برتر ہے

اے برتر از خیال وقیاس وگمان وھم ✽ وز ہرچہ گفتہ ایم وشنیدیم خواندہ ایم

جمہور اہل سنت والجماعت اور تمام متقدمین اور علماء امت قرناً بعد قرن اسی طریق پر متفق اور قائم رہے لیکن متاخرین متکلمین نے جب یہ دیکھا کہ مجسمہ جیسے قاصر الفہم اور ناقص العلم اپنے قصور فہم یا زیغ طبع سے اس امر کے سمجھنے سے عاجز رہیں گے کہ مثلاً صفت ید حقیقۃ" ثابت ہے اور مع ہذا ذات خداوندی جسم اور جسمانیت سے منزہ اور پاک ہے اور یہ سمجھا کہ ان صفات کو اپنے ظاہر پر برقرار رکھنے میں فرقہ مجسمہ کو اپنے اعتقاد تجسیم پر مدد ملے گی تو انھوں نے اس اعتقادی فتنہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے بعض صفات میں کچھ تاویلات کرلیں۔ جیسے کہ "مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا" جیسی احادیث میں متکلمین تاویل کر لیتے ہیں کہ مقصود کمال اتباع کی نفی ہے نفس ایمان کی نفی اور خارج از اسلام ہونا مقصود نہیں جیسے کہ معتزلہ مرتکب کبیرہ کے بارہ میں اس کے قائل ہوئے کہ وہ خارج از ایمان ہے۔

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ اگر یہ تاویل اہل لسان کے عرف اور ان کے محاورات کے قریب ہو (اور اس سے کسی اصل شرعی کا انکار بھی صراحۃً یا دلالۃً لازم نہ آتا ہو) تو ایسی تاویل قبول کیجائیگی ورنہ نہیں

مثلاً آیت یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ کی مراد اللہ کے حق میں کوتاہی کرنا بیان کی جائے "وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ" اور کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ" میں ذات خداوندی کے معنی اختیار کئے جائیں[1]

مقطعات قرآنیہ

الٓمٓ اور اسی قسم کے دوسرے حروف تہجی جو سورتوں کے ابتداء میں ذکر کئے گئے ہیں ان کو مقطعات قرآنیہ کہا جاتا ہے۔ خلفاء راشدین جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہے کہ ان کی حقیقت اور مراد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا
وما یعلم تاویلہ الا اللہ۔ (اور نہیں جانتا ان متشابہات کی حقیقت کو کوئی بھی سوائے اللہ کے)
بعض سلف جمہور متکلمین اور خلیل و سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ مذکور ہوتے ہیں گویا کہ جو مضامین سورتوں میں بیان کئے جائیں گے یہ حروف ان مضامین کا عنوان اجمالی ہوں گے جیسا کہ عنوان مضامین کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ حروف بھی اسی طرح مضامین کیلئے ایک باطنی رمز اور اشارہ ہیں۔

جیسا کہ صحیح بخاری کا نام "الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا اجمال ہے جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا اجزا ترکیبیہ یعنی مفردات کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا اسکے اجزاء ترکیبیہ یعنی حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہوگا جس درجہ کلام میں ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی اسی وجہ سے مرکبات اضافیہ اور توصیفیہ میں معنوی ترکیب اس درجہ نہیں ہوتی جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ میں ہوتی ہے۔ ترکیب لفظی کے انحطاط سے ترکیب معنوی میں بھی انحطاط آگیا۔ مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہ مرکب ہیں مگر مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں تو اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے۔ تو اسی طرح حروف ہجائیہ کلمات کا مادہ ہونے کی وجہ سے مرکبات اضافیہ اور بلکہ الفاظ مفردہ سے بھی زائد اور انتہا درجہ بسیط ہوں گے۔ تو اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ بساطت اور غایۃ درجہ اجمال ہوگا۔ جن کا سمجھنا بغیر تفہیم الٰہی اور تائید غیبی کے ممکن نہ ہوگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے الفوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا۔ علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات حق تعالیٰ کی طرف سے اسرار و رموز ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ خاص طور پر علوم نبوت کے وارث اور اسرار شریعت کے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص۱۲ ج۲

باخبر بنائے گئے ہیں بلکہ بعض اوقات یہ حروف اپنے میں ودیعت رکھے ہوئے اسرار کو ان وارثین علوم نبوت کے سامنے خود بخود اس طرح بولنے لگتے ہیں جس طرح سنگریزے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تسبیح پڑھتے اور صحابہ سنگریزوں کی تسبیح کو سنتے تھے باطنی حقائق اور معارف کا ادراک وہی کر سکتے ہیں۔ جو ارباب باطن ہوں جو لوگ باطنی صفائی اور قلبی نورانیت میں اس مقام پر نہ پہونچے ہوں ان کا عدم ادراک حجت نہیں (روح المعانی) اس مضمون کی تائید حدیث لکل اٰیۃ ظھر و بطن (یعنی ہر آیت کے لئے ظاہری معنی کے ساتھ باطنی اسرار اور رموز بھی ہیں) کر رہی ہے۔

علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں انہی سے مل کر کلام بنتا ہے تو قرآن کریم کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنے میں اعجاز قرآن کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ قرآن جس کے کلام الٰہی ہونے کا (اے کافرو) تم انکار کر رہے ہو وہ کلام تو انہی حروف سے مرکب ہے جن کو تم اپنے کلام میں استعمال کرتے ہو اور انہی اجزاء ترکیبیہ سے تم اپنا کلام مرکب کرتے ہو تو اگر یہ قرآن حق تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو تم کیوں اس جیسا کلام بنانے سے عاجز ہو۔ بالخصوص جبکہ ان مقطعات کو اس طور پر پیش کرنے والا شخص محض اُمّی ہے جس نے نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی معلم واستاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور تم فصحاء و بلغاء اور ادباء و شعراء ہو تو پھر کیوں عاجز ہو۔ اور پھر جن دقائق اور نکات کے ساتھ ان حروف کو سورتوں کی ابتداء میں جمع کیا اس سے بڑے سے بڑا ادیب بھی عاجز ہے۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دقائق ولطائف کی اس مقام پر تفصیل کی جن کی رعایت ان حروف مقطعات میں کی گئی (تفصیل کے لئے کشاف اور تفسیر بیضاوی کی مراجعت فرمائی جائے)

قرآن کریم کا طرز بیان

فصاحت و بلاغت اور فن بدیع کے جملہ کمالات پر مشتمل ہونے کے باوجود (جن کی قدرے تفصیل بحث "اعجاز قرآن" کے ضمن میں گذر چکی) اور بھی بہت سی خصوصیات قرآن کریم کے طرز بیان کی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان کے ماتحت طرز بیان کی مزید کچھ خصوصیات پیش کر دی جائیں۔

متقدمین کے کلام کے تتبع اور تلاش سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآنی طرز بیان کی خصوصیات میں سے ایک عظیم خصوصیت آیات میں مناسبت اور باہمی ربط ہے کہ خواہ مضامین متعدد اور مختلف بیان ہو رہے ہوں لیکن ہر ایک آیت دوسری آیت سے اس طور پر مربوط ہے کہ گویا ایک لڑی میں

ترتیب وتناسب کے ساتھ یہ تمام موتی پروئے ہوئے ہیں۔ دنیا حیران اور عاجز ہے کہ کس خوبی اور لطیف پیرائے کے ساتھ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف کلام منتقل ہورہا ہے۔ اور پھر مزید خوبی یہ کہ مضامین کے لئے نہ ابواب باندھے جارہے ہیں اور نہ فصول قائم کی جارہی ہیں۔ باوجودیکہ تیئس برس میں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر مختلف اوقات احوال اور مقامات میں نازل ہوا لیکن ربط ومناسبت اول سے لیکر آخر تک برابر قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مناسبت کسی مقام پر لطیف اور خفی ہو کہ سطحی نظر و فکر رکھنے والوں کو اس مناسبت اور ربط کا احساس یا اس کی خوبی کا علم نہ ہو۔

مناسبت لغت میں مشاکلت و مقاربت کو کہتے ہیں۔ اور مآل کار اس کا یہ ہے کہ متعدد آیات کو ایک معنی اور ایک ہی غرض کے ساتھ اس طرح مربوط کردینا کہ وہ متعدد آیات ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی معلوم ہونے لگیں اور وہ آیات کلام مذکور کے واسطے دیوار کے اجزاء ترکیبیہ کی طرح ایک دوسرے کے استحکام وتکمیل کا باعث ہوجائیں۔

آیات قرآنیہ میں باہمی ارتباط کبھی امر عام ہوتا ہے کبھی خاص کبھی حسی کبھی عقلی کبھی خیالی اور کبھی تلازم ذہنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سبب ومسبب۔ علت ومعلول نظیرین وضدین وغیرہ علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ تو بعض آیات کا ذکر بعض کے بعد ظاہر الارتباط ہوتا ہے کہ دونوں میں ربط کسی طرح بھی مخفی نہیں مثلاً

---

۵ علماء مفسرین کے نزدیک مضامین قرآن میں یہ موضوع بھی بہت اہم رہا ہے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے مبسوط ومفصل تصانیف فرمائیں۔ علم المناسبۃ پر سب سے پہلے شیخ ابوبکر نیشاپوری نے تالیف فرمائی۔ شیخ نیشاپوری علوم شریعت اور ادب کے امام تھے۔ ہر سورۃ کی دوسری سورۃ اور ہر آیۃ کی دوسری آیۃ سے مناسبت اور حکمت ربط کا اہل علم سے سوال فرماتے جب امام رحمہ اللہ کی دقت نظر اور پرواز فکر کے مطابق کوئی جواب نہ دے سکتا تو آیات قرآنیہ کی باہمی مناسبت کی توضیح فرماتے۔ اہل بغداد کو علم ربط کی طرف زائد توجہ نہ تھی تو شیخ رح اس کو پسند نہ فرماتے تھے۔ شیخ ابوبکر نیشاپوری کے بعد دوسرے ائمہ اس طرف متوجہ ہوئے امام رازی رح نے بھی تفسیر کبیر میں ربط آیات کا بہت کچھ اہتمام فرمایا ہے۔

علامہ ابوجعفر بن الزبیر (جو ابوحیان کے شیخ ہیں) نے ایک کتاب لکھی البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن"۔ شیخ برہان الدین بقاعی کی بھی اسی موضوع پر ایک کتاب "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" ہے (اتقان ص ۱۰۱ ج ۲) اور شیخ سیوطی رح کی کتاب "اسرار التنزیل" اور ملا مخدوم مہائمی کی تبصیر الرحمن وتیسیر المنان ربط آیات پر نہایت ہی بے نظیر کتابیں ہیں۔ اردو ذخیرہ تفاسیر میں تفسیر حقانی اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی تفسیر بیان القرآن میں دیگر علوم معارف قرآنی کے ساتھ ربط آیات پر بہترین کلام فرمایا ہے۔

آیت ثانیہ پہلی آیت کے لئے بمنزلہ جزاء یا کسی معلول کے لئے بمنزلہ علت ذکر کی گئی ہو یا ماقبل کا وہ تکملہ و تتمہ یا تفسیر و تشریح اور تاکید و تنبیہ ہے تو ایسی صورتوں میں باہمی ربط خود بخود واضح ہے اور محتاج بیان نہیں۔ البتہ بعض مقام پر ربط خفی ہوتا ہے جبکہ ہر دو جملے بذات خود مستقل ہوں۔ تو اب یہ دیکھنا ہوگا کہ ہر ایک دوسرے پر حروف عاطفہ (جو دو جملوں کو ایک حکم میں شریک کر دیتے ہیں) کے ساتھ معطوف ہے یا نہیں اگر معطوف ہے تو ضرور ان دونوں میں ذکر کردہ علاقات میں سے کوئی نہ کوئی علاقہ ہوگا۔ مثلاً يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا۔ ان کلمات میں ولوج و خروج۔ نزول و عروج ارض و سما یعنی آسمان و زمین جو باہم علاقہ تضاد رکھتے ہیں بذریعہ عطف جمع ہیں اور ایک سلسلۂ کلام میں شریک کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح آیت وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ میں قبض و بسط کہ جس میں علاقۂ تضاد ہے جمع کر دیا گیا۔ اسی بنیاد پر وہ تمام آیات ہیں جن میں عذاب کے بعد ثواب کا رحمت کے بعد غضب کا ترغیب کے بعد ترہیب وعدہ کے بعد وعید اور بشارت کے بعد انذار و تخویف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان سب میں یہی علاقہ تضاد باہمی ارتباط کا سبب ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اکثر احکام حلال و حرام کے بیان کے بعد وعدہ وعید اور کبھی وہ گذشتہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن میں فرمانبرداروں پر عنایت و بخشش اور نافرمانوں پر عتاب و عذاب کا تذکرہ ہوتا ہے تاکہ احکام مذکورہ کی تعمیل کی رغبت ہو اور نافرمانی سے بچیں۔

قیامت اور مرنے کے بعد راحت و رحمت اور عذاب و مصیبت کے احوال بھی بیان کئے جاتے ہیں تاکہ نتیجۂ عمل اور انجام سعادت و شقاوت بخوبی سامع کے ذہن پر منقش ہو جائے۔ اور اسی طرح کبھی احکام کے ذکر کے ساتھ آیات توحید و انعام کا بھی بعد میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ بیان احکام کے ساتھ آمر و ناہی کی شان بھی معلوم ہو جائے کہ یہ ایسے احکم الحاکمین شہنشاہ رب العالمین اور منعم کے احکام ہیں۔

سورۂ بقرہ، نساء، اور مائدہ (جن میں غالب حصہ آیات احکام کا ہے) میں غور کریں گے تو آپ کو ان سورتوں کے مضامین میں اسی قسم کے لطائف اور مناسبتیں منکشف ہوں گی۔ یہ تفصیل تو اس شکل کی تھی دو جملے یا آیتیں عطف کے عنوان کے ساتھ ہوں۔

اگر دونوں میں عطف نہ بھی ہو تو بھی کوئی نہ کوئی رابطہ اتصال اور ارتباط کلام کے لئے قرائن معنویہ میں سے ایسا ہوتا ہے کہ اس سے کلام سابق اور لاحق کلی طور پر مربوط و ہم آہنگ محسوس ہونے لگتا ہے جس کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں ایک۔

(۱) تنظیر ہے (یعنی ایک شئی کو دوسری کے لئے نظیر و مثال بنانا) اس لئے کہ اہل کمال اور عقلاء کی یہ شان اور

ولوج بمعنی دخول اور عروج بمعنی چڑھنا۔

طرز ہے کہ ایک نظیر کو دوسری سے لاحق کرتے ہیں۔ اس کی مثال حق تعالیٰ کا فرمان "کما اخرجک ربک من بیتک بالحق" ہے جس کو "اولٰئک ھم المؤمنون حقا" کے بعد ذکر فرمایا گیا۔ بادی النظر سے ہر دو مضمون کے درمیان ربط نمایاں نہیں ہوتا لیکن نوعیتِ تنظیر نے ہر دو مضمون کو ایک دوسرے سے پورے طور پر مربوط کر دیا۔ کہ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا حکم فرمایا آپ مال غنیمت کی تقسیم اللہ کے حکم کے موافق فرمائیے اور عام امور مصلحت میں کسی کی طبعی گرانی یا مخالف کے طعن و مخالفت کی پروانہ کیجئے۔ اسی طرح جیسا کہ جب آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے نکالا۔ تو بعض طبائع اس میں گرانی محسوس کرتے تھے لیکن آپ نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے حکم خداوندی کی تعمیل کی جس کے نتیجہ میں اللہ نے فتح و کامیابی اور مال غنیمت عطا فرمایا اور ان برکتوں کا سب نے مشاہدہ کر لیا اسی طرح اس گرانی کے بعد بھی انجام کار حق تعالیٰ کی طرف سے برکات اور رحمتوں کا مشاہدہ ہوگا

(۲) مضادت۔ یعنی ایک چیز کے بیان کے بعد اس کی ضد کا بیان کرنا۔ تاکہ اس تقابل اور تضاد سے اس کی پوری حالت منکشف ہو جائے۔ جیسے سورۂ بقرہ میں ھُدًی للمتقین کی آیات میں اہل ایمان ان کے اوصاف اور دنیا و آخرت میں ان کی نیکیوں کے ثمرات بیان کر کے ان الذین کفروا سے کفار و منکرین اور منافقین کے احوال ان کی برائیاں اور آخرت میں ان کے اعمال بد کی سزائیں بیان فرمائی گئیں۔

(۳) استطراد۔ یعنی ایک مضمون کی مناسبت سے دوسرا مضمون تبعاً ذکر کر دینا۔ مثلاً یا بنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوءٰاتکم وریشًا ولباس التقویٰ ذٰلک خیر۔ زمخشری بیان کرتے ہیں کہ آیت ولباس التقوٰی استطراد کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ اس سے پیشتر آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور آدم کی اس حالت کا ذکر ہوا کہ وہ لباس کے بجائے درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتے تھے تو اس موقع پر تبعاً و استطراداً حق تعالیٰ نے اپنے انعامات میں نعمت لباس کا بھی ذکر فرما دیا کہ جس سے انسان ستر عورت کر سکے اور زیب و زینت بھی۔ اور لباس صوری و ظاہری کی تبعیت میں لباس معنوی اور باطنی بھی بیان فرما دیا۔ ولباس التقویٰ ذلک خیر۔ کہ لباس تقویٰ ہی بہترین لباسِ انسانی ہے۔

(۴) حسن تخلص۔ یعنی ایک مضمون کے بیان کے ساتھ دوسرے ایک مضمونِ مقصود کی طرف ایسے حسن اسلوب سے منتقل ہو جانا کہ سامع کو انتقال مضمون کا احساس بھی نہ ہو۔

قرآن کا یہ طرز بیان ایسا عجیب اور محیر العقول ہے کہ اس خوبی اور کمال پر دنیا کے فصحاء و بلغاء حیران ہیں۔

کما اخرجک ربک کی مراد مکہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا ہے۔ جو اگرچہ ابتداءً کفار و مشرکین کے باعث تھا لیکن کائنات کی ہر چیز راحت ہو یا تکلیف سب کچھ حق تعالیٰ کے تکوینی ارادہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اخراج کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی۔ یا گھر سے نکلنے کی مراد قریش کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے میدان بدر کی طرف نکلنا ہے۔

مثلاً سورۂ اعراف میں انبیا علیہم السلام اور قرون ماضیہ کا تذکرہ چل رہا تھا۔ اس ذیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہوگیا کہ وہ اپنی قوم کے ستر آدمی ہمراہ لیکر کوہ طور پر حق تعالیٰ سے کلام کرنے گئے۔ جب شرف ہمکلامی حاصل ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے دعا مانگی اکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنۃ الخ کہ اے اللہ لکھ دے ہمارے واسطے بھلائی اس دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ اس پر جواب ملا کہ مری رحمت ہر شئی کو گھیرے ہوئے ہے مگر میرا عذاب بھی ہے کہ جس کو چاہوں میں وہ عذاب پہنچا دوں۔ تو اس مقام پر قرآن نے کلام کا رُخ پھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے مناقب و فضائل بیان کرنے شروع کردے۔ کہ اے موسیٰ یہ رحمت خاصہ جو ہر شئی کو محیط ہے آپ کی امت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک آنے والے نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کے واسطے مخصوص ہے جن کے اوصاف و کمالات یہ ہیں۔

فسأکتبھا للذین یتقون ویؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بآیاتنا یؤمنون الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل۔ یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم فالذین اٰمنوا بہ وعزّروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہٗ اولئك ھم المفلحون (الاعراف)

(فرمایا) میں اس حسنہ اور رحمت خاصہ کو لکھے دیتا ہوں اُن کے لئے جو حق تعالیٰ سے ڈرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال قلب ہے) اور صدقہ و خیرات کرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال جوارح ہے) اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہوں گے یہ لوگ وہ ہوں گے جو اتباع و پیروی کرتے ہوں گے اس رسول نبی امی کی کہ جن کو یہ اہل کتاب لکھا ہوا پائیں گے۔ اپنے پاس توراۃ وانجیل میں جن کی صفت یہ کہ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرمائیں گے اور برائیوں سے انھیں روکیں گے اور ان کے واسطے پاکیزہ چیزیں حلال کریں گے اور حرام کریں گے ان پر خبیث و ناپاک چیزیں۔ اور ان سے سخت بوجھ کے احکام دور کریں گے اور وہ جکڑ بندیاں جو ان پر قائم کردی گئی تھیں۔ پس جو لوگ ان نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں اور ان کی حمایت و مدد کرتے ہوں اور اس نور ہدایت اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہیں جو نازل کیا گیا ان پیغمبر کے ساتھ تو بس ایسے ہی لوگ فلاح و کامیابی حاصل کرنے والے ہیں“۔

اب اس کے بعد کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے بیان کردہ صفات اور نبی امی کی خصوصیات اس مرحلہ پر پہنچ گئیں۔ فلاح و نجات کا انحصار اتباع محمدی میں کردیا گیا فوراً ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام نبوت اور اعلان رسالت کا مضمون شروع ہوگیا[1]۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۰۹

قل یاایھاالناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ کہ اے نبی کریم کہدو کہ اے لوگو! میں اللہ کا پیغمبر ہوں کہ جو تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ میں اس خدا کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا ہوں جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہر شے کی اور ہر ایک کی موت و حیات ہے اس لئے بس اسی خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلمات (احکام و اوامر) پر ایمان رکھتا ہے اسی کی اطاعت کرو امید ہے کہ تم راہ راست پر آجاؤ گے۔ اشارہ گویا یہ فرمادیا کہ اے اہل کتاب تم اپنے عہد میں تحریفات کرکے گمراہ ہو چکے ہو اور تمھارا اصل مذہب تم سے چھوٹ چکا۔ اب تو اس نبی آخرالزماں ہی کے وسیلہ سے تم کو ہدایت مل سکے گی۔

بات چلی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر اپنے قوم کے ستر منتخب افراد لیجانے اور حق تعالےٰ شانہ سے ہم کلام ہونے کی اس پر حضرت موسیٰ کی اپنی امت کے حق میں حسنہ کی دعا۔ بارگاہ خداوندی سے اس حسنہ و بھلائی کے لئے امت محمدیہ کا اختصاص اس امت اور اس کے پیغمبر نبی امی کی صفات کا ذکر الہٰی کی پیروی میں فلاح و نجات کا انحصار یہ سب کچھ بیان ہوتے ہوتے ناگہاں پھر کلام الہٰی شروع ہوتا ہے۔ وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سب کے سب ہی گمراہ مذہب حق سے بھٹکنے والے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کی رہنمائی کرتی ہے اور خود حق پر چلتے ہوئے عدل و انصاف کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن سلام رضؓ اور کعب احبار رضؓ کہ ایسے حضرات تورات و انجیل کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔

اس حسن تخلص اور استطراد پر غور فرمائیے کہ یہ تمام کلمات موتی ہیں جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ استطراد اور حسن تخلص میں فرق یہ ہے کہ استطراد میں دوسرے مضمون کے ذکر کے بعد فوراً ہی اصل مضمون کی طرف پھر کلام لوٹ آتا ہے۔ اور حسن تخلص میں ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف اس خوبی کے ساتھ کلام کا رُخ پلٹتا ہے کہ سامع کو محسوس تک بھی نہیں ہوتا اور دوسرا مضمون اس طور پر مسلسل بیان ہوتا ہے کہ ہر دو مضمون میں ایسا اتحاد اور ارتباط ہوتا ہے کہ مخاطب دونوں کو ایک ہی مسلسل اور مربوط مضمون خیال کرتا ہے۔

سورۂ شعراء میں حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے رب سے یوں مناجات فرماتے تھے وَلَا تخزنی یوم یبعثون کہ اے میرے پروردگار مجھے رسوا نہ کرنا اس دن جبکہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے اس بیان کے ساتھ ہی ساتھ فوراً آخرت اور معاد کے احوال کی طرف کلام لوٹ گیا۔ یوم لا ینفع

مال ولا بنون الخ- یعنی وہ دن کہ اس میں نہ نفع دے گا مال اور نہ انسان کے بیٹے (اولاد) الخ

غرض قرآن کریم کا یہ خصوصی طرز بیان ایسا نرالا اور عجیب ہے کہ اس کی عظمت و برتری عقول انسانی احاطہ کرنے سے عاجز ہیں۔ بطور نمونہ یہ کلمات عرض کر دئے گئے ہیں[1]

اسی طرح سورتوں کے فواتح اور مقاطع (ابتدائی آیات اور انتہائی کلمات) میں بھی ایک عجیب ربط اور مناسبت کہ دنیا میں کسی فصیح و بلیغ کے کلام میں اس کی نظیر ممکن نہیں[2]۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی ابتداء الٓمٓ- ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الخ ہے کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ جس میں کوئی شبہ نہیں جو پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔ اس کے بعد پرہیزگاروں کے اوصاف بیان فرما کر ان کی ضد کافروں کے خصائل ذکر کئے۔ اس سورت کا خاتمہ یہ ہے وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ جس میں کتاب کے ہدایت ہونے اور پرہیزگاری کے دنیوی اور اخروی نتیجہ کا بیان ہے۔ کہ تقویٰ اور ایمان کا اخروی ثمرہ تو یہ ہے کہ خداوند عالم خطاؤں اور لغزشیں معاف فرمائے۔ جو اشارہ اس مضمون کی جانب بھی رہنمائی کر رہا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی پرہیزگار رہے مگر بشریت کی لغزشوں سے وہ پاک نہیں۔ اور یہ بشری لغزشیں منافی تقویٰ نہیں اس کے لئے وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا کہنے کی تعلیم فرمائی اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ صرف بخشدینا ہی کافی نہیں بلکہ حق تعالیٰ شانہ کی عنایت اور دار البقاء کی نعمتوں کا ملنا بھی مقصد اعلیٰ ہے تو اس کے لئے اور نیز دنیا میں عزت اور عافیت کے ساتھ رہنے کے لئے "وَارْحَمْنَا" کہنے کی تعلیم فرمائی۔ اور ایمان و تقویٰ کا دنیوی ثمرہ خدا کی مدد۔ فتح و نصرت اور مخالفین پر غلبہ ہے تو اس کیلئے انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکافرین کلمات ذکر فرما کر سورت کو ختم کر دیا گیا کہ فتح و نصرت کا حاصل ہونا اور خدا کا حامی و مددگار ہونا ایمان و تقویٰ کا ثمرہ ہے اور مقہور و مغلوب ہونا کفر و بدکاری کا نتیجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ ابتداء سورت میں ایمان و ہدایت اور تقویٰ اس کے بالمقابل کفر و نفاق اور خصائل کفر و نفاق کا ذکر تھا تو اختتام سورت ایمان و تقویٰ اور کفر و بداعمالیوں کے ثمرات و انجام کے بیان فرمایا گیا جس سے مبداء و منتہا میں نہایت ہی لطیف و عجیب مناسبت اور ربط ظاہر ہو گیا۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کی ابتداء " الٓمٓ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم نزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان ہے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج۲ ص۱۸۴ [2] مفاتح و مقاطع سور پر مفسرین نے مستقلاً کتابیں تصنیف فرمائی ہیں شیخ جلال الدین سیوطی کی کتاب مراصد المطالع فی تناسب المقاطع والمطالع" اور علامہ کرمانی کی "العجائب" اس موضوع پر بہترین تصنیف ہیں۔

جس میں حق تعالیٰ کی وحدانیت اس کی حیات و قیومیت کے بیان کے ساتھ یہ ظاہر کردیا گیا کہ ان اوصاف کے مقتضیات میں سے یہ امر ہے کہ حضرت ابراہیم کے بعد ملتِ ابراہیمیہ زندہ اور قائم رہے جو کہ توحید کی بنیاد اور تمام مِلل سماویہ کے لئے قوام ہے تو اس کے واسطے تین کتابیں نازل فرمائیں۔ اے نبی کریم آپ پر قرآن اتارا جو توحید کا خزانہ اور حیات ابدی کا سرچشمہ ہے۔ اور اس ذات حی و قیوم نے اپنی ان دو صفات کے مطابق قرآن میں دو صفتیں رکھیں اول یہ کہ وہ حق ہے کہ باطل کا اس کے قریب بھی کوئی گذر نہیں اور اس کتاب کا سراپا حق ہونا اس کی حیات و بقاء اور دوام کی دلیل ہے کیونکہ حق کی شان بقا ہے اور باطل کی حقیقت فنا و زوال ہے تو اس طرح قرآن خداوند عالم کی شانِ حیات کا ایک مظہر بنا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن اپنے سے پہلی کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والا ہے گویا قرآن ان کے لئے ذریعۂ بقا ہے۔ اور قرآن نے ہی ان کو قائم کر رکھا ہے تو اس طور پر قرآن حق تعالیٰ کی صفت قیومیت کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اور اسی مقصد کے واسطے تورات و انجیل بھی نازل فرمائی۔ قرآن میں دو وصف اور بھی ہیں اول یہ کہ وہ دنیا میں تھوڑا تھوڑا ہو کر تیئیس برس کی مدت میں نازل ہوا۔ تو اس لحاظ سے نَزَّلَ کا لفظ ذکر فرمایا جس کے معنی تھوڑا تھوڑا اتارنے کے ہیں اور الکتاب کے عنوان سے تعبیر کیا کیونکہ وصف کتابیت بھی پارہ پارہ ہو کر وجود میں آنے کو مقتضی ہے۔ دوم یہ کہ وہ بیت المعمور اور لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بیک وقت نازل ہوا تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ اَنزَلَ سے جس کے معنی بیک وقت اتارنا اور فرقان کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ تو گویا تورات و انجیل کے مقابلہ میں قرآن دو صفتوں کے ساتھ دوبارہ بیان فرمایا جس سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ جو کچھ تورات و انجیل میں ہے وہ سب کچھ قرآن میں موجود ہے۔ اس لئے قرآن میں تین وصف ہو گئے۔ دو تو وہی اور تیسرا فرقان ہونا۔ اور یہ تینوں اوصاف خدا کے بیان کردہ تینوں اوصاف توحید، حیات اور قیومیت سے پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں تو یہ تھا آل عمران کا مبدا اور اب جب یہ سورت اپنے منتہا پر پہنچتی ہے تو اس کا اختتام ان کلمات پر ہوتا ہے۔ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ کہ اے ایمان والو صبر و برداشت کرو اور مقابلہ میں ثابت قدم رہو۔ اور نیک کاموں میں دل لگائے رکھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ امید ہے کہ تم فلاح و کامیابی حاصل کر لوگے

انسانی سعادت کا مدار انہیں تین اوصاف پر ہے (نفسانی خواہشات شہوتوں اور لذائذ فاسدہ سے اپنے کو بچانا۔ یہ بچانا صبر و برداشت ہے۔ اور جب نفس امّارہ کا حملہ ہو تو مقابلہ میں مستحکم اور مضبوط رہنا یہ صابروا ہے۔ نیک کاموں کو عمل میں لانا اور خدا سے دل لگانا یہ رابطوا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہنا کسی وصف پر مغرور نہ ہونا برے کاموں سے بچنے اور نیک کاموں میں دل لگانے کا محرک یہی تقویٰ ہے۔ اس سعادت کے حاصل ہونے کے بعد پھر فلاح ہی فلاح ہے۔ چونکہ خدا کی تمام کتابوں کا لب لباب یہی ہے۔ اس لئے سورت کو اسی پر ختم فرما دیا۔ سبحان اللہ کیا عجیب ربط و مناسبت ہے شروع سورت میں کتابیں تین بیان ہوئیں تھیں تو اس مناسبت سے اختتام سورت پر موجبات سعادت بھی تین ہی

بیان کئے گئے۔ مگر قرآن کو چونکہ دو صفتوں کے لحاظ سے دوبارہ ذکر کیا گیا تھا تو اس اعتبار سے گویا عدد چار ہو گیا تھا تو اسی طرح اصبروا وصابروا قدرے تفاوت اور فرق کے ساتھ ذکر فرمادیا گیا جس کے لحاظ کے بعد موجبات سعادت کا عدد بھی چار ہو جاتا ہے[۵]۔

مفاتح سور (یعنی سورتوں کی ابتدائی آیات وکلمات) میں قرآن کریم کا ایک خاص طرز بیان یہ ہے کہ سورت میں جو مضمون زیادہ مقصود بیان اور ملحوظ ہے اسی کی مناسبت سے ابتداء سورت میں الفاظ لائے گئے۔ تلاش وتحقیق سے مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن نے سورتوں کی ابتداء دس قسم سے کی ہے۔

(۱) حق تعالیٰ کی حمد وثنا جس کی تعبیر گاہ بگاہ صفات کمالیہ اور محامد کے اثبات کے ساتھ ہوتی ہے اور کسی مقام پر ہر عیب ونقصان سے تقدیس وتنزیہ کے عنوان سے ہوتی ہے۔

پانچ سورتوں کو تحمید کے ساتھ شروع کیا۔ اور دو تبارک الذی کے عنوان سے جس میں دلالۃً ذات باری تعالیٰ کے لئے اثبات حمد ہی ہے۔ سات سورتوں کو لفظ سبحان سے لیکن اس کے ساتھ یہ خوبی ملحوظ رکھی کہیں عنوان مصدر ہے اور کہیں ماضی اور مضارع اور کہیں صیغہ امر مثلاً سبحان الذی اسری بعبدہٖ۔ سبّح للہ ما فی السموات سورۂ حدید۔ یسبّح للہ ما فی السموات (جمعہ) سبح اسم ربک الاعلیٰ (اعلیٰ)

(۲) حروف تہجی سے۔ جو انتیس سورتوں کے شروع میں اختیار کئے گئے۔ مثلاً الٓم الٓر المٓر۔

(۳) حروف ندائے دس سورتوں کو شروع کیا گیا۔ جن میں سے پانچ کو ندا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کیا مثلاً سورۂ احزاب، طلاق، تحریم، مزمل اور سورۂ مدثر۔

اور پانچ کو ندا امت شروع کیا گیا۔ سورۂ نساء، مائدہ، حج، حجرات اور ممتحنہ۔

(۴) تیئیس سورتوں کو جملہ خبریہ سے شروع کیا۔ یسئلونک عن الانفال۔ براءۃ من اللہ۔ اتیٰ امر اللہ۔ اقترب للناس۔ قد افلح المؤمنون۔ سورۃ انزلناہا۔ تنزیل الکتاب۔ الذین کفروا۔ انا فتحنا لک۔ اقتربت الساعۃ۔ الرحمٰن علم القرآن۔ قد سمع اللہ۔ الحاقۃ ما الحاقۃ۔ سأل سائل۔ انا ارسلنا نوحاً۔ لا اقسم بیوم القیمۃ۔ لا اقسم بھذا البلد۔ عبس۔ انا انزلناہ۔ لم یکن۔ القارعۃ۔ الھاکم۔ انا اعطیناک۔

(۵) پندرہ سورتوں کو قسم سے شروع کیا۔ ایک میں ملائکہ کی قسم ہے والصافات صفا اور دو میں آسمانوں کی والسماء ذات البروج۔ والسماء والطارق۔ اور چھ میں ان کے لوازم کی۔ والنجم۔ والفجر۔ والشمس۔ واللیل۔ والضحیٰ والعصر۔ اور دو میں ہوا کی جو ایک عنصر ہے۔ والذاریات۔ والمرسلات۔ والطور۔ میں زمین کے ایک جزکی جو پہاڑ ہے۔ والتین میں نبات کی۔ والنازعات میں حیوان ناطق۔ یا ایک قسم کے ملائکہ کی۔ والعادیات میں حیوانات میں سے ایک نوع خاص یعنی گھوڑوں کی۔

---

[۵] البیان فی علوم القرآن الاتقان ۱۲

(۶) عنوان شرط سے سات سورتیں شروع کی گئیں ۔ اذا وقعت الواقعۃ ۔ اذا جاءک المنافقون ۔ تکویر ۔ انفطار

انشقاق ۔ زلزلہ ۔ اور اذا جاء نصر اللہ ۔

(۷) صیغہ امر چھ سورتوں کے شروع میں لایا گیا ۔ قل اوحی ۔ اقراء ۔ قل یا ایھا الکافرون ۔ قل ھو اللہ ۔ قل

اعوذ برب الفلق ۔ قل اعوذ برب الناس

(۸) صیغہ استفہام چھ سورتوں کے شروع میں ۔ ہل اتیٰ علی الانسان ۔ عم یتساءلون ۔ ہل اتاک

حدیث الغاشیہ ۔ الم نشرح ۔ الم تر ۔ ارأیت ۔

(۹) بددعا ۔ تین سورتوں کے شروع میں ۔ ویل للمطففین ۔ ویل لکل ہمزۃ ۔ تبت یدا ابی ۔

(۱۰) ایک سورت تعلیل کے ساتھ ۔ لایلاف قریش ۔

کلام اللہ کی سورتوں میں اختیار کردہ مضامین کے ساتھ مفاتح سور کی مناسبت کے لئے ایک دو مثال بیان کر دینا کافی ہے ۔ مثلاً سورۂ کہف جس کے شروع میں "الحمد للہ الذی" ہے اس میں چند با خدا لوگوں کے واقعات ہیں ۔ اصحاب کہف کا اور ان دو شخصوں کا جنھوں نے بڑا سرمایہ صرف کر کے باغ بنایا پھر ان میں سے ایک کے غرور اور کفران نعمت کی وجہ سے اس کے باغ پر تباہی اور بربادی آئی اور دوسرے کے باغ میں اس کی خدا ترسی اور طاعت و نیکوکاری کی وجہ سے خیر و برکت ہوئی ۔ موسیٰ اور خضر کے ذکر میں یہ ہے کہ نیکوکار لوگ اور ان کے پسماندگان مصائب سے محفوظ رہتے ہیں دنیا میں بھی ان کو نیکی کا پھل ملتا ہے اور آخرت میں بھی ۔ ذوالقرنین کا واقعہ ہے ۔ جس کو خدا نے نیکوکاری اور تقویٰ کی بدولت ہر قسم کے سامان عطا کئے اور وہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی خدا پرست رہا مظلوموں کی حمایت کی کہ ایک دیوار بنا کر یاجوج و ماجوج کو روک دیا مختلف مواقع میں دار آخرت اور نیکوکاری کے ثمرات نافعہ اور اس کے بالمقابل برائی کے دنیا و آخرت میں برے انجام کا بھی بیان ہے ۔ ایسے واقعات گذشتہ کا بیان جن کو دنیا کی کوئی تاریخ اس تحقیق و تفصیل سے نہیں بتاتی ۔ ان حقائق و معارف کے ساتھ خدا کی ایک بڑی نعمت و رحمت ہے جو قرآن کے ذریعہ بندوں تک پہنچی اس لئے اس کے مطلع (افتتاح) میں الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجاً لے آنا گویا سورت کے تمام مضامین کا عنوان شروع ہی میں قائم کر دینا ہے ۔

اسی طرح سورۂ فاتحہ (جو قرآن کی اول سورۃ اور ام القرآن ہے) کے شروع میں الحمد للہ رب العالمین لایا گیا کیونکہ قرآن کریم کے جو اہم مقاصد ہیں وہ اس میں بالاجمال جمع کر دئے گئے جن کی تفصیل باقی تمام سورتوں میں ہے ۔ اور یہ

---

(۱) انبیاء علیہم السلام کی معرفت جس قدر علوم نازل ہوئے ان کا انحصار حسب ذیل ہے ۔

علم الاصول جس کا مدار خدا کی ذات و صفات کی معرفت پر ہے اس کا بیان اول جملہ الحمد للہ رب العالمین میں ہے ۔

چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر بڑی نعمت ہے جس پر حمد کرنا مناسب بلکہ حق شناسی ہے اس لئے ابتدا، الحمد لاکر اشارۂ اجمالی کر دیا کہ اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوگا وہ سراپا نعمت و رحمت ہی ہوگا۔ (البیان فی علوم القرآن)

قرآن کریم کا طرز خطاب اور اس کے انواع و اقسام ائمۂ مفسرین کے نزدیک نہایت اہم موضوع رہا ہے شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن الجوزی نے پندرہ وجوہ طرز خطاب کے اپنی کتاب "النفیس" میں جمع کیے۔ دوسرے حضرات مفسرین نے تیس سے زائد شمار فرمائے۔ (تفصیل کے لئے الاتقان فی علوم القرآن ص۳۳ و ص۳۱ ج ۲ کی مراجعت کی جائے)

قرآن کریم کے خصوصیات خطاب میں دیگر اسباب بلاغت مثلاً مجاز استعارہ کنایہ اور تشبیہ و تمثیل نیز تمام اقسام بدیع کا جمع ہونا بھی ہے۔ جن کا استعمال ہونا قرآن میں نہایت ہی خوبی اور کمال کے ساتھ ہوا ہے۔ علامہ ابن ابی الاصبع نے اسی موضوع پر ایک کتاب "اعجاز القرآن" لکھی جس میں تقریباً سو قسم کے بدائع ذکر کئے ہیں۔

مجاز فی القرآن ہی کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفاصیل کے لئے ایک مستقل تصنیف چاہئے۔ شیخ عز الدین بن عبد السلام نے اس پر مستقل تصنیف فرمائی جس کی شیخ جلال الدین سیوطی نے تلخیص کی اور اس کا نام "مجاز الفرسان الی مجاز القرآن" رکھا۔ حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو ناچیز اعجاز قرآن پر ایک مستقل رسالہ میں ان وجوہ بلاغت اور مجاز فی القرآن کے محاسن کو بقدر استطاعت جمع کر کے ہدیۂ ناظرین کریگا۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۵ کا ملاحظہ کیجئے) علم النبوت جس کی طرف الذین انعمت علیھم میں اشارہ ہے۔ معرفت معاد جس کی طرف مالک یوم الدین میں اشارہ ہے۔ علم العبادات۔ اس کی طرف ایاک نعبد میں اشارہ ہے۔ علم السلوک یعنی نفس کو آداب شرعیہ اور انقیاد رب البریہ کا پابند بنانا۔ اس کی طرف ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم میں اشارہ ہے۔ امم ماضیہ کے احوال پر مطلع ہونا تاکہ مطیعین کی سعادت اور نافرمانوں کی شقاوت معلوم ہو سکے۔ اس کی طرف صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں اشارہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا ۵) ہر سورت اپنے بیان میں ایک مستقل نامۂ شاہی یا فرمان شاہی کی حیثیت رکھتی ہے اور شاہانہ فرامین کی شان مختلف ہوتی ہے کبھی تو نفس مضمون سے ابتداء ہوتی ہے۔ اس کی مثال وہ سورتیں ہیں جن کی ابتداء جملہ خبریہ سے ہے۔ اور کبھی عنوان میں بھیجنے والے کی شان کا اظہار ہوتا ہے جیسے از طرف شاہان شاہ اس لئے بعض سورتوں کی ابتداء میں حق تعالیٰ کی عظمت و جبروت یا صفات کمال کا بیان ہوتا ہے۔ مثلاً تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم۔ اور کبھی مکتوب الیہ کی طرف خطاب ہوتا ہے جیسے بنام فلاں۔ اس لئے بعض سورتیں یا ایھا النبی اور یا ایھا المزمل جیسے خطاب سے شروع ہوتی ہیں اور کبھی فرمان شاہی مختصر ہوتا ہے اور کبھی مطول تو اسی طرح کچھ سورتیں مختصر ہیں۔ اور کچھ طویل کبھی فرمان شاہی میں اظہار جلال و عظمت کا ہوتا ہے اور کبھی اظہار عنایت و رحمت تو یہی حال سورتوں کا ہے۔ ۱۲

ایجاز و اطناب

انواع بلاغت میں سے ایجاز و اطناب بھی عظیم ترین نوع ہے جس کی رعایت سے کلام کا حسن بڑھ جاتا ہے اور اس کو نظرانداز کر دینے سے کلام حسن و خوبی کے معیار سے بلغاء کے نزدیک گر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صاحب "سر الفصاحۃ" نے بعض ائمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ بلاغت ایجاز و اطناب ہی کی رعایت کا نام ہے۔ علامہ زمخشری بیان کرتے ہیں کہ جس طرح مواقع اجمال میں بلیغ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اجمال و ایجاز کو اختیار کرے۔ اسی طرح مواضعِ تفصیل و تنقیح میں یہ لازم ہے کہ وہ بسط و تفصیل کے ساتھ کلام پیش کرے۔

علامہ قزوینی بیان کرتے ہیں کہ ادا مقصود کے لئے تعبیر یا تو مقصود و مراد کے مساوی ہوگی یا اس کی نسبت سے کم ہوگی لیکن وہ تعبیر اپنے اختصار کے باوجود مراد بخوبی ادا کر رہی ہو۔ یا مقصود و مراد سے تعبیر زائد ہوگی کسی نکتہ اور فائدہ کی وجہ سے۔ اول قسم کلام میں مساوات ہے۔ دوم ایجاز اور سوم اطناب۔ بلغاء کے نزدیک مساوات کی قسم اور اس کے احکام زائد زیر بحث نہیں آتے۔ وجوہ بلاغت میں ایجاز و اطناب ہی موضوع بحث رہتے ہیں[۵]۔

قرآن کریم نے اپنی تعبیر میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت حد اعجاز تک کی ہے۔ شیخ سیوطی نے الاتقان میں ایک مستقل فصل میں ان تمام انواع ایجاز کو جمع کیا ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

قرآن کریم نے اپنے خطاب میں جو طرز ایجاز اختیار کیا دنیا کے فصحاء اس سے عاجز ہیں کہ کس خوبی کے ساتھ چند الفاظ میں حقائق اور معانی کے بے شمار خزانے اور کثیر مضامین جمع کر دیئے گئے۔ مثلاً آیۃ مبارکہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل و انصاف
وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ	اور بھلائی کا اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا اور
وَالْمُنْكَرِ۔	منع کرتا ہے ہر بےحیائی اور برے کام سے۔

تو اس آیت میں لفظ العدل سے اس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی جو افراط و تفریط کے درمیان عین اعتدال و توسط کا راستہ ہے۔ جس کے ضمن میں اعتقاد و اخلاق عبودیت معاملات و معاشرت کی تمام ذمہ داریوں کی تکمیل اور ان کی اصلاح و درستگی کو بیان کر دیا گیا۔ الاحسان سے عبادت کے حسن و کمال اخلاص اور خشوع و خضوع کے اس مرتبہ کو بیان فرما دیا جس کی تعلیم " ان تعبد الله كانك تراه " کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دی۔ اِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى سے حقوق واجبہ کے بعد تبرع و احسان اور

---

۵ ایجاز و اطناب کی تعریف میں بلغاء، اور علماء اہل عربیہ کی تعبیریں مختلف ہیں تفصیل کیلئے کتب معانی کی مراجعت کی جائے۔

اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک اور پاکیزگی معاشرت کا مضمون ادا کیا گیا وینھیٰ عن الفحشاء سے تمام معاصی سے اجتناب اور قوت شہویہ سے بچنے کی تعلیم ہے۔ اور المنکر سے اس افراط و غلو اور تعدی کو منع کیا گیا جو انسان کی قوت غضبیہ کے آثار میں سے ہے۔ اور البغی سے اس جور و تسلط کو روکا گیا جس کا منشأ قوت وہمیہ ہے۔

اسی مضمون کو ابن مسعودؓ نے یہ الفاظ ادا کررہے ہیں ما فی القرآن آیۃ اجمع للخیر والشر من ھذہ الآیۃ (الحاکم) کہ قرآن کریم میں کوئی آیت خیر و شر کے لئے اس آیت سے زیادہ جامع نہیں ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حسن سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک روز اس آیت کو تلاوت کیا۔ تلاوت کرنے کے بعد ٹھیر گئے اور فرمایا (اے لوگو!) اللہ نے اس ایک ہی آیت میں تمھارے واسطے ہر قسم کی خیر اور ہر قسم کے شر کو جمع کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ کی طاعت و بندگی میں سے عدل و احسان کے کسی مرتبہ کو نہیں چھوڑا مگر یہ کہ اس آیت میں جمع کر دیا اور نہ ہی اللہ کی معصیتوں میں سے فواحش و منکرات اور جور و ظلم کے کسی پہلو کو باقی رکھا کہ جو اس آیت میں نہ بیان کر ڈالا ہو۔

ابن شہاب الزہری سے حدیث بعثت بجوامع الکلم کی شرح میں منقول ہے۔ فرمایا مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ جوامع کلم یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ایک ہی دو کلموں میں ان امور کثیرہ (علوم بلیغہ) کو جمع کر دیا کہ جو آپ سے پہلے متعدد کتابوں میں لکھے جاتے تھے یعنی آپ کے جامع کلمات اپنے میں معانی اور علوم کی وہ وسعت و کثرت رکھتے ہیں کہ اس وسعت و کثرت کو کتابوں کے ذخیرے ہی اپنے میں سما سکتے تھے۔ تو جب حق تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ اس قدرت کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات مبارکہ کی یہ شان ہے تو خود اس رب العزت کے کلام پاک کی جامعیت کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ ؟ انسانی افکار اس منتہی تک پرواز سے قاصر ہیں۔

اسی طرح آیت "ولکم فی القصاص حیوٰۃ" ہے۔ کیونکہ اس کے معنی کثیر ہیں اور الفاظ نہایت ہی مختصر و قلیل ہیں۔ یہ الفاظ و کلمات اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ قتل و خونریزی کا انجام قصاص ہے تو قاتل و خونریز قسم کا انسان خود بھی اقدام قتل سے باز رہے گا جس کے باعث دوسرے کی حیات کو بھی اتلاف و اضاعت سے محفوظ رکھے گا۔ اور اپنی زندگی بھی قصاصاً ختم کر دیئے جانے سے بچائے گا۔

اہل عرب کے یہاں اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے جو مشہور و معروف اور مایۂ ناز جملہ "القتل انفیٰ للقتل" تھا کلام اللہ کی یہ مختصر سی آیت فصاحت و بلاغت لفظی اور معنوی خوبیوں میں عرب کے اس مقولہ کے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ علامہ ابن الاثیر بیان کرتے ہیں کہ کلام مخلوق کو کلام خالق کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ جو کچھ وجوہ فضیلت علماء بیان کرتے ہیں وہ صرف انکے اذہان اور وسعت علمی کے بقدر ہوتا ہے۔ ورنہ کلام اللہ کی خوبیاں تو ان بیان کردہ خوبیوں سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔

لہ الاتقان ص۱۲۵ ج۲۔

آیت قرآنیہ کو اہل عرب کے مقولہ سے حروف میں کم ہونے کے علاوہ وجوہ ذیل کے اعتبار سے فوقیت و برتری ہے۔ (۱) مقولۂ عرب میں قتل کو قتل سے رکاوٹ کا ذریعہ بیان کیا گیا تو یہ عنوان مستلزم حیات اور ذریعۂ بقاءِ زندگانی نہیں برخلاف آیۃ ولکم فی القصاص حیاۃ کے کہ قصاص کو عین حیات صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ غرض مطلوب حیات ہی ہے (۲) نیز حیوٰۃ پر تنوین تعظیم ہے جو حکم قصاص کو حیاۃ عظیم ظاہر کر رہی ہے (۳) بسا اوقات قتل مزید قتل و خونریزی کا ذریعہ بنتا ہے۔ برخلاف قصاص کہ وہ ہر حال اور ہر صورت میں حیات ہی حیات ہے۔ (۴) آیت تکرار لفظ سے خالی ہے اور مقولۂ عرب میں لفظ قتل مکرر ہے اور کلام مختصر کا تکرار لفظ پر مشتمل ہونا فصاحت کے لئے مخل ہے۔ (۵) آیت میں کسی لفظ کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں برخلاف اس مقولہ کے کہ اس میں عبارت کی تقدیر اس طرح مانی جائے گی۔ القتل قصاصاً انفی للقتل ظلماً تو ہر اسم تفضیل کے ساتھ قصاصاً اور ظلماً کا اعتبار کرنا ہوگا (۶) آیت میں صنعت طباق قصاص و حیات کے اجتماع کی وجہ سے ہے۔ برخلاف مقولۂ عرب کے (۷) لفظ قتل طبائع سلیمہ کے لئے منکر اور قابل وحشت محسوس ہوتا ہے اور قصاص و حیات مانوس طبع معلوم ہوتے ہیں۔ (۸) لفظ قصاص قتل اور دوسرے جرائم (مثلاً مجروح کر دینا اعضاء انسانی کو تلف اور ضائع کر دینا) کے قانون کو جامع اور کلی طور پر بیان کر رہا ہے کہ قانون اسلام مساوات و برابری ہے۔ برخلاف مقولۂ عرب کے کہ اس نے صرف قتل ہی کی صورت پر دلالت کی دوسرے کسی مجرمانہ اقدام کا کوئی قانون ان الفاظ سے ماخوذ نہیں۔

بحث ایجاز حذف

اقسام ایجاز میں سے ایک ایجاز حذف بھی ہے جس کی مختلف اور متعدد صورتیں ہیں کلام اللہ میں ایجاز کی یہ نوع بھی پائی جاتی ہے۔ کلام میں کبھی ایجاز حذف جملہ سے ہوتا ہے خواہ ایک جملہ مستقلہ کا حذف ہو یا متعدد جملوں کا۔ مثلاً آیت فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت کہ ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا اس پتھر پر مارو تب اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ تو یہاں ایک جملہ فضرب بہا یعنی عصا مارا محذوف ہے۔ چونکہ یہ جملہ سبب ہے بارہ چشموں کے نکلنے کے لئے تو مسبب مذکور ہونے کی صورت میں قرینۂ مقام سے سبب کا مضمون خود بخود سمجھا جا سکتا تھا اس لئے جملہ سببیہ حذف کر دیا گیا۔

اسی طرح آیت کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین کہ ابتداء میں تمام لوگ ایک ہی طریقہ (توحید) پر تھے پھر اللہ نے بھیجا پیغمبروں کو جو بشارت سناتے (مومنین کو) اور ڈراتے (کافروں کو) آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا سبب لوگوں کا اختلاف کرنا تھا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ جملہ فاختلفوا محذوف ہے جو کہ سبب ہے مابعد کے کلام کے لئے سبب ذکر

کر دیا گیا اور قرینہ پر اعتماد کرتے ہوئے جملہ سببیہ ترک کر دیا گیا اور کبھی حذف جزء جملہ ہوتا ہے مثلاً واسئل القریۃ التی کنا فیھا لفظ اہل محذوف ہے یعنی ان اہل قریہ سے سوال کر لیجئے جن میں ہم تھے۔ اور قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں ہے وکان وراءھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا اس مقام پر سفینۃ کی صفت سلیمۃ محذوف ہے کہ وہ بادشاہ ہر صحیح و سالم کشتی غصب کر لیتا تھا۔

اقسام حذف کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے الفوز الکبیر میں فرمائی ہے اس کی مراجعت کی جائے۔

اطناب

مقصود کو بسط و توضیح کے ساتھ بیان کرنا اطناب فی الکلام ہے۔ مثلاً حق تعالیٰ نے سورہ بقرہ و دیگر مواقع میں خلق السموات والارض کا مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ خطاب جن و انس۔ عالم و جاہل۔ ذکی و غبی موافق و مخالف اور ہر زمان و مکان میں بسنے والوں سے تھا اس وجہ سے تمام دلائل قدرت کے ذکر میں بسط و تفصیل ہی کو اختیار فرمایا۔ ایجاز جس طرح ایجاز قصر اور ایجاز حذف کی جانب منقسم ہے اور ایجاز حذف کے انواع بکثرت کلام اللہ میں موجود ہیں اسی طرح اطناب کے انواع بھی کثیر ہیں شیخ سیوطیؒ نے اتقان میں اکیس انواع تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔

اس بسط و توضیح کے عنوان سے یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ کلام اللہ میں بعض الفاظ اور تعبیریں زائد از ضرورت ہیں بلکہ اس بسط و توضیح اور ان الفاظ و حروف میں جن کو مفسرین زائد کہہ دیتے ہیں بہت سے فوائد اور معارف و معانی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بغیر اختیار کردہ تعبیر اور بیان کردہ حروف و کلمات کے مفہوم نہیں ہو سکتے۔ ابن جنی فرماتے ہیں ہر وہ حرف جو کلام میں اضافہ کیا جاتا ہے وہ قائم مقام ایک مستقل جملہ کے ہوتا ہے۔ جس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہو۔ زمخشری بیان کرتے ہیں ما اور لیس کی خبر پر با کا آنا (جس کو بالعموم مفسرین زائد کہا کرتے ہیں) تاکید نفی کے لئے ہوتا ہے مثلاً وما ربک بظلام للعبید جیسا کہ لام تاکید ایجاب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے وما ربک آیت کا ترجمہ صرف یہ نہیں کیا جائے گا کہ "اور تمہارا رب نہیں ہے ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔ بلکہ دلالت عربیت کی رو سے ترجمہ صحیح یہ ہوگا۔ اور نہیں ہے تمہارا رب قطعاً (ذرہ برابر) ظلم کرنے والا اپنے بندوں کے لئے ۔ اور اہل ذوق کے نزدیک ہر دو تعبیروں میں بڑا تفاوت ہے۔ تو ظاہر قواعد کی رو سے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ب لفظ ظلام پر زائد ہے مگر اس اشارہ سے معلوم ہوا کہ معناً زائد نہیں ہے بلکہ اس ب کے آنے سے

ع اس میں اشارہ ہے لفظ علیٰ کے بجائے ظلم کے صلہ میں لام استعمال کرنے کی نکتہ کی جانب کہ اس جگہ لام نے معنوی نوعیت اس طرح نمایاں کی کہ اللہ کو ارادہ بھی نہیں فرمانے والا ہے ذرہ برابر ظلم اپنے بندوں کے لئے چہ جائیکہ ان پر کوئی ظلم کیا جائے ۱۲

معنوی طور پر کلام کی طرز میں بڑا عظیم تفاوت پیدا ہو گیا۔ اسی طرح آیت

واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق (مائدہ)

اور جب سنتے ہیں وہ اس کلام کو جو نازل کیا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (یعنی قرآن) تو آپ دیکھیں گے ان کی آنکھوں کو کہ بہتی ہوتی ہیں آنسوؤں سے، اس وجہ سے کہ انھوں نے پہچان لیا کہ وہ حق ہے۔ قرآن کریم نے نصاریٰ میں سے مشرف باسلام ہونے والے قسیسین و رہبان (یعنی علم دوست اور تارکِ دنیا درویش حضرات) کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا یہ حال بیان فرمایا۔

بظاہر اس عنوان میں کچھ کلمات کی زیادتی معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے مختصر عبارت میں ادا کیا جانا ممکن تھا مثلاً فرما دیا جاتا تری اعینهم الخ کے بجائے یَبْکُوْنَ کہ رونے لگتے ہیں لیکن اہلِ ذوق بخوبی جان سکتے ہیں کہ یبکون کا عنوان محض رونے کے مضمون کو بیان کر سکتا تھا لیکن شدت بکا و گریہ کی جو کیفیت اِن عبّاد و زُہّاد پر طاری تھی اس کو تو صرف یہی تعبیر ادا کر سکتی تھی جو اختیار کی گئی کہ مخاطب ان الفاظ کو سنکر یہ سمجھ لے کہ ان حضرات کا گریہ و بکا اس درجہ کا تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک بہتا ہوا سیلاب نظر آتا ہے۔ اور ان کی یہ کیفیت دیکھنے والے کو تَجَوُّز کے طور پر یہ بتاتی کہ اس بکا کو یہی کہنا درست ہے کہ آنکھیں بہ رہی ہیں آنسوؤں سے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ کیفیت بکا محض لغت یبکون سے ادا نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح آیت " وَتَصِفُ السنتهم الکذب ان لهم الحسنیٰ " ہے جس میں کافروں کے اس دعویٰ کی تردید ہے جو وہ اپنے متعلق کیا کرتے کہ ان کے واسطے انجام بہترین ہے۔ تو اس مضمون کے واسطے اگرچہ یہ تعبیر بھی ممکن تھی ویکذبون ان لهم الحسنیٰ جو تعبیر مذکور کی نسبت مختصر بھی ہوتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اختیار کردہ تعبیر کی خوبی اور لطافت و بلاغت اس مختصر عبارت میں کبھی نہیں آسکتی تھی کیونکہ " وتصف السنتهم " الخ کے عنوان سے صرف ان کا جھوٹا ہونا ہی بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ تو دروغ گوئی میں امام اور مقتدیٰ ہیں اس لئے ان کی زبانیں بیان کرتی ہیں جھوٹ کو (یعنی یہ کہ جھوٹ ایسا ہوتا ہے) تو ان کی زبانیں دنیا کے جھوٹ کے واسطے معیار اور کسوٹی ہیں جو دنیا کو بتاتی ہیں کہ جھوٹ ایسا ہوتا ہے۔ اس کی مثال محاوراتِ فصحاء میں ایسی ہے کہ کمالِ حُسن کو بیان کرنے کے لئے کہا جائے فلان یصف وجهه الحسن کہ فلاں شخص ایسا ہے کہ اس کا چہرہ حسن کی حکایت کرتا ہے۔ اور حسن کو بیان کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے نہ صرف یہ کہ وہ حسین ہے بلکہ اس کا چہرہ معیار حسن ہے کہ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حسن ایسا ہوتا ہے۔ غرض کلام اللہ کے اطناب میں ہر جگہ اور ہر مقام میں اسی قسم کے بے شمار نکتے اور لطائف ہیں اطناب کے اقسام ان کی کلام اللہ سے مثالیں اور ان کے لطائف و معارف کا بیان ان اوراق میں نہیں سما سکتا۔ حق تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو اعجازِ قرآن کے موضوع پر مستقل تالیف میں ناچیز۔ ان کو جمع کرنے کی کوشش کرے گا۔

بحث اقسام القرآن

قرآن کریم کے طرز خطاب میں ایک نمایاں اور خصوصی طرز یہ بھی ہے کہ اکثر مطالب و مضامین کو قسم کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ جو ان مضامین کی صداقت و حقانیت کی گویا دلیل و برہان ہوتی ہیں۔ اہل عرب کا یہ خصوصی ذوق تھا کہ جب کسی امر پر ان کو تاکید و اصرار ہوتا اور اس کی حقانیت و صداقت کو مخاطب پر واضح کرنا چاہتے تو اس مقام پر قسم کا عنوان اختیار کرتے۔ اور قرآن کریم چونکہ لغت عرب پر نازل ہوا۔ اس لئے ان کے اس خصوصی ذوق کی رعایت بھی ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ کلام اللہ میں رکھی گئی کہ وہ اقسام قرآن کے لطائف پر حیرت زدہ ہوتے اور بجز اس اعتراف کے کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ خدا کی قسم یہ کلام بشر نہیں ہے[1]۔

استاذ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے کلام میں قسم کا ذکر فرمایا حجت و برہان کی تکمیل و پختگی کے لئے۔ اس لئے کہ حکم کی تاکید اور برتری کا ذریعہ یا تو شہادت ہے۔ یا قسم تو خداوند عالم نے اپنے کلام میں دونوں نوعیں جمع کر دیں۔ ایک جگہ فرمایا شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملائکۃ واولوا العلم قائما بالقسط کہ اللہ گواہ ہے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی اور اہل علم بھی۔

دوسری جگہ فرمایا قل ای وربی انہ لحق یعنی کہہ دیجئے بے شک قسم ہے میرے رب کی یقیناً وہ حق ہے۔ بعض اعراب سے منقول ہے کہ اس نے جب یہ آیت سنی وفی السماء رزقکم وما توعدون فورب السماء والارض انہ لحق۔ تو چلا اٹھا اور کہنے لگا کون ہے وہ جس نے رب جلیل کو غضبناک کیا حتیٰ کہ رب العزت کو قسم کھانے کی نوبت آگئی۔ (الاتقان ص ۱۳۳ ج ۲)

قسم ہمیشہ اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو کہ عظمت و برتری والی ہو۔ اس لئے حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے دلائل قدرت جو اس کی عظمت و کبریائی کے لئے مستلزم ہیں قسم کے موقع پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں منع کیا گیا کہ کوئی شخص غیر اللہ کے نام سے قسم نہ کھائے۔ بندوں کے استعمال میں خدا کے سوا کسی دوسری چیز کی قسم کھانے میں مقام عظمت میں غیر اللہ کی شرکت لازم آتی ہے۔ اس لئے اس کی ممانعت فرمادی گئی۔ مگر خداوند عالم جب اپنے کلام میں قسم کھائے تو اس کے حق میں یہ برابر ہے کہ وہ اپنے نام اور اپنی ذات و صفات[2] کی قسم کھائے یا اپنی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو برتری عطا

---

[1] حافظ ابن قیمؒ کی اقسام قرآن کے موضوع پر ایک مستقل تصنیف "التبیان فی اقسام القرآن" ہے۔ جس میں تمام اقسام قرآنی کے لطائف و معارف پر کلام فرمایا ہے ۱۲

[2] قرآن میں اللہ نے جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ تین ہیں۔ اول اپنی ذات مقدسہ کی جو سات جگہ ہے۔ اس قسم میں عظمت و جلال مقصود ہے۔ دوم اپنے افعال مقدسہ کی جیسا کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فرماتے ہوئے اس کو قسم کے واسطے اختیار کرے۔ مثلاً تین زیتون صافات، ذاریات، قلم شمس قمر۔ لیل نہار نجم۔ مواقع النجوم وغیرہ کہ ان سب مخلوقات کو قسم کے عنوان کے لئے اختیار فرمایا۔ اور ایک مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگانی کی قسم کھائی گئی فرمایا لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ مقسم علیہ یعنی جس چیز پر قسم کھائی جاتی ہے وہ عظیم الشان ہوتی ہے۔ معمولی باتوں پر قسم کھانا بلغا کا طریقہ نہیں تو قرآن نے جن امور پر قسم کھائی وہ مہتم بالشان امور یہ ہیں۔

(۱) اصول ایمان جن کا اعتقاد مخلوق پر لازم ہے (۲) توحید خداوندی (۳) حقانیت قرآن (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی حق ہونا۔ (۵) قیامت جزا و سزا اور وعدہ وعید کے برحق ہونے پر (۶) کبھی انسان کی حالت پر کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے اور یہ کہ وہ بغیر ایمان اور عمل صالح خسارہ میں ہے (۷) اور یہ کہ انسانی اعمال باہم مختلف ہیں ہر ایک اپنے زعم میں اپنے ہی طریقہ کو حق اور موجب نجات سمجھتا ہے لیکن اس کا فیصلہ کتاب اللہ ہی کر سکتی ہے[۱]۔

حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب التبیان میں اقسام القرآن پر تفصیلی کلام فرماتے ہیں تمام مضامین میں اس امر کی توضیح فرمائی کہ جہاں جس چیز کی قسم کھائی اس چیز کو وہاں بیان کردہ مضمون سے پوری مناسبت ہوتی ہے۔ اور یہ مناسبت معارف اور لطائف قرآنی کا ایک مستقل باب ہے۔ (تفصیل کے لئے اصل کی مراجعت کی جائے)

امثال القرآن

امثال قرآنی کا موضوع بھی مفسرین کے نزدیک اہم ترین موضوع ہے۔ امام ابوالحسن ماوردی رحمہ نے امثال القرآن پر مستقل کتاب تالیف فرمائی۔

یہ ایک فطری اور طبعی امر ہے کہ مقام موعظت اور نصیحت میں امثال کا ذکر مخاطب کے لئے نہایت ہی مؤثر اور دل نشین طرز کلام ہے۔ اسی طرح امور معنویہ کو مخاطب کے سامنے محسوس و مشاہد اور ان کے محاسن و قبائح کو نمایاں کر دینا تمثیلات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ کتب سابقہ تورات و انجیل میں بکثرت مضامین تمثیلی رنگ میں بیان کئے گئے تھے۔ قرآن کریم نے بھی اپنی شان بلاغت کے ساتھ طرز خطاب کے اس مؤثر اور بہترین طریقہ کو معجزانہ انداز میں اختیار فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ

(بقیہ صفحہ ۲۰۲ کا) ونفسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا یہاں بھی عظمت و جلال ملحوظ ہے۔ سوم اپنی مخلوقات کی !!

[۱] تفصیل کے لئے الاتقان فی علوم القرآن کا ملاحظہ فرمائیں۔

يَتَذَكَّرُونَ ۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے کلام میں امثال وعظ وتذکیر کے لئے بیان فرمائی ہیں۔ بہت سی تمثیلات ثواب و عقاب اور ان کے تفاوتِ درجات حسنات وسیئات کے ثمرات و نتائج اور ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہیں۔ اور غرض مقصود یہ ہوتی ہے کہ مراد کو عقل سے اس طرح قریب تر کر دیا جائے کہ وہ معقول کے مرتبے سے تجاوز کرکے سامع کے ذہن میں محسوسات کی شکل اختیار کرلے۔ اگر کوئی معنوی خفاء ہے تو وہ بھی دور ہو جائے۔ اگر کسی شئے کی عظمت بیان کرنی ہے تو اس کی حقیقی اور واقعی عظمت نمایاں ہو جائے اور اگر کسی شئے کی حقارت و خست ظاہر کرنی ہے تو اس کی حقارت و خست علی وجہ الاتم ظاہر ہو جائے۔ اور اگر کسی چیز کی پائیداری اور قوت یا کسی چیز کا ضعیف و ناپائیدار ہونا بیان کرنا ہے تو وہ بھی بخوبی مخاطبین کے ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔

مثلاً آیت سورۂ بقرہ "کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مأة حبة" میں انفاق فی سبیل اللہ کے اجر و ثواب کو محسوس و مشاہد صورت میں ظاہر کیا گیا کہ جس طرح زمین پر ڈالے ایک دانہ گندم سے دنیوی کھیتی میں سات سو دانے انسان کو حاصل ہو جاتے ہیں اسی طرح آخرت کی کھیتی کا بھی حال ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جس کے لئے اللہ چاہے کہ ایک حسنہ کو اللہ تعالیٰ سات سو نیکیوں کے ثواب تک بڑھاتا ہے۔ اگر انسان ایمان واخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے لیکن یہی انفاقِ مال بغیر ایمان و تقویٰ محض ریاء اور حب جاہ کے لئے کیا جائے تو اس کی مثال

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۔

تو ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو) جس پر کچھ مٹی ہو اور اس مٹی میں دانہ ڈالنے سے کچھ گھانس پھونس سا بھی پیدا ہو گیا ہو پھر اس پر زور کی بارش پڑی تو اس نے اس پتھر کو جیسا تھا اسی طرح صاف چکنا بنا ڈالا۔

تو ان کلمات نے مخاطب کے سامنے اس صورت کو محسوس کرکے دکھا دیا کہ انفاق ایمان واخلاص کے ساتھ ایک نفع بخش کھیتی کے مانند ہے اور یہی بذلِ مال اور صرفِ دولت بغیر ایمان و تقویٰ کے کسی چکنے پتھر پر تخم ریزی کی طرح ہے۔

پھر اس تمثیل کے بعد ایک اور بلیغ تمثیل اس معنی کے لئے ارشاد فرمائی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کو ضاعت و بربادی سے بچائے اور ان اعمال کو اس وقت کے لئے کار آمد ذخیرہ بنانے کی فکر کرے جبکہ ہر طرح بے سہارا ہوگا۔ اگر وہ منافع عاجلہ حب جاہ اور احسان جتلانے کی وجہ سے اپنے اعمال کو ضائع کرتا ہے تو اس کا حال تباہی اور بربادی اور حسرت و یاس میں بس ایسا ہے جیسا کہ ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر قسم کے پھل طرح طرح

کے میوے ہوں۔ اس میں نہریں بہتی ہوں۔ شادابی کی کوئی حد و انتہا نہ ہو جب وہ شخص بڑھاپے کو پہنچا اور حال یہ کہ اس کی اولاد چھوٹی ناسمجھ یعنی ایسی نہیں کہ اس کو کما کر کچھ کھلا دے۔ تو ایسے ضعف و پیرانہ سالی اور بے چارگی کے زمانہ میں جبکہ اس کی تمام تر امیدیں اسی باغ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ناگہاں ایک آگ آئی اور بگولوں نے اس باغ کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ تو یہی حال اس شخص کے نفقہ کی بربادی کا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرکے احسان جتائے یا ایذا پہنچائے اور پھر امید لگائے ہو کہ قیامت میں یہ عمل میرے کام آئے گا۔ سو ظاہر ہے کہ قیامت کے روز اس کی امیدوں کا یہ باغ حق تعالیٰ کی ناراضگی اور قہر کے شعلوں سے جل کر خاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مضمون کو ان کلمات میں ارشاد فرمایا گیا۔

ایود احدکم ان تکون لہٗ جنۃ من نخیل واعناب تجری من تحتہا الانہار لہٗ فیہا من کل الثمرات واصابہ الکبر ولہٗ ذریۃ ضعفاء فاصابہا اعصار فیہ نار فاحترقت

کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی شخص اس بات کو کہ اس کے واسطے ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا اس باغ کے نیچے بہتی ہوں نہریں ایسا باغ کہ اس مالک کے واسطے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور حال یہ کہ اس کو بڑھاپا پہنچا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ناگہاں اس باغ پر ایک آندھی پہنچی جس میں آگ تھی پس اس نے جلا ڈالا باغ کو۔

تو اس تمثیل کے ذریعہ خداوند عالم نے لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی کے مضمون کی ایسی حقیقت واضح فرمائی کہ گویا آنکھوں سے حبطِ اعمال اور بربادیِ صدقات کا منظر نظر آنے لگا۔

اسی طرح ایمان اور عمل صالح کی پائیداری اور کفر و شرک کا ضعف و اضمحلال مخاطب کی نگاہوں کے سامنے اس طور پر ظاہر فرمایا گیا۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء تؤتی اکلہا کل حین باذن ربہا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلہم یتذکرون ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار۔ (ابراہیم)

کیا نہیں دیکھا اے مخاطب کہ کیسی مثال بیان کی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مانند ہے جس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں بلندی میں آسمان تک پہنچ رہی ہیں۔ وہ درخت اپنا پھل دے رہا ہے ہر حال اور زمان میں اپنے رب کی قدرت و اجازت سے (غرض) اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے امید ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں اور مثال کلمۂ خبیثہ (کفر و شرک) کی اس ناپاک درخت کی سی ہے جس کو زمین پر سے اکھاڑ پھینکا گیا جس کے واسطے کوئی مضبوطی اور قرار نہیں ہے۔

غرض اسی طرح قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے علوم و معارف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تمثیلات کے عنوان میں بیان فرمایا۔ قرآن کریم کا یہ طرز بیان بھی سراپا معجزانہ اور محیر العقول ہے جس کا اندازہ امام رازی زمخشری بیضاوی اور علامہ سید محمود آلوسی جیسے ائمہ کی تفاسیر سے ہوسکتا ہے۔

تکرار آیات اور مضامین کی حکمت

قرآن کریم کے طرز بیان میں ایک خصوصی طرز یہ بھی ہے کہ وہ واقعات و قصص اور ان کے اجزاء کو بار بار بیان کرتا ہے اور بعض آیات معینہ بار بار دہرائی جاتی ہیں مثلاً حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیب، اور حضرت موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات قرآن میں متعدد جگہ ذکر کیے گئے۔ اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور فرعون کے ذکر سے تو شاید ہی کوئی حصہ قرآن کریم کا خالی ہو۔ ان تمام واقعات کو قرآن بکثرت کہیں اجمال اور تفصیل سے کسی جگہ بعض اجزاء قصہ اور دوسری جگہ دوسرے بعض اجزاء بیان کرتا ہے۔ اسی طرح بعض آیات مثلاً فبای آلاء ربکما تکذبان اور ویل للمکذبین ایک ہی سورت میں بار بار دہرائی جارہی ہے۔ تکرار مضامین و آیات کی تفصیلی تحقیق تو متعلقہ مقامات کی تفسیر میں امام رازی زمخشری اور علامہ آلوسی کے کلام سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اس مقام پر ان حضرات اور شاہ ولی اللہ کے کلام سے اخذ کردہ بعض اصولی چیزیں اشارۃً بیان کرنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم جن واقعات کو بیان کرتا ہے ہر واقعہ اپنے مختلف اجزاء اور متعدد پہلوؤں کے اعتبار سے بہت سے مفید ثمرات اور اہم نتائج پر مشتمل ہوتا ہے تو ہر مقام و موضوع اور مقصد کی رعایت کرتے ہوئے ہر واقعہ کو کبھی مجموعی طور پر اور کبھی اس کے کسی ایک جزء اور پہلو کو کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور متعدد مقامات پر اس ایک ہی واقعہ کو ذکر کرنے سے ہر مقام کے مناسب ایک نئے فائدہ اور نتیجہ کا اخذ کرنا مقصود ہوتا ہے ان ہی مقاصد و نتائج کی کثرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیان واقعہ یا اس کے اجزاء میں تکرار اختیار کیا جاتا ہے۔ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز مکرر ذکر کی جارہی ہے لیکن مقصد اور غرض کے اعتبار سے وہ مکرر نہیں بلکہ نئی چیز ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بنیادی اجزاء اور پہلو حسب ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد آغوش مادر کے بجائے سمندر کی موجوں کے حوالہ ہو جانا۔ پھر ایک حیرت انگیز طریقہ سے فرعون کے یہاں پہنچ جانا، اسی کے یہاں تربیت پانا۔ قبطی کو قتل کر کے مدین کی طرف بھاگنا۔ وہاں ایک انوکھے طور پر نکاح ہو جانا۔ اہلیہ کو ہمراہ لیجاتے ہوئے آگ کے شعلہ کو

دیکھ کر پہاڑی پر جانا اور وہاں سے منصب نبوت اور معجزہ کا عطا ہونا، پھر دعوت ایمان لیکر فرعون کے پاس جانا۔ فرعون کا تمرّد و سرکشی کے ساتھ تحقیر آمیز سوال و جواب کرنا، معجزات دیکھ کر فرعون اور تمام ساحروں کا ذلیل ہونا۔ انجام کار فرعون اور اس کی قوم کا دریائے نیل میں غرق ہوجانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مظفر و منصور ہو کر بنی اسرائیل کو روز روز کے عذاب سے بچالینا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب قرآن کریم کبھی اس قصہ اور اس کے اجزاء کو اپنی قدرت عظیمہ اور اپنی جلالت شان کے ظاہر کرنے کیلئے ذکر کرتا ہے کہ حق تعالےٰ کی عظمت و طاقت اور سطوت و جبروت کے سامنے فرعون جیسے متمرد اور مغرور و متکبر بادشاہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ دم کے دم میں اللہ نے اس کی سلطنت اور طاقت و شوکت کو درہم و برہم کر ڈالا۔ اتنے بڑے ساز و سامان والا کس طرح بے گور و کفن مارا گیا۔ کسی جگہ مقصود ان ہی ہیبتناک اور رنج و تاسف انگیز واقعات کے بیان کرنے سے غافل بندوں کو عبرت دلانا ہوتا ہے کہ تم کو بھی ان معاصی اور کفریات سے باز رہنا چاہئے جن کا یہ خمیازہ پہلی قومیں بھگت چکی ہیں۔ ورنہ کچھ بعید نہیں کہ خدا کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو۔ کسی مقام پر حضرت موسیٰ اور ان کی اتباع کرنے والوں پر احسان جتانا مقصود ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ان پیغمبر خدا کی اطاعت و پیروی کی وجہ سے یہ انعام فرمائے کہ ایسے جابر و خونخوار کے پنجۂ ظلم سے نجات بخشی جس کے مقابلہ کی کوئی طاقت نہ تھی پھر اسی ظالم کے تاج و تخت کا وارث بھی بنا دیا۔ کسی جگہ معجزات کے ذکر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کا ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ غرض اسی طرح کے اور بہت سے مقاصد ہوتے ہیں جن کے پیش نظر واقعات اور ان کے اجزاء کو ہر ایک مقصد کے اثبات کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ تکرار مطالب قرآن کے متعلق الفوز الکبیر فی اصول التفسیر* میں فرماتے ہیں

"تکرار در مطالب قرآن کریم برائے آنست کہ انچہ خواہیم کہ سامع را افادہ نمائیم دو قسم می باشد یکے آنکہ مقصود آنجا مجرد تعلیم مالا یعلم بود تا مخاطب حکم مجہول را معلوم کند واں نادانستہ دانستہ گردد۔ و دیگر آنکہ مقصود استحضار صورت آن علم در مدرکۂ او باشد تا ازاں لذت فراواں گیرد و رنگ ایں علم بر ہمہ قوی غالب آید۔ و قرآن کریم بہ نسبت ہر یکے از علوم خمسہ کہ بیانش خواہد آمد ہر دو قسم افادہ ارادہ فرمود تعلیم مالا یعلم بہ نسبت جاہل۔ و رنگین ساختن نفوس بداں بہ سبب تکرار۔ بہ نسبت عالم۔ اللّٰہم مگر در اکثر احکام کہ تکرار آنجا حاصل نشدہ افادہ دوم آنجا مطلوب نبودہ و لہذا در شریعت بتکرار تلاوت امر فرمودہ اند نہ بمجرد فہم اکتفا کردہ اند۔ ایں قدر فرق نہادہ اند کہ در اکثر احوال تکرار آں مسائل بعبارت تازہ و اسلوب جدید اختیار فرمودہ اند تا اوقع باشد

---

* صفحہ ۱۰ مطبوعہ کانپور ۱۲

در نفوس والذّ باشد در اذہان اگر تکرار بیک لفظ کنند چیزے باشد کہ بطور وظیفہ آں را تکرار نمایند ودر صورت اختلاف تعبیرات و تغایر اسالیب ذہن خوض کند و خاطر بکلی درآں فرود رود۔"

حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر تعلیم اور ہر حکم کے مخاطب دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ اور دونوں ہی اعتبار و نظریوں کے ساتھ قرآن خطاب فرماتا ہے۔ ایک وہ کہ جو اس حکم سے ناواقف ہیں ان کو تو صرف ایک نامعلوم چیز کی تعلیم دینا مقصود ہے۔ دوسرے وہ کہ محض امر غیر معلوم کی تعلیم مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کیفیت کا قلب میں راسخ کر دینا مقصود ہوتا ہے تاکہ قوت مدرکہ اس علم کا پورے طور پر استحضار رکھے اور طبائع اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اسی کے رنگ میں رنگی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں ملکہ بغیر اس کی پابندی اور التزام اور بار بار کی مشق کے نہیں حاصل ہو سکتا۔ اسی طرح اذہان و طبائع کا علوم الٰہیہ کے رنگ میں رنگا جانا تکرار و مداومت کا محتاج ہوگا۔ جیسا کہ نماز روزہ اور تمام عبادات کی پابندی اس امر کا باعث ہے کہ ہم اطاعت وانقیاد کے خوگر ہو جاتے ہیں اور بلکہ بسا اوقات اس کے ترک سے اذیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح کلمہ توحید اور ذکر اللہ کی پابندی حق تعالیٰ کے تصور اور اس کی محبت قلب میں جما دینے کی تاثیر رکھتی ہے۔ قلب میں اس کیفیت کے رسوخ کا ذریعہ کثرت ذکر کثرت تلاوت تکرار اور مواظبت عمل ہے تو مضامین و مطالب قرآنیہ کا تکرار بھی اسی لئے ہے تاکہ مخاطبین کے قلوب میں یہ مضامین و علوم پورے طور پر راسخ و متمکن ہو جائیں اور طبیعت انہی کی رنگ میں رنگی جائے، ذہن ان کی حلاوت و شیرینی سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ پھر مزید خوبی یہ کہ تکرار بعینہ ایک ہی لفظ اور عنوان کے ساتھ نہیں بلکہ ہر جگہ تازہ عبارت اور نئے اسلوب کے ساتھ ہے۔ تو اختلاف تعبیرات کی وجہ سے ذہن کو زیادہ غور و خوض کا موقعہ ملتا ہے اور مدرکۂ انسانی کو ہر بار اس مضمون کے سننے سے نئی لذت حاصل ہوتی ہے۔

سورۂ رحمٰن میں ایک ہی آیت فبای آلاء ربکما تکذبان بار بار دہرائی گئی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سورت میں اپنی مخلوق جن و انس پر بڑے بڑے انعامات کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر نعمت کے ذکر کے بعد اس آیت کو لایا گیا۔ تقریر و تثبیت کے اور الزام حجت کے طور پر کہ اے جن و انس (بھلا بتاؤ) اب اپنے رب کی نعمتوں میں کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (ان کی ناشکری کروگے) مقصد یہ ہے کہ سامع ہر ہر نعمت پر متنبہ ہو کر اپنے پروردگار کی نعمتوں کو پہچانے اور ان کا شکر بجا لانے کے لئے آمادہ ہو۔ اس سورت میں انعامات کا ذکر ایک تو بصورت انعام ہے کہ ان نعمتوں کو یاد دلایا گیا جو منعم حقیقی کی طرف سے بندوں پر کی گئیں۔ اور دوسرے اخروی رنج و غم اور عذاب جہنم کے بیان میں اپنے انعام کو ذکر فرمایا تاکہ ان آلام اور کیفیات مصائب کو سنکر ان امور سے پرہیز کریں جو عذاب اخروی کا سبب ہیں۔ تو ان امور کا ذکر بھی

انعام ہے۔ اگرچہ بیان تو عذاب و شدت کا ہے لیکن چونکہ مقصد بندوں کو اس عذاب و شدت سے بچنے کی تعلیم ہے۔ اس لئے ایسے احوال کا ذکر بھی یقیناً نعمت خداوندی ہی ہوا۔ اور اس پر اس آیت فبای آلاء ربکما تکذبان کا ربط نہایت ہی لطیف رہا۔ جیسے زانی و بدکار اور لوٹ و غارتگری ڈالنے والوں کی سزا نیک طبیعت اور پاکباز لوگوں کو بعنوان بشارت اور سزا دینے والے حاکم کے انعام کے طور پر بیان کی جائے۔ مادیات میں جس طرح تریاق کا ذکر مخاطب کے لئے انعام ہے اسی طرح سم الفار اور اس کے مہلک نتائج کا بیان بھی اس معلم کا بڑا انعام ہے جو اپنے مخاطب کو نافع اور مضر تمام اشیاء ہی سے واقف کر دینا چاہتا ہے۔

چنانچہ امام رازی نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز اور سید مرتضیٰ کتاب الامالی میں فرماتے ہیں۔

ان فعل العقاب وان لم یکن نعمۃ فذکرہ ووصفہ والانذار بہ من اکبر النعم لان فی ذلک زجراً عما یستحق بہ العقاب الخ (کتاب الامالی ص۳)

فعل عقاب اور عذاب بظاہر اگرچہ نعمت نہیں ہے لیکن اس کا ذکر کرنا اور اس کی کیفیت کا بیان کرنا بڑی عظیم الشان نعمتوں میں سے ہے کیونکہ اس کے ذکر سے ان برے کاموں سے توبیخ اور روکنا مقصود ہے جن کے کرنے سے انسان عذاب خداوندی کا مستحق ہو جاتا ہے

شیخ سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں۔

وقد سئل ای نعمۃ فی قولہ تعالیٰ کل من علیھا فان۔ فاجیب باجوبۃ احسنھا النقل من دار الھموم الی دار السرور و دار الراحۃ للمؤمنین۔

کہ یہ سوال کیا گیا کہ "کل من علیہا فان" یہ کون سی نعمت ہے (جس کے بعد "فبای آلاء ربکما تکذبان" لایا گیا) تو اس کے متعدد جواب دیئے گئے جن میں سے بہتر یہ ہے دار التکالیف اور رنج و آلام کی زندگی سے دار السرور کی طرف منتقل ہو جانا ایک بڑی نعمت ہے جو کل من علیہا فان کے ضمن میں بیان ہوئی۔ اور اس میں مؤمن کے لئے راحت بھی ہے۔

غرض قرآن کریم کے خصوصی طرز خطاب میں تکرار مضامین و آیات بھی ہے جس کے بے شمار اسرار و حکمتیں ہیں بطور مثال یہ چند کلمات ذکر کر دیئے گئے۔

ہم بحث اعجاز قرآن میں عرض کر چکے ہیں دنیا کے تمام اہل علم افکار و انظار بھی معارف اور حقائق قرآنی کا پورا ادراک کرنے سے عاجز ہیں جو کچھ بھی ہم اس کی نسبت سمندر کے سامنے صرف ایک قطرہ جیسی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا فرمان تمام دنیا کے عقلاء اہل علم اور ارباب نظر و فکر کے لئے یہ ہے۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا — اور نہیں دیا گیا اے لوگو تم کو علم میں سے مگر صرف قلیل حصہ۔

تو ظاہر ہے کہ یہ محدود علم لامتناہی اور غیر محدود حقائق و علوم کے منتہیٰ تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔
سبحان رب السموات ورب الارض رب العالمین ولہ الکبریاء فی السموات والارض و
ھو العزیز الحکیم

قرآن کریم کا طرز استدلال

قرآن کریم کا اپنے معانی اور مطالب پر طرز استدلال بھی ایک عجیب معجزانہ شان رکھتا ہے جو نہایت لطیف اور محکم ہونے کے باوجود اس قدر سہل اور آسان بھی ہوتا ہے کہ جس کو ایک طرف بڑے سے بڑا حکیم و دانا اور فیلسوف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تو دوسری طرف ادنیٰ سے ادنیٰ فہم والا انسان حتیٰ کہ اونٹ اور بکریاں چرانے والے جاہل بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں (ہر دو گروہ کا قرآنی دلائل سے اپنے اپنے ذوق اور فہم کے بموجب مستفید ہونا منجملہ معجزات قرآن ہے کہ) اگر قرآن کریم میں صرف حکیمانہ ہی طریق استدلال بیان کئے جاتے تو عوام مستفید نہ ہوتے۔ مثلاً کتاب الٰہی کا پہلا فرض منصب یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور اس کے صفات کا وجود کسی دلیل سے پیش کرے۔ کیونکہ انسان فطری طور پر اس بات کا خوگر ہے کہ وہ صرف محسوسات کی حد تک تسلیم کرتا ہے۔ غیر محسوس وجود کا وہ بڑی مشکل سے قائل ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک عام انسان تو ان امور کو بھی تسلیم کرنے یا سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جو علوم حسیہ کے بلند ترین مقامات پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور جو لوگ ان محسوسات کے ماہر اور ان میں حیرت انگیز ایجاد و اختراع پر قدرت رکھتے ہیں ان کو بڑا حکیم و فلاسفر کہا جاتا ہے، مگر ان تمام علوم اور ایجادات کی بلندی تک پہنچ جانے کے باوجود غیر محسوسات کا وجود تسلیم کرنے میں اکثر اسی ابتدائی حالت میں پڑے ہیں اور غیر محسوسات کے وجود کا انکار کرتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی ذات ملائکہ ارواح جنت و جہنم سب شامل ہیں۔ دوسرے مذاہب کی کتابیں جہاں تک ہمارے سامنے ہیں جن کو ان کے معتقد الہامی اور کلام الٰہی کہتے ہیں ان سب کو اول سے آخر تک دیکھ جایئے کہیں بھی ایک دلیل ایسی نہیں ملے گی جو خدا کے وجود کو ثابت کر دے ہاں یہ ملے گا کہ خدا موجود ہے وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اس کی عبادت کرو اس کو مانو اس سے محبت کرو۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سب دعاوی ہیں جن کو صرف وہی تسلیم کریں گے۔ جو کتاب الٰہی اور الہام خداوندی کے قائل ہیں مگر اس منکر کتاب و الہام کے سامنے جو موجودات کا دائرہ صرف محسوسات تک محدود مانتا ہے۔ یہ دعاوی حجت اور تسلی بخش نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم نے سب سے اول سورت کے شروع ہی پہلے ہی جملے میں اس بات کو ثابت کر دیا۔ الحمد للہ رب العالمین کہ سب خوبیاں اور ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور وہ اللہ کون ہے؟ ربّ

العالمین۔ اب عالم کے جملہ انواع واصناف پر ایک نظر ڈال جایئے۔ عالم سفلی سے لیکر عالم علوی تک عالم انسان سے لیکر عالم حیوانات تک عالم نباتات عالم جمادات عالم عناصر عالم افلاک عالم سیارات و نیرات ان میں سے کوئی سی بھی چیز۔ ایسی نہیں جو اس کے فیض تربیت اور پرورش سے خالی ہو۔

سب سے اول انسان اپنے حالات پر غور کرے کہ نطفہ کو تدریجاً کس کمال تک پہنچایا جاتا ہے؟ خردہ انسان کامل ہو جاتا ہے۔ سیارات و نیرات کی اور باتوں کو جانے دیجئے ان کی مجموعی رفتار ہی عجیب انداز کے ساتھ ہے کہ ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا یہ نہ تو ان کے مادہ کا فعل ہے نہ ان کی طبیعت کا اس لئے کہ یہ دونوں مدرک اور صاحب شعور نہیں۔ پھر ان کے جس قدر افعال تسلیم کئے جائیں انہی کے اجسام تک محدود ہیں۔ دوسرے جسم میں ایک طبیعت اور مادہ کا فعل ارادی پہنچنا حیطۂ امکان سے باہر ہے۔

اب اس دلیل سے عوام بھی مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہ دیکھ لیا اور جان لیا کہ ضرور ان سب موجودات سے بالاتر ایک ایسا وجود ہے جو ان سب کی پرورش کر رہا ہے۔ اور اسی کو ایک حکیم بھی منطقی قاعدہ پر برہان بنا کر اطمینان کر سکتا ہے۔ کہ

عالم مربوب ہے۔ اور جو مربوب ہے اس کے واسطے مُربّی کا ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عالم کے لئے ایک مربی ہے اور وہی خدا ہے۔

یہی وہ برہان اور طرز استدلال ہے جس سے عالم کا حادث ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ عالم مؤثر سے مستغنی نہیں (کیونکہ وہ مربوب ہے) اور جو مؤثر سے مستغنی نہ ہو وہ حادث ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عالم حادث ہے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ عالم حادث ہے تو اسی سے یہ بھی لازم آئے گا اس کے لئے کوئی مُحدِث و موجد بھی ہے اور وہ خدا ہے۔ دنیا میں جو بہت سی قومیں گمراہ ہوئیں ان کے لئے سب سے پہلے قدم ڈگمگانے کا یہی مرحلہ پیش آیا کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ عالم کسی بات میں کسی کا (خدا کا) محتاج نہیں ہے اور یہی گمان خدا کے ابطال وجود کا سبب بنا۔ پھر اگر کوئی فرقہ ان فرقوں میں سے ترقی کر کے خدا کا قائل بھی ہوا تو وہ ایک ایسے خدا کا جو بالکل بیکار و معطل ہو جس کا عالم پر کچھ بھی اختیار و تصرف نہ ہو۔

چنانچہ قرآن نے دہریوں کے اس بنیادی عقیدہ اور باطل خیال کو نہایت ٹھوس دلائل اور عام فہم انداز بیان سے رد کیا۔ اسی طرح احکام کے بیان میں بھی ایک ایسا سہل اور مؤثر طریق اختیار کیا ہے کہ جس سے بندوں کے دلوں پر اثر ہو اور وہ تعمیل کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اسی لئے کہیں تو اپنی ذات و صفات کے اثبات کے بعد احکام بیان کئے جاتے ہیں تاکہ آمر کی شان اور عظمت اس کو عمل کی مشقت اور پابندی پر آمادہ کر دے کبھی حشر و نشر اور احوال آخرت کے ساتھ ملا کر تاکہ عمل کے نتائج و ثمرات کا بیان عمل پر محرک ہو سکے۔ اور تا ذہنی

کے برے نتائج نافرمانی سے باز رکھ سکیں. کہیں نیک و بد لوگوں کے واقعات کے ساتھ تاکہ ان کے احوال کو معلوم کرکے نیک عمل کی رغبت اور نافرمانی سے نفرت پیدا ہو پھر ان سب کو کسی ایک باب یا ایک فصل میں ترتیب وار جمع نہیں کیا بلکہ اس دوا کو ان شیرینیوں کے ساتھ متعدد جگہ ملا دیا ہے۔ ایک عنوان سے بلکہ مختلف عنوانوں سے پھر ایک بار نہیں بلکہ بتدریج بار بار کسی جگہ اجمال اور کسی جگہ تفصیل کسی مقام پر ترغیب اور کسی مقام پر ترہیب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ قرآن کریم کا یہ طرز ایک امتیازی اور اعجازی شان رکھتا ہے اس کی نظیر بھی کتب سماویہ میں نہیں ملتی۔ قرآن کریم اپنے اسی طرز کے ساتھ تمام اقسام احکام پر مشتمل ہے۔ (البیان فی علوم القرآن)

فرض و واجب کی علامات ۔ فرض ۔ یوصیکم یا وصّی یا اوصینا۔ لفظ امر (ان اللہ یأمرکم)۔ امر کے تمام صیغے جبکہ کوئی قرینہ فرضیت کے خلاف قائم نہ ہو۔ لفظ قضیٰ اور اس کے ہم معنی الفاظ یا اس کے ترک پر عقاب اخروی یا قباحت دنیویہ کا بیان یا اس کے فاعل کی مدح اور اس پر اجر و ثواب کا ترتب۔ اس کی پابندی پر تاکید۔ اس فعل کو ابرار صالحین کا فعل فرمانا۔ اس پر اپنی محبت و رضامندی کا ذکر۔

حرمت و کراہت تحریم کی علامات ۔ لفظ حرام و حرمت کا اطلاق۔ اس پر ممانعت کا وارد ہونا۔ اس فعل کو

ﮯ اصولیین کے نزدیک یہ امر معروف ہے کہ نصوص شریعت دلالت کے اعتبار سے چار انواع پر منقسم ہیں۔ قطعی الدلالۃ والثبوت ۔ ظنی الدلالۃ والثبوت ۔ ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ ۔ ظنی الدلالۃ قطعی الثبوت ۔ احکام میں فرضیت اور حرمت کا درجہ دلالت کی پہلی قسم سے ثابت ہوتا ہے۔ دوسری قسم سے جانب فعل میں استحباب اور جانب ممانعت میں کراہت تنزیہہ۔ تیسری اور چوتھی قسم سے جانب فعل میں وجوب اور سنت کا اور جانب ممانعت میں کراہت تحریم کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے کتب اصول کی مراجعت فرمائی جائے)۔

مجموعی طور پر احکام کی تقسیم فقہائے اس طرح کی ہے۔ مباح: جس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہوں۔

فرض جس کا کرنا کلام اللہ یا تواتر سے لازم اور ترک کرنا معصیت اور موجب عذاب خداوندی اور اس کا انکار کفر ہو۔

واجب ۔ نص غیر متواتر سے جس کا کرنا ضروری لیکن اس کی تاکید و اہمیت درجۂ فرض سے کم ہے۔ اور اس کے انکار سے انسان کافر نہیں ہوتا البتہ فسق کا حکم لگایا جائے گا۔

مندوب و مستحب ۔ جس کے کرنے پر اجر و ثواب اور نہ کرنے پر دنیوی یا اخروی قباحت اور عذاب مرتب نہ ہو۔

حرام ۔ نص قطعی اور تواتر کے ساتھ جس کا ترک کرنا لازم اور اس کا ارتکاب دنیوی قباحت اور اخروی عذاب کا موجب ہو۔

مکروہ تحریمی ۔ جس کی ممانعت نص غیر قطعی سے ثابت ہو جو بالمقابل واجب کے ہے۔ اور اس کا درجہ حرام سے کم تر ہے۔

مکروہ تنزیہی ۔ جس سے پرہیز کرنے پر اجر و ثواب ہو اور اس کا کرنا موجب اسات (برائی) تو ہو لیکن گناہ اور عقاب کے درجہ میں عند اللہ شمار نہ ہوتا ہو۔

رجس یا نجس یا عمل شیطان بتانا۔ اس پر عذاب اخروی یا دنیوی قباحت یا عتاب کا صادر فرمانا۔ اس کے فاعل ومرتکب کی مذمت کرنا۔ اس فعل کو دوسری خرابیوں کا باعث قرار دینا۔ اس کو سفہا اور حمقا کا فعل قرار دینا اس پر اور اس کے فاعل پر لعنت کرنا۔ اس کو اپنے غضب و ناراضگی کا موجب بتانا۔

کلام اللہ کی دلالت احکام شریعت پر دلالت کی تینوں قسموں "مطابقت تضمن اور التزام" کے ساتھ مندرجہ ذیل صورتوں میں پائی جاتی ہے۔

اگر کلام ظاہر المراد ہے اور معنی کا ظہور محض الفاظ ہی سے ہے اگرچہ وہ محتمل تاویل ہو اس کو ظاہر کہا جاتا ہے اگر یہی معنی مقصودی سیاق کلام سے ظاہر ہو رہے ہیں اور متکلم نے اسی کا ارادہ کیا ہے تو نص کہا جائے گا۔

مثلاً آیت لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا مقصد کلام مہاجرین کا مال غنیمت اور فے میں حق بیان کرنا ہے تو اس معنی کے اعتبار سے یہ کلام نص ہے۔ اور اس کے ساتھ لفظ فقراء کے اطلاق سے یہ بھی ظاہر و معلوم ہو رہا ہے کہ دار الکفر میں چھوڑی ہوئی املاک سے مہاجرین کی ملکیت زائل ہو چکی۔ کیونکہ اگر بعد الہجرت ان املاک کا اعتبار ہوتا تو ان کو فقراء کے عنوان سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ تو اس مفہوم کے اعتبار سے یہ کلام ظاہر ہے۔

اور اگر کلام کی مراد اس درجہ ظاہر و واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے معنی کی تاویل کا امکان نہیں البتہ نسخ کا امکان ہے تو اس کو مُفسَّر کہا جائے گا۔ اور اگر مدلول کی قطعیت اس درجہ ہے کہ اس میں نسخ کا بھی امکان نہیں رہا تو محکم ہے۔ کلام اللہ کی وہ تمام آیات جو فرائض و واجبات اور منہیات توحید و صفات خداوندی نبوت و رسالت مبدأ و معاد جزا اور تمام احوال آخرت پر مشتمل ہیں وہ سب مفسر و محکم ہیں۔

یہ چار قسمیں وہ ہیں جن میں مراد کا درجہ بدرجہ ظہور ہے۔ ان کے بالمقابل ایک حصہ کلام اللہ کا ایسا ہے جس سے مراد اور معنی اخذ کرنے کے لئے اہل علم غور و فکر اور تحقیق و تنقیح کے محتاج ہوتے ہیں اس حیثیت سے بھی نصوص کلام اللہ اور آیات قرآنیہ کے درجات متفاوت ہیں۔

(۱) اگر معنی کا خفا کسی عارضی سبب سے ہے نفس الفاظ اور ان کی دلالت میں کوئی ابہام نہیں تو اس کو خفی کہتے ہیں

(۲) اور اگر خفا معنی کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ہو تو اس کو مشکل کہتے ہیں جیسے کہ آیت سرقہ کفن چور کے حق میں معنی سرقہ کی کمی اور طرار وکیسہ بُر (اچکے اور جیب تراش) کے حق میں معنی سرقہ کی زیادتی کی وجہ سے مشکل ہو گئی ہے۔ مگر یہ خفا ایسا ہے کہ مخاطب سیاق و سباق (مابعد و ماقبل کلام) میں غور کرے تو دور ہو جاتا ہے۔

(۳) اور اگر یہ خفا تامل اور غور سے بھی دور نہ ہو بلکہ متکلم کی جانب سے وضاحت کی احتیاج ہو تو ایسے کلام کو مجمل کہتے ہیں جیسے والعادیات ضبحاً وغیرہا کہ ان سے مراد گھوڑے ہیں یا اونٹ؟

(۴) اور اگر یہ امید بھی باقی نہ رہے تو اس کو متشابہ کہتے ہیں جیسے مقطعات قرآنیہ اور آیات صفات متشابہات غرض ان تمام اقسام اور انواع سے کلام الٰہی اپنے مطالب پر دلالت کرتا ہے۔

بحث ناسخ ومنسوخ

اصول تفسیر میں معرفت ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ ایک اہم اور مشکل ترین مسئلہ ہے۔ متقدمین نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ چنانچہ امام ابو عبیدۃ القاسم بن سلام متوفی ۲۲۳ھ امام ابوداؤد السجستانی صاحب سنن متوفی ۲۷۵ھ ابوجعفر النحاس ۳۳۸ھ ابن الانباری ۳۲۸ھ مکی بن ابی طالب ۳۱۳ھ ابوالفرج ابن الجوزی ۵۹۶ھ اور قاضی ابوبکر ابن العربی وغیرہ ائمہ ومفسرین نے اس عنوان پر تصانیف کیں۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ کسی ایسے شخص کے لئے کلام اللہ کی تفسیر کرنا جائز نہیں جو ناسخ ومنسوخ کی معرفت نہ رکھتا ہو۔ نسخ لغت میں کسی چیز کے ازالہ یا مٹا دینے نقل وتحویل کر دینے کو کہا جاتا ہے۔ محاورات عرب میں "نسخت الریح آثار القوم" بایں معنی استعمال کیا جاتا ہے کہ ہوا نے قوم کے نشانات مٹا دیئے اور اسی طرح بولا جاتا ہے نسخ الکتاب الی کتاب۔ اور نسخت الکتاب جبکہ اس کو نقل کیا جائے۔ لفظ نسخ آیت فینسخ اللہ مایلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ میں ازالہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اصطلاح شریعت میں نسخ کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم شرعی سابق کو رفع کر کے اس کے قائم مقام دوسرا حکم مقرر کرنا جیسے کہ خود ارشاد خداوندی اسی معنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا الخ اصولیین بیان کرتے ہیں نسخ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکم شرعی کی دوسرے کسی حکم سے تبدیلی ہے لیکن حقیقت نسخ یہ ہے کہ حکم سابق جو عند اللہ ایک معین اور محدود وقت کے ساتھ مقید تھا اس کی مدت کے ختم ہوتے پر دوسرے حکم مؤبّد کا مقرر کر دینا ہے۔ جیسے کوئی طبیب حاذق کسی مریض کے لئے ابتداء معالجہ میں ایک نسخہ تجویز کرتا ہے اور بوقت تجویز یہ جانتا ہے کہ اس مریض کے لئے اس نسخہ کا استعمال مثلاً ایک ہفتہ کرانا ہے ایک ہفتہ گذرنے پر طبیب اس کی جگہ دوسرا نسخہ بدل دیتا ہے تو حکیم کا یہ دوسرا نسخہ تبدیل کرنا اس بنا پر (یقیناً) نہیں کہ اس کو اپنے پہلے نسخہ میں آج کسی خرابی اور نقصان کا علم ہوا یا وہ ثانی نسخہ کی خوبی اور فائدہ سے پہلے غافل تھا آج وہ اس کے فائدہ پر مطلع ہوا تو جس طرح ایک مدت گذرنے پر نسخہ کی تبدیلی کمالِ طب ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں نسخ اور تبدیلی بھی حق تعالیٰ کی کمالِ حکمت ہے امور تکوینیہ مثلاً غنا وفقر صحت ومرض سلطنتوں کے زوال وعروج میں تغیر وتبدل عین مقتضائے حکمت ہے۔ اسی طرح احکام شرعیہ میں با قتضائے زمان ومکان تغیر وتبدل بھی سراپا حکمت ہی ہے۔ اور اس تغیر وتبدل سے اللہ کے علم میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ جو کچھ تبدیلی ہے وہ ہمارے علم کے اعتبار سے ہے۔ حق تعالیٰ

کی شان تو یہ ہے کہ لا یضل ربی و لا ینسی۔ لیکن احکام کی تشریع اور ان کی تبدیلی یہ سب امور چونکہ منصب نبوت سے متعلق ہیں اس لئے انبیاء کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی بھی بناء پر اور کوئی بھی مصلحت و حکمت کا مدعی بنکر احکام خداوندی کے نسخ یا ان میں تغیر و تبدیل کا اپنے کو اہل تصور کرے۔

شیخ جلال الدین سیوطی ابن الحصار سے نقل کرتے ہیں فرمایا کہ نسخ کا دارومدار نقل صریح (اور صحیح) ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یا کسی صحابی سے اس طور پر وضاحت کے ساتھ کہ فلاں آیت کے لئے ناسخ ہے" اور نسخ کا فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جبکہ ہر دو آیات میں تعارض قطعی ہو اور یہ معلوم ہو کہ ان میں کونسی آیت مقدم ہے اور کونسی مؤخر۔ نسخ کے بارہ میں نہ تو عام مفسرین کا قول معتبر ہے اور نہ مجتہدین کا اجتہاد بغیر کسی نقل صریح اور حدیث صحیح کے۔ کیونکہ نسخ ایک حکم شرعی کے رفع اور اس کی جگہ دوسرے حکم شرعی کے تقرر کو زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متضمن ہے۔ اور ظاہر ہے کہ احکام شرعیہ کے رفع اور تقرر کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرف دلیل قطعی نقل صریح اور ثبوت تاریخ کا محتاج ہے۔ رائے اور اجتہاد اس امر میں کسی طرح قابل اعتبار نہیں بعض حضرات اس مسئلہ میں افراط و تفریط کا طریقہ اختیار کرتے ہیں کوئی اخبار احادیث صحیحہ کو بھی (جو عندالاصولیین حجت شرعیہ اور اثبات احکام کے لئے کافی ہیں) معتبر نہیں جانتا۔ اگرچہ ان کا ثبوت بلاشبہ ثقہ اور عادل راویوں سے ہو۔ اور بعض تساہل پسند ہر مجتہد کے اجتہاد اور ہر گمان کرنے والے کے ظن و تخمین کو کافی سمجھ لیتے ہیں[۵]۔

اس مقام پر یہ بات قابل وضاحت ہے کہ نسخ کا محل صرف احکام عملیہ اور فرعیہ ہیں یعنی ان احکام کے قوالب اور صورتیں کہ ان میں بلحاظ اقوام اور حسب ضرورت و اوقات انبیاء کے توسط نسخ اور تغیر و تبدل ہوا ہے۔ مثلاً نماز کسی پیغمبر کے زمانہ میں صرف تسبیح و تہلیل اور دعا تھی تو کسی دوسرے پیغمبر کے عہد میں اس میں رکوع و سجود اور بعض دیگر ارکان و شرائط کا اضافہ کر دیا گیا۔ انبیاء سابقین کی شریعتوں میں دوگانہ نمازیں فرض تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نمازوں کی فرضیت پنجگانہ کر دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت خمر کے ساتھ ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام فرما دیا تھا جو شراب کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ تاکہ شراب کی نفرت دلوں میں پورے طور پر راسخ ہو جائے جب شراب سے نفرت قلوب میں جم گئی تو پھر ان اقسام ظروف اور برتنوں کی حرمت کا حکم رفع فرما دیا گیا۔ اور اجازت دے دی گئی کہ وہ برتن استعمال کر سکتے ہو جو برتن اہل عرب بالعموم شراب بنانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ فروعی احکام اور عملی جزئیات میں نسخ تورات و انجیل سے خود ثابت ہے (لیکن اس کے باوجود محض عناد کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نسخ احکام پر اہل کتاب معترض ہوتے) مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام کے عہد میں دو حقیقی بہنیں ایک ساتھ ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا درست تھا۔ چنانچہ لیا اور راحیل دو حقیقی بہنیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں ساتھ جمع تھیں (سفر تکوین ب ۲۹) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جمع بین الاختین کا جواز۔

[۵] الاتقان ص ۲۲ ج ۲

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بہت سے جانور حرام کر دیئے گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کی حرمت منسوخ فرمائی۔ جیسے کہ ارشاد ہے وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔

فروعی احکام اور عملی جزئیات سے مراد وہ احکام ہیں جو شہوات نفس اخلاق رذیلہ سے اجتناب اور روح انسانی پر تار کی پیدا کرنے والی چیزوں مثلاً زنا، قتل، جھوٹ، ظلم، بت پرستی کے ماسوا ہوں کیونکہ ان امور کو نہ کوئی دوسری شریعت منسوخ کرتی ہے اور نہ ہی کسی پیغمبر کی شریعت میں ایسا ہوا کہ کبھی حرام ہوں اور پھر کسی زمانہ میں ان کی حرمت منسوخ کر دی جائے۔ اسی طرح اصول عبادات مثلاً نماز، صدقہ، روزہ اگرچہ ان کی عملی تفاصیل میں نسخ ہوا ہو کہ مگر ان تمام امور میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متحد ہیں۔ یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے اس فرمان کا

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوریٰ)

اور یہی معنی آیت اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (الانعام) کے ہیں۔

اسی طرح ان تمام علوم و معارف میں بھی نسخ واقع نہیں ہوتا جو حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق ہیں اور نہ ان قصص و واقعات میں جو حضرات انبیاء کے واسطہ سے معلوم ہوئے۔ اور اسی طرح قیامت اور احوال قیامت جنت و جہنم اور جملہ امور نظریہ و اعتقادیہ میں کبھی نسخ نہیں ہوا نہ خود ایک نبی کی شریعت میں ان امور میں کسی وقت کوئی تغیر و تبدل ہوا اور نہ ہی کسی شریعت نے دوسرے پیغمبر خدا کے بیان کئے ہوئے اعتقادی نظریات کو منسوخ کیا۔ؐ

نسخ کی یہ تفسیر و تشریح اصولیین کی اصطلاح کے پیش نظر ہے۔ صحابہ اور تابعین کے دور میں نسخ کے مفہوم میں توسع اختیار کیا جاتا تھا۔ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید یا کسی مجمل کا بیان و توضیح یا کسی حکم سابق کو بعد میں کسی شرط اور وصف کے ساتھ مقید کرنے یا کسی قید و وصف سابق کے رفع کرنے کو بھی نسخ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے متقدمین کے یہاں آیات منسوخہ کا عدد زائد معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو پانچ سو تک آیات منسوخہ شمار کی ہیں۔

شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں نسخ آیات پر مبسوط کلام فرماتے ہوئے شیخ ابن العربی کی تحقیق کے مطابق تقریباً بیس آیات میں نسخ کا قول اختیار کیا۔ اور اس کو متاخرین کی تحقیق قرار دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے الفوز الکبیر میں ان مواقع کو ذکر کرتے ہوئے بہت سے مواقع پر تردد ظاہر کیا۔ اور تمام قرآن میں صرف پانچ آیات میں نسخ کے قائل ہوئے۔

ؐ اس سے معلوم ہوا کہ دین کے امور نظریہ و اعتقادیہ میں رد و بدل اور ان میں کسی نوع کا تغیر گویا تمام انبیاء کی شریعتوں کی تحریف ہے ۱۲

سورۂ بقرہ :- آیۃ[۱] کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف منسوخ ہے آیت میراث یوصیکم اللہ فی اولادکم سے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور بعض فقہاء فرماتے ہیں۔ حدیث اَلَا لَا وصیۃ لوارث سے منسوخ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آیت وصیت منسوخ آیت میراث ہی کے ذریعے ہے۔ حدیث الا لا وصیۃ لوارث بیانِ نسخ ہے۔

آیت[۲] وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ آیۃ "فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ" سے منسوخ ہے اور بعض کا مسلک یہ ہے کہ محکم ہے اور لفظ لا کی تقدیر کے ساتھ آیۃ کو شیخ فانی اور عاجز کے حق میں لیتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک آیت کا ایک اور مفہوم بھی ممکن ہے وہ یہ کہ وعلی الذین یطیقونہ میں طاقت صوم کے معنی نہ لئے جائیں بلکہ طاقت اطعام (یعنی کھانا کھلانے کی طاقت) مراد ہو جس سے مقصد حق تعالیٰ کا ادا صدقۃ الفطر بیان کرنا ہے۔ روزہ کے قائم مقام الطعام طعام بیان کرنا مقصد نہیں ہے تو حق تعالیٰ اس مقام پر صدقۃ الفطر کے بعد حکم صیام کا ذکر فرمایا جیسا کہ آیۃ ثانیہ میں بعد میں تکبیرات عیدین کا بیان فرمایا۔ ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون میں۔

آیت[۳] احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الیٰ نساءکم الخ ناسخ ہو آیۃ کما کتب علی الذین من قبلکم کے لئے کیونکہ آیت کما کتب علی الذین من قبلکم کا مقتضا یہی ہے جس طرح اہل کتاب پر سو جانے کے بعد رات کے کسی حصہ میں بھی کھانا پینا اور اپنی عورتوں سے قربت کرنا حرام تھا اسی طرح اس شریعت میں بھی۔ چنانچہ ابتدا اوائل میں یہی حکم مشروع تھا مگر بعد میں اس کی اباحت کا حکم آیۃ احل لکم کے ذریعہ بیان کر دیا گیا۔

شاہ صاحب رح فرماتے ہیں کہ کما کتب میں تشبیہ نفس وجوب کے اعتبار سے ہے نہ اس اعتبار سے کہ جمیع احکام فرعیہ اور جزئیات میں بھی اہل کتاب ہی کی طرح روزوں کو مقرر کیا گیا۔ تو اس صورت میں نسخ نہ ہوگا۔ یہ جو کچھ قرآن کریم نے آیۃ احل لکم میں بیان کیا وہ اس طریقہ کی تبدیلی ہے جو ان کے درمیان اس حکم خاص کی مشروعیت سے قبل تھا۔ کیونکہ اس کی کوئی دلیل قطعی نہیں ہے کہ یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مشروع فرمایا تھا۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حرمت اکل وشرب بعد النوم آنحضرت کی جانب سے تھا تو آیۃ کلام اللہ دوسری آیۃ کے لئے ناسخ نہ ہوگی بلکہ سنت کا نسخ ہوگا کتاب اللہ کے ذریعہ۔

آیۃ[۴] ویسئلونک عن الشھر الحرام الخ۔ ابن جریر طبری عطاؔ کی روایت سے نقل کرتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ آیۃ وقاتلوا المشرکین کافۃ سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آیۃ مذکورہ تحریم قتال پر دلالت نہیں کرتی بلکہ جواز قتال آیۃ سے مفہوم ہوتا ہے۔ درحقیقت آیۃ کا مدلول مانع عن القتال اور خصم کی دلیل تسلیم کرتے

ہوئے یہ ہے کہ قتال شہر حرام میں اگرچہ بہت شدید چیز ہے لیکن کفر و شرک کا فتنہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے کفر و شرک کے بالمقابل قتال فی الشہر الحرم کی قباحت قابل تحمل ہے۔ اور چنانچہ یہ توجیہ سیاق کلام سے بخوبی واضح ہے۔

آیۃ ۵ - والذین یتوفون منکم الی قولہ متاعاً الی الحول غیر اخراج۔ بالعموم ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے آیۃ "اربعۃ اشہر وعشراً" سے۔ اور آیۃ متاعاً الی الحول میں وصیت کا بیان کردہ حکم آیۃ میراث سے منسوخ ہے۔

آیۃ ۶ - وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ منسوخ ہے آیۃ لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ صورت باب نسخ سے نہیں ہے بلکہ عام کی تخصیص ہے۔ کیونکہ آیۃ ثانیہ نے یہ چیز ظاہر کردی کہ مافی انفسکم سے مراد (غیر اختیاری وساوس اور خطرات نہیں ہیں بلکہ) اخلاص ونفاق اور وہ باطنی احوال ہیں جو انسان کی قدرت و اختیار کے تابع ہیں۔

آل عمران - آیۃ اتقوا اللہ حق تقاتہ کہا گیا کہ یہ حکم آیۃ فاتقوا اللہ ما استطعتم سے منسوخ ہے۔ اور کہا گیا کہ منسوخ نہیں ہے بلکہ محکم ہے۔ اور کوئی آیۃ بجز آیت مذکورہ کے ایسی نہیں کہ جس سے دعویٰ نسخ صحیح ہو سکے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرے نزدیک حق تقاتہ شرک وکفر اور ان تمام امور کے متعلق ہے جن کا مرجع اعتقاد ہے۔ اور ما استطعتم کا حکم اعمال کے متعلق ہے۔ مثلاً جو شخص وضو کی استطاعت وقدرت نہ رکھتا ہو تو تیمم کرلے۔ یا جو شخص نماز کھڑے ہو کر پڑھنے پر قادر نہیں وہ بیٹھ کر پڑھ لے یہی مضمون مابعد کی آیۃ "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" سے سمجھا جا رہا ہے۔

سورۂ نساء - آیۃ والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم مفسرین کے نزدیک مشہور ہے کہ آیۃ واولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ سے منسوخ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں (نسخ مانتا ضروری نہیں بلکہ) میرا خیال ہے کہ آیۃ کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ میراث موالی (اور اہل قرابت) کے لئے ہے اور ہمدردی وصلہ ان لوگوں کے لئے جن کی ساتھ مواخات وبھائی چارگی کا عہد ہو چکا ہے۔

آیۃ - واذا حضر القسمۃ اولوا القربیٰ الخ کہا گیا کہ منسوخ ہے اور بعض مفسرین کہتے ہیں منسوخ نہیں البتہ بالعموم لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں (تھاون رسستی) کا برتاؤ کیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضؓ کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اور حکم استحبابی ہے۔ (کہ عام رشتہ داروں کو جو ذوالفرض اور عصبات کے علاوہ تقسیم ترکہ کے وقت حاضر وموجود ہوں ان کو بھی بطور تبرع مستحق میراث رشتہ دار اپنے اپنے حصوں میں سے کچھ دیدیں تو اچھا ہو)

آیۃ - واللاتی یأتین الفاحشۃ الخ منسوخ ہے آیۃ سورۂ نور "الزانیۃ والزانی" سے شاہ صاحب فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس مقام پر کوئی نسخ نہیں ہے بلکہ حکم سابق جو ایک غایت اور انتہا کے ساتھ مقید تھا اس حکم کو اس منتہی تک پہنچا دیا گیا اور آیۃ نور نازل ہونے پر آنحضرت نے فرما دیا اے لوگو! یہ ہے وہ راستہ جس کے پیدا کرنے کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا۔ بس اسی کو اختیار کر لو۔

سورۂ مائدہ - آیۃ ولا الشھر الحرام منسوخ ہے ان آیات کے ذریعہ جن میں شہر حرام میں قتال کی اجازت بیان کر دی گئی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں اس آیت کا ناسخ نہ ہم قرآن میں پاتے ہیں اور نہ سنت صحیح میں۔ آیۃ کا مفہوم تو یہ ہے کہ شہر حرام میں قتال محرم کی برائی میں اور زائد شدت ہو جاتی ہے۔ اول تو قتال و خونریزی خود حرام پھر یہ فعل حرام شہر حرام میں حرمت بالائے حرمت کا مصداق بن جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ الا ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمتہ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا۔

آیۃ فان جاءک فاحکم بینھم او اعرض عنھم منسوخ ہے آیۃ "وان احکم بینھم بما انزل اللہ" سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرے نزدیک ہر دو آیتوں کے معنی یہ ہیں اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کرنا پسند فرمائیں تو پھر فیصلہ کیجئے اس کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم اہل ذمہ کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اپنے باہمی قضیئے اور مشاجرات اپنے زعماء کے پاس پیش کر کے فیصلہ کرا لیں لیکن اگر وہ اپنا معاملہ آپ کے پاس لائیں تو پھر اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

آیۃ او اخران من غیرکم منسوخ ہے "واشھدوا ذوی عدل منکم" سے۔ امام احمد بن حنبل ظاہر مفہوم کا اعتبار فرماتے ہیں اور بعض مفسرین فرماتے ہیں من غیرکم کی مراد من غیر اقاربکم یعنی اپنے رشتہ داروں کے علاوہ دو گواہ لیکر آؤ۔ تو اس تقدیر پر اخران من غیرکم مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے اور آیت منسوخ نہ ہوگی

سورۂ انفال - آیۃ ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مأتین منسوخ ہے بعد والی آیۃ الآن خفف اللہ عنکم و علم ان فیکم ضعفا" سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرا خیال بھی یہی ہے کہ آیۃ سابقہ بعد والی آیۃ سے منسوخ ہے جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔

سورۂ براءۃ - انفروا خفافا و ثقالا" منسوخ ہے آیۃ عذر "لیس علی الاعمی حرج" اور آیۃ "لیس علی الضعفاء سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں خفافا کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ادنی وہ تیاری اور سامان جس سے جہاد ممکن ہو اور ثقالا کے معنی یہ ہیں کہ خدام اور سواریوں ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ تو اس صورت میں آیۃ کا نسخ نہ ہوگا۔

سورۂ نور۔ الزانی لاینکح الا زانیۃ آیۃ "وانکحوا الایامی منکم" سے منسوخ ہے امام احمد اسی کے قائل ہیں دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ زانی مرد کفو (اور مماثل) نہیں کسی کا بجز زانیہ عورت کے۔ اور "وحرم ذلک علی المؤمنین" سے تحریم زنا اور شرک کی طرف اشارہ ہے تحریم نکاح غرض کلام نہیں۔ تو اس طرح آیۃ کی مراد ایک خاص امر ہے اور وانکحوا الایامی عام ہے جو خاص کے لئے ناسخ نہیں ہوسکتا۔

آیۃ لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم۔ کہا گیا کہ منسوخ ہے اور کہا گیا کہ یہ حکم منسوخ نہیں لیکن لوگوں نے اس پر عمل میں تہاون اور سستی کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے۔ اور یہی رائے زیادہ اولیٰ اور قوی ہے۔

سورۂ احزاب۔ لا یحل لک النساء من بعد منسوخ ہے آیۃ انا احللنا ازواجک اللاتی سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں احتمال ہے کہ ناسخ مقدم ہو از روئے تلاوت۔

سورۂ مجادلہ۔ اذا ناجیتم الرسول فقدموا منسوخ ہے بعد والی آیۃ سے۔ شاہ صاحب اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

سورۂ ممتحنہ۔ فاتوا الذین ذھبت ازواجھم مثل ما انفقوا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے آیۃ قتال وجہاد سے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ آیۃ غنیمت سے۔ اور بعض کے نزدیک محکم ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ظاہر یہی ہے کہ آیۃ سابقہ منسوخ نہیں ہے البتہ وہ حکم مسلمانوں کی کمزوری اور کفار کے غلبہ وقوت کے زمانہ میں ہے۔

سورۂ مزمل۔ قم اللیل الا قلیلا منسوخ ہے سورۃ کے آخری حصہ "فاقرءوا ما تیسر من القرآن" سے پھر دوبارہ اس حکم کا نسخ پنجگانہ نمازوں کی فرضیت سے ہوا۔ شاہ صاحب اس مقام پر بھی نسخ کے قائل نہیں فرماتے ہیں۔ قم اللیل الا قلیلا قیام اور تہجد کی تاکید ہے۔ اس تاکید کو آخر سورت سے تبدیل کرکے محض ندب اور استحباب کا درجہ بیان ومعین فرمادیا گیا۔

غرض شاہ صاحب ان مواقع مذکورہ میں سے صرف پانچ مقام پر نسخ کے قائل ہیں۔ اور جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ بموافقت ابن العربی ان اکیس[۲۱] آیات میں نسخ کا قول اختیار کیا کرتے ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کا نسخ تین صورتوں کے ساتھ ہے۔

ایک یہ کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوجائیں۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کے بقدر طویل تھی مگر اس کا اکثر حصہ تلاوت اور حکم کے اعتبار سے منسوخ ہوگیا۔

---

۵ الفوز الکبیر ص۱۵

دوسری صورت یہ کہ تلاوت منسوخ ہو گئی لیکن اس کا حکم باقی رکھا گیا جیسے آیۃ رجم کہ اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

انا کنا لنقرء فیھا آیۃ الرجم قلت وما آیۃ الرجم قال الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم۔

البتہ ہم اس سورت میں (جس کی بہت سی آیات منسوخ کر دی گئیں) آیت رجم تلاوت کیا کرتے تھے۔ راوی ذر بن جلیش کہتے ہیں میں نے عرض کیا اور آیت رجم کیا ہے تو فرمایا الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ الخ یعنی جبکہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت (مراد شادی شدہ) زنا کرلیں تو رجم کر ڈالو ان کو ضرور بطور عبرت (یہ قانون) اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔

صاحب برہان نے عمر فاروق رض کا قول نقل کیا ہے۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے اپنی طرف سے کتاب اللہ میں زیادتی کر دی تو میں آیت رجم قرآن کریم میں لکھ دیتا۔ اور یہ بھی منقول ہے فرمایا کرتے اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ آیت رجم انہی آیات میں سے ایک آیت تھی جو کتاب اللہ میں اللہ نے اپنے پیغمبر پر اتاری ہم نے اس کو پڑھا اور تلاوت کیا اور (اس پر عمل کرتے ہوئے) رجم بھی کیا۔ اب ہرگز ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص کتاب اللہ میں اس کو لکھا ہوا نہ دیکھ کر رجم کے حکم شرعی ہونے کا انکار کر دے۔

تیسری صورت یہ کہ حکم منسوخ ہو جائے اور تلاوت باقی رہے۔ یہ صورت قرآن کریم میں کثیر ہے۔ اور اس قسم پر ائمہ نے کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ شیخ سیوطی نے اسی قسم کی وہ اکیس مثالیں بیان کیں جن میں ابن العربی نسخ کے قائل ہوئے۔ ان اکیس مواقع کی تفصیل گذر چکی ہے[1]

بحث غرائب قرآن

غرائب قرآن کی معرفت اور ان کی تشریح بھی ضروریات تفسیر میں سے ہے۔ بیہقی نے بروایت ابو ہریرۃ رض بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَعْرِبُوا القرآنَ وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَہٗ یعنی کلمات قرآن (از روئے تلاوت اور معنی) واضح کیا کرو اور اس کے غرائب کو تلاش کر دان کے معانی اور مفہوم کی تحقیق کرو۔ اس لئے مفسر کیواسطے لازم ہے کہ شرح غریب قرآن کی طرف متوجہ ہو اور اس کو حل کرے۔ تفسیر کا یہ موضوع بھی مفسّرین کے نزدیک خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ابو عمر زاہد ابن درید ابو بکر انباری اور امام راغب نے اس موضوع پر تصانیف فرمائیں۔ جن میں امام راغب رح کی "مفردات قران" شرح مفردات قرآن پر علماء کے نزدیک نہایت ہی پسندیدہ اور جامع کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شرح غریب قرآن بالاستیعاب حضرت ابن عباس رض سے ان کے اصحاب بلسانید

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص ۲۲/۲۴

صحیح کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ شیخ سیوطی رح نے الاتقان میں ابن عباس رض کے تفسیری کلمات بروایت عکرمہ سورہ بقرہ سے تقریباً ختم قرآن تک بیان کئے ہیں۔

کلام میں خفاء معنی کے اسباب متعدد ہوتے ہیں کبھی اشتراک معنی کبھی دلالتِ لفظ کا اپنے معنی پر ابہام کبھی جگہ اضمار کسی جگہ اشارہ کہیں توریہ وکنایہ اور کہیں استعارہ ومجاز اور تمثیل۔ تو یہ امور خفاء مراد کا باعث ہوتے ہیں ان کی تشریح کو فن تفسیر میں شرح غریب کہا جاتا ہے اس میں سب سے بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ آیات کلام اللہ کی وضاحت دوسری آیات سے کی جائے۔ اس کے بعد احادیث مرفوعہ پھر آثار صحابہ وتابعین اور جس امر کی وضاحت محتاج لغت اور قوانین عربیہ ہو اس کی توضیح قوانین لغت اور محاورات اہل لسان کے ذریعہ کی جائے۔

شیخ سیوطی رح صاحب برہان کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس فن کا جاننا بھی مفسر کے لئے ضروری ہے۔ اور شرح غریب کیلئے مفسر علم لغت کا بھی محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ کلمات عرب کو اسماء وافعال اور حروف کے اوضاع انکے معانی اور طرق استعمال کے اعتبار سے پہچان سکے۔[1]

ابوبکر انباری فرماتے ہیں کہ حل مشکلات اور شرح غریب کے لئے قدیم اہل عرب کے اشعار کی طرف بھی رجوع ضروری ہوتا ہے تاکہ ان کے استعمال سے الفاظ قرآن کی دلالت واضح ہو جائے۔ اور معنی لغت کے فہم کے لئے یہ امر قابل تردد نہیں۔ مراد کلام اللہ تو بیشک احادیث ہی سے ثابت ہوگی لیکن معنی لغوی کا سمجھنا تو بہر حال اہل لسان کے محاورات اور طرق استعمال پر موقوف ہے۔

حق تعالیٰ کا فرمان ہے انا جعلناہ قرآنا عربیا۔ ابن عباس رض فرمایا کرتے تھے کہ شعر دیوان عرب ہے سو اگر ہم پر کوئی حرف اس قرآن کریم کا جس کو اللہ نے لغت عرب پر نازل کیا مخفی رہے تو ہم رجوع کریں گے دیوان عرب کی طرف اور اس کے ذریعہ معنی وضعی پہچانیں گے۔[2]

خفاء معنی کی طرح کلام میں اشکال پیدا ہو جانے کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی مضمون دوسرے مضمون اور آیات یا احادیث صحیحہ یا تاریخی واقعات سے مخالف معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہاں کوئی اختلاف نہیں ہوتا یا بظاہر وہ عنوان قواعد لغت اور اصول عربیہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے یا مضمون میں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے یا واقعات کی ترتیب اور قصہ کی ابتداء معلوم نہ ہونے سے اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ یا اس سے متعلق تمام احکام کا علم نہ ہونے سے مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مفسر کے ذمہ ہے کہ اصول تفسیر کی کامل رعایت رکھتے ہوئے جو اشکال فہم معنی میں پیش آئے اس کو دور کرے۔

---

[1] اتقان ص۱۱۵ ج۲ [2] الاتقان ص۱۲۱ ج۲

حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں یا اخت ھارون کے عنوان پر اشکال پیدا ہوا کہ حضرت مریم ہارون علیہ السلام کی بہن کیونکر ہو سکتی ہیں دونوں کے زمانہ میں صدیوں کا فصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشکال کا ازالہ فرمایا کہ یہ وہ ہارون موسیٰ علیہما السلام نہیں۔ بلکہ بنو اسرائیل اپنے پیغمبروں کے نام پر اپنے نام رکھ لیا کرتے تھے۔ تو حضرت مریم اسی ہارون کی بہن ہیں جن کا نام ہارون علیہ السلام کے نام پر تھا۔

کلام میں اجمال کے بھی متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً آیت کا کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ کرنا جس کا کوئی تفصیلی ذکر نہ کلام اللہ میں ہے اور نہ اس کا ذکر کتب سابقہ میں محفوظ اور مستند طور پر ملتا ہے مثلاً آیت

ولقد فتنّا سلیمان والقینا علی کرسیہ جسدا ثم اناب۔

اور البتہ آزمایا ہم نے سلیمان کو اور ڈال دیا ان کی کرسی پر ایک جسد کو پھر سلیمان متوجہ ہوئے (ہماری طرف)

اب محض ان الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سلیمان کی آزمائش کیا تھی اور ان کی کرسی پر ایک جسم کے ڈال دینے کے معنی کیا ہیں۔ غیر محتاط قسم کے لوگوں نے غیر مستند بلکہ اصول دین کے اعتبار سے غلط واقعات ذکر کرنے شروع کردیئے کہ کسی جن نے حضرت سلیمان کی انگشتری کے ذریعہ ان کے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا وغیرہ ذالک۔ ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر کے بارہ میں اصول شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے ان قصوں کا اعتبار کرنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی وہ قصے کلام اللہ کی مراد سمجھا سکتے تھے۔ اس عقدہ اور اجمال کا حل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہوا کہ حضرت سلیمان کو اس امر کا شوق ہوا میری بیویوں سے اولاد پیدا ہو اور وہ سب کی سب مجاہد فی سبیل اللہ بنے۔ اس ارادہ سے قربت کی لیکن انشاء اللہ کہنا یاد نہ رہا۔ انبیاء علیہم السلام کی ذراسی فروگذاشت پر بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نوع کا تنبیہی برتاؤ کیا جاتا ہے تو قدرت خداوندی سے کوئی حاملہ نہ ہوئی بجز ایک کے اور اس نے بھی نا تمام بچہ جنا۔ جوں ہی یہ بات ظہور میں آئی حضرت سلیمان کو تنبہ ہو گیا اور حقیقت حال کو سمجھتے ہوئے حق تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوئے جس کے لئے فرمایا گیا۔

ثم اناب قال رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی۔

کہ پھر متوجہ ہوئے سلیمان۔ کہا اے میرے پروردگار مغفرت فرما میرے لئے اور عطا فرمادے مجھ کو ایک ایسا ملک کہ میرے بعد میرے سوا کسی کے واسطے وہ مناسب نہ ہو۔

چنانچہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کی اس دعا اور ان کے جذبہ جہاد شوق اعلاء کلمۃ اللہ کو دیکھتے ہوئے اعداء اللہ کی سرکوبی اور مقہوری کے لئے ہر نوع کا دنیوی اور مادی سامان اور طاقت انہیں عطا فرمادی۔ اور وہ طاقت کہ ہوائیں، پرند اور جنات بھی ان کے مسخر کر دیئے۔ اسی کو فرمایا کہ ہم نے ایک ایسی سلطنت دیدی۔

فسخرنا لہ الریح تجری بامرہ رخاء حیث

کہ پھر ہم نے تابع کر دیا ان کے لئے ہوا کو کہ وہ ان کے حکم سے

اصفاد والشیٰطین کُلّ بنّاءٍ وّغواصٍ وّاٰخرین مقرنین فی الاصفاد ھٰذا عطاؤنا فامنن او امسک بغیر حساب | جہاں وہ چاہتے نرم چلا کرتی اور جنات کو بھی تابع کر دیا جو ہر ایک عمارتیں بنانے والا اور سمندروں میں غوطہ لگانیوالا ہوتا اور کچھ اور بھی ان کے تابع کر دیئے جو زنجیروں میں ان کے سامنے

جکڑے ہوئے رہا کرتے (اور ہم نے کہدیا) یہ ہے ہماری بے حساب بخشش خواہ کسی کو دیں یا روکیں۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واقعۂ ابتلاء وازمائش کے اجمال کے دور کر دینے سے نفس واقعہ کا بھی علم ہوگیا اور آیات کی تفسیر بھی اس طرح ذہن نشین ہوگئی کہ ماقبل اور مابعد میں پورا پورا ربط معلوم ہونے کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور اس کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی قدرو منزلت بھی معلوم ہو گئی ہے

کلام میں تشابہ معنی کے اسباب بھی متعدد ہوتے ہیں منجملہ ان کے یہ کہ کہیں غیر محسوس کے احوال محسوسات کے پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں مثلاً حق تعالیٰ کی صفات استواء علی العرش ید اللہ فوق ایدیھم۔ کشف ساق اور اللہ کا بادلوں کے سائبانوں میں آنا وغیر ذلک۔ اس قسم کے متشابہات کی توضیح صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہو سکتی ہے۔ کہ جس قدر ان امور کی تشریح آنحضرت نے فرمادی بس اسی حد تک محدود ہے۔ اس سے زائد کسی معنی کی تعیین کے ہم مکلف نہیں (متشابہات کی بحث گذشتہ اوراق میں قارئین کے مطالعہ سے گذر چکی)

مقاصدِ قرآن

انسان کو حق تعالیٰ نے دو قوتیں عطا کی ہیں۔ قوتِ نظریہ۔ اور قوتِ عملیہ۔ اور اس کی عملی زندگی کی سعادت وشقاوت انہی دو قوتوں کی اصلاح ودرستگی اور خرابی پر موقوف ہے۔ تو انسان کی پوری سعادت یہ ہے کہ اس کی دونوں قوتیں کامل ہو جائیں۔ قوتِ نظریہ جس سے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ انسان مبدأ و معاد۔ صحیح طور پر جان سکتا ہے۔ قوتِ عملیہ جس سے انسان کے اعمال و اخلاق اور معاشرہ کی اصلاح متعلق ہے جس کی یہ دونوں قوتیں مکمل ہوگئیں اس کو درحقیقت بڑی نعمت حاصل ہوگئی اور سعادت عظمیٰ کے اس مقام تک پہنچنے کی صلاحیت مہیا ہوگئی جس کے لئے حق تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا اور اس گروہ میں شامل ہو گیا جن پر خدا کی طرف سے انعام فرمایا گیا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد قوت نظریہ اور عملیہ کی اصلاح ہے۔ اس کے بالمقابل وہ شخص جس کی پہلی قوت قاصر ہے وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت سے محروم رہے گا نہ اپنی ماہیت کو پہچانے گا اور نہ مبدأ و معاد کو نہ اس کے نزدیک قیامت ہوگی اور نہ جزاء وسزا نہ وہ رسولوں کی بات پر ایمان لائے گا اور ان کے ارشادات وفرامین کی تکمیل کو

ے تفصیل کے لئے تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی کی مراجعت کی جائے۔

ضروری سمجھے گا۔ غرض وہ اپنے من گھڑت خیالات و تصورات اور توہمات کے گرداب میں پھنسے ہوئے اپنے ہی اوہام و افکار کو منتہائے علم سمجھے گا اور اسی میں مغرور و مست ہوگا۔ اور قوت عملیہ کی خرابی سے اغراض اور شہوات نفسانیہ کی تکمیل ہی مقصد زندگی قرار دے گا۔ دنیوی عیاشیوں، زنا، چوری، شراب خوری، ظلم و استبداد، قتل و خونریزی، بغض، حسد، مال و دولت کی طمع حب جاہ جیسے ناپاک امراض میں مبتلا رہے گا۔ عبادت خداوندی نماز روزہ عدل و انصاف دیانت اور مروت و سخاوت جیسے کمالات سے عاری رہیگا جس کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہوگا کہ مجرمین (مغضوب علیہم اور ضالین) کی فہرست میں اس کا شمار ہونے لگے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رح فرماتے ہیں "مقاصد (قرآن) سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے۔ جیسا کہ علماء کرام نے اسماء حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے۔ مقاصد قرآن حکیم کے وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدار و معاش و معاد اور فلاح و نجاح دنیا و آخرت وابستہ ہو۔"[ے]

حاصل یہ کہ مقاصد قرآن یہ ہیں۔ مبدأ و معاد کے احوال پر بندوں کو متنبہ کرنا۔ اس اعتقاد و یقین اور ایمان پر آمادہ کرنا کہ کائنات کا خالق خداوند عالم ہے۔ وہی قادر مطلق اور مختار ہے موجودات میں ہر شئی اس کے ارادہ اور قدرت کے تابع ہے۔ آسمانوں زمینوں اور ہر موجود کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے۔ انسان کو اللہ نے بہترین صورت عطا فرمائی اور اشرف المخلوقات بنایا اور اس کے واسطے کائنات کی ہر چیز پیدا کی تاکہ یہ دلائل اور نشانیاں اور حق تعالیٰ کے نظام محکم کو دیکھ کر اس کی ربوبیت و خالقیت کو پہچانے اور اس کی اطاعت کرے۔

اس پر متنبہ کرنا کہ اصلاح معاش و معاد کتاب ہدایت اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی دنیوی اور اخروی نجات کے لئے متکفل ہے۔ دنیا متاع الغرور ہے۔ اس کی زیب و زینت اور لذائذ و شہوات اور اس کی شادابی کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ پڑنا چاہئے یہ دنیا اور دنیا کی ہر زینت و رونق بہت جلد فنا ہونے والی شئی ہے۔ انسان کو نہ چاہئے کہ اس ناپائیدار اور فانی چیز کے پیچھے دار الخلود اور دار البقاء کی دائمی نعمتوں اور ابدی راحتوں سے محرومی اختیار کرے۔ قیامت اور اپنے انجام کو یاد رکھے کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور وہاں ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا۔

اعلموا انما الحیوٰة الدنیا لعب ولھو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیثٍ اعجب الکفار نباته ثم یھیج فتراہ مصفرًا ثم یکون حطامًا وفی الاخرة عذاب شدید ومغفرة من الله ورضوان

ے مشکلات القرآن ص۶ حضرت شیخ رحمہ اللہ کے کلمات نہایت ہی بلیغ اور مختصر ہیں خصوصًا یہ کلمہ جیسا کہ علماء کرام نے اسماء حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے۔ حضرت شیخ کے تلمیذ محترم حضرت مولانا محمد یوسف البنوری فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی تشریح کے لئے حضرت الشیخ مولانا شبیر احمد عثمانی رح سے رجوع کیا تو محقق عثمانی نے عارف افغانی فقیر اللہ ابن عبد الرحمٰن جلال آبادی کی کتاب قطب الارشاد کے مطالعہ کے لئے رہنمائی فرمائی۔ اس کے بعد مولانا بنوری زاد اللہ مجدہٗ نے منقح و تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس کلمہ کی تشریح فرمائی۔ اہل علم یتیمة البیان لمشکلات القرآن ص۶۳ کی مراجعت فرمائیں ۱۲

وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

غرض مقاصد قرآن معرفت رب العالمین۔ ایمان وتقویٰ، عمل صالح عدل وانصاف تزکیۂ باطن قیامت حشر ونشر حساب وکتاب احوال جنت وجہنم اور جزا وسزا پر ایمان اصلاح معاش ومعاد کا اطاعت رسول میں انحصار اور ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے میں جن پر اللہ کا انعام ہے اور ان گمراہوں کے طریقہ سے پرہیز کرنے میں جو خدا کے نزدیک مغضوب علیہم اور ضالین ہیں۔ جس کا عملی نتیجہ یہی ہے کہ طاعت وبندگی اور ان تمام امور کو اختیار کرنا جو خداوند عالم کی رضا اور خوشنودی کا سبب ہیں اور ان تمام فواحش ومنکرات اور بے حیائیوں خدا کی نافرمانیوں سے بچنا جو قہر خداوندی اور اس کے غضب کا موجب ہیں اور انسان کے لئے باعث ضلالت وگمراہی ہیں۔ دنیوی زندگی میں انہماک کے بجائے فکر آخرت اور سعادت ابدیہ کے حصول کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا۔ گویا اپنی زندگی کے رُخ کو مادیت وبہیمیت اور شہوات نفسانیہ سے ہٹا کر تقویٰ وطہارت اور روحانیت کی جانب لے آنا۔

سورۂ فاتحہ ام الکتاب ہونے کی حیثیت سے قرآن کریم کے ان مقاصد عظمیٰ کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ جیسا کہ آیات کی تفسیر میں غور کرنے سے ظاہر ہے۔

کتاب الٰہی کا سرنامہ اور عنوان ہی اس کے موضوع اور مقصد کو متعین کر دینے کے لئے کافی ہے ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔

تو کتاب! ہدایت۔ پیغمبر! ہادی۔ تعلیم! اصول ہدایت وتقویٰ۔ مقصد تعلیم انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی اصول ہدایت اور تقویٰ کے ساتھ مطابقت عمل صالح اور تزکیۂ باطن کے ذریعہ نجات اخروی کا حصول یعنی انسان کی وہ زندگی جو ھُدیٰ (احکام خداوندی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت) اور ھویٰ (خواہشات نفسانیہ) کے دوراہے پر متحیر کھڑی ہو اس کو ھویٰ کی ہلاکتوں سے بچا کر ھُدیٰ کی منزل کی طرف لے چلنا۔

انسان کی اصل فطرت میں ان دونوں رخوں کی جانب میلان ممکن تھا اسی لئے خداوند عالم نے تمام اولاد آدم کو بواسطہ آدم علیہ السلام اس پر متنبہ فرما دیا تھا۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

اور صاف اعلان فرما دیا گیا کہ خوف خدا، فکر آخرت اور خواہشات نفس سے پرہیز نجات وکامیابی کا اصل معیار ہے۔ اور آخرت کے بالمقابل دنیوی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں انہماک ہلاکت وبربادی ہے۔

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ

بہرحال جس کسی نے سرکشی اختیار کی اور اس نے ترجیح دی دنیا کو آخرت پر، تو بس جہنم ہی یقیناً اس کا ٹھکانہ ہے اور وہ شخص کہ جو ڈرا اپنے رب کے روبرو حاضر ہونے سے اور روکا اس نے اپنے

نفس کی خواہشات سے تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

خوف خدا اور فکر آخرت قلب و دماغ میں رچانے کے لئے بار بار دلائل قدرت بیان کئے گئے تاکہ انسان مطالعۂ کائنات سے خالق کائنات کی معرفت اور اس کی ربوبیت کو پہچان سکے جس کے بعد اس کے تمام جذبات اور قوائے عملیہ اسی رب العالمین کی طاعت و بندگی کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو جائیں تو جس جس جگہ خلق سمٰوات و ارض و دیگر تکوینی امور کا ذکر ہے اس سے مقصد حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت و بندگی ہے۔ بعض نافہم لوگ ان آیات کو جن میں دلائل قدرت کا بیان ہے پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مقصد قرآن صرف مطالعۂ کائنات ہی ہے۔ اور خود ساختہ مقدمات ترتیب دینے کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہیں "نزول قرآن کا اہم مقصد کائنات فطرت کا مطالعہ کرنا ہے اور ان مادی تکوینی امور سے نفع حاصل کرنا ہی قرآن کا اصل موضوع اور حقیقی منشار خداوندی ہے اور یہی استفادہ حقیقی دین کا ہے جس کو لیکر قرآن نازل ہوا۔ اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں معادن ارضیہ و فائن جبال اور خزائن بحار سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہم دوش نہیں بناتی تو یہ کتاب (خاک بدہن قائل اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) صراحۃً ناقص اور نامکمل اور اس کا دعویٰ الیوم اکملت لکم دینکم بے بنیاد ہے (انتہیٰ ہفواتہ)

ان الفاظ پر خوب غور کر لیجئے اور سمجھ لیجئے کہ مقصد قرآن اور دین و مذہب کی حقیقی روح کو کس طرح مسخ کیا جا رہا ہے قرآن کریم جو سراپا کتاب ہدایت اور روحانی تعلیم اور تزکیۂ باطن کا کامل درس ہے۔ اس کو سراسر مادی تعلیم بنایا جا رہا ہے یہ دعوے قطعاً غلط اور افتراء ہے خدا اور خدا کے کلام پر اس قسم کے اقوال کے قائل ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذباً کے مصداق ہیں۔ ہم پہلے صاف کہہ چکے کہ یہ تمام چیزیں صنعت و حرفت اور سائنسی ترقیات سے تعلق رکھنے والے مادی امور ہیں جیسے قرآن کریم کرتہ اور پاجامہ سینے کے احکام سکھانے کے لئے نہیں نازل کیا۔ اسی طرح اس سے بڑھ کر کسی اور اعلیٰ صنعت و حرفت کے اصول کی تعلیم اس کا مقصد نزول ہرگز نہیں۔ اور نہ ہی کوئی ادنیٰ عقل رکھنے والا اس لغو دعوے کو سننا برداشت کر سکتا ہے۔ بلکہ اس نوع کے افکار و خیالات کتاب اللہ کی کھلی توہین ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام ہے جس نے علوم الٰہیہ اور روحانی امور اصلاح معاشرت، تزکیۂ باطن اور دین و دنیا کے فوز و فلاح کے اصول کی دنیا کو تعلیم دی۔ نزول قرآن کا مقصد اگر ان مادی اور تکوینی امور سے صرف نفع ہی حاصل کرنا ہے اور ان مادی ترقیات کے ذریعہ یہ کتاب ترقی یافتہ اقوام کے ہم دوش بنانے کے لئے نازل کی گئی تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلے گا کہ کتاب الٰہی کے علوم سے سب سے زائد محروم رہنے والے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور آپ کے بعد صحابۂ کرام تابعین اور امت کے تمام ائمہ مجتہدین مفسرین و محدثین اور متکلمین ہی ٹھہریں گے جنھوں نے نہ تو قرآن کے حقیقی منشار کو سمجھا اور نہ اس کے مطابق کوئی مشین بنائی نہ ایک انجن ایجاد کیا

نہ خانی طاقتوں سے کلوں کو حرکت دی۔ نہ ہوائی جہاز بنائے نہ اڑائے۔ نہ ہی سامان آرائش اور تعیش ایجاد کیا اور نہ ہی ایٹمی طاقتوں کے ذریعہ استعماری اغراض سے دنیا کو جور و استبداد کا نشانہ بنا سکے۔ تو کہدینا چاہئے کہ یہی حضرات "العیاذ باللہ" دنیا میں سب سے زیادہ قلیل العلم اور محروم العمل اور علوم قرآن سے نا واقف رہے اور اس دور جدید کے چند کور باطن یورپ کے مقلد قرآن کے ماہر اور عالم ہو گئے۔ جو ان ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلنا معیار ترقی سمجھتے ہیں۔ جنکا معیار زندگی اور مقصد زندگی بے حیائی بے غیرتی شہوت پرستی، سامان تعیش کی فراہمی ہے۔ افسوس صد افسوس کتاب اللہ تو در کنار ادنیٰ غیرت انسانی بھی موجودہ زمانہ کے ترقی یافتہ اقوام کے طرز زندگی کو نہیں برداشت کر سکتی۔ ان ترقی یافتہ اقوام کی مادی اور دنیوی ترقی خواہ کتنی ہی بلند ہو اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی ہو قرآن نے ان کی پیروی تو در کنار ان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع فرمادیا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ (طٰہٰ)

مت متوجہ کیجئے اپنی نگاہوں کو ان انواع و اقسام کے سامان کی طرف جس سے متمتع کیا ہم نے دنیا کی زینت و رونق میں سے ان کو تاکہ ان کو آزمائیں۔

اور مادی ترقیات کے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچی ہوئی اقوام کے لئے قرآن کریم نے اپنے نظریہ اور فیصلہ کی وضاحت کر دی

یعلمون ظاهرًا من الحیوة الدنیا وهم عن الأخرة هم غافلون۔

کہ جانتے ہیں یہ لوگ حیوۃ دنیا کے صرف ظاہری کو اور یہی لوگ ہیں وہ کہ جو آخرت سے غافل رہنے والے ہیں۔

تو معلوم ہو گیا کہ ہر وہ علم و کمال خواہ وہ اہل دنیا کی نظروں میں کتنا ہی بلند ہو غفلت عن الآخرۃ کے ہوتے ہوئے بیکار اور لغو ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا کہ جو لوگ دنیوی ساز و سامان زیب و زینت اور اسباب عیش و عشرت سے آراستہ اور تمام مادی طاقتوں کے مالک تھے کائنات کی منفعتیں حاصل کرتے تھے۔ ان میں خوب تصرف کرنا جانتے تھے لیکن ان کا رابطہ حیات اور رشتۂ زندگی جب خالق کائنات سے ٹوٹا رہا تو حق تعالیٰ کی نظروں میں مقہور و مغضوب ہوئے اور ان کی تمام مادی طاقتوں کو قہر خداوندی نے مچھر کے پر کی طرح مسل کر رکھدیا۔ اور ان طاقتور اور ترقی یافتہ قوموں کا وارث اور ان کے ملک و دولت کا مالک ان ہی ضعفا اور کمزوروں کو بنایا جو مادی وسائل سے خالی ہاتھ تھے۔ خدا نے انھیں ہی عزت و غلبہ عطا فرمایا۔

كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ۔

کس قدر باغات چشمے کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مقامات اور نعمت جس میں وہ لوگ مزے اڑا رہے تھے چھوڑ گئے۔ بس اسی طرح ہم نے اس زمین کا وارث بنایا ایک دوسری قوم کو تو اس (ہلاک ہونے والی قوم) پر نہ رویا آسمان اور نہ زمین اور نہ ہی ان کو کسی قسم کی مہلت دی گئی۔

کہیں ان مادی شوکت وقوت کے نظر فریب سامانوں پر بمقابلہ طاقت اخلاق وروحانیت بھروسہ کر بیٹھنے کو انتہائی ضعف اور انجام کی ہلاکت فرمایا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا

کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر ڈالا جو سازوسامان اور حسنِ ظاہری بہت رکھتے تھے۔

نہایت ہی عبرتناک انداز کے ساتھ قارون کا ذکر فرما کر مادی اسباب کی ناپائیداری اور اس کے جال میں پھنسکر اپنے خالق کو بھول جانے کا انجام بیان فرمایا۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتيناه من الكنوز ما ان مفاتحه لتنوء بالعصبة اولى القوة اذ قال له قومه لا تفرح ان الله لا يحب الفرحين وابتغ فيما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا واحسن كما احسن الله اليك ولا تبغ الفساد في الارض ان الله لا يحب المفسدين - قال انما اوتيته على علم عندي اولم يعلم ان الله قد اهلك من قبله من القرون من هو اشد منه قوة واكثر جمعا ولا يسئل عن ذنوبهم المجرمون -

بیشک قارون تھا حضرت موسیٰ کی قوم میں سے جس نے بغاوت وسرکشی اختیار کی ان کے مقابلہ میں۔ اور دیئے تھے ہم نے اس کو اس قدر خزانے کہ ان کی کنجیاں (ہی) گرانبار کر دیتی تھیں بہت سے طاقتور لوگوں کو تو دیا د کرلے مخاطب اس وقت کو) جبکہ کہا اس سے اس کی قوم نے کہ تو اس مال ودولت پر مت اترا بیشک اللہ تعالے اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور یہ بھی کہا کہ تلاش کر تو اس (مال نعمت اور زندگانی) میں دار آخرت کو اور مت فراموش کر تو اپنا حصہ دنیا میں سے (کہ درحقیقت دنیا میں تجھے کیا کرنا اور اس پر تیرا حق کتنا ہے) اور احسان کر تو جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا اور زمین پر فساد کا خواہاں مت بن یقیناً اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ قارون یہ سب کچھ سن کر کہنے لگا مجھ کو یہ تمام ملا ہے اپنے اس ہنر وکمال کی وجہ سے جو مرے پاس ہے (حق تعالیٰ فرماتا ہے افسوس!) کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر ڈالا جبکہ وہ اپنے مادی اسباب عیش وعشرت میں پڑ کر خدا سے بے تعلق ہوگئے) جو اس سے بھی زیادہ بڑھے ہوئے تھے قوت میں اور مال ودولت کی کثرت میں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پوچھا نہیں جاتا ہے مجرموں سے ان کے جرائم کے بارہ میں (کہ تم نے یہ جرمیں کی ہیں یا نہیں۔ جو کچھ مجرمین کرتے ہیں خدا اس کو جانتا ہے۔)

فخرج على قومه في زينته - قال الذين يريدون الحيوة الدنيا يا ليت لنا مثل ما اوتي قارون انه لذو حظ عظيم -

(غرض) پھر وہ ایک بار نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی زیب وزینت کے ساتھ جو لوگ اس کی برادری میں حیات دنیوی کے طالب تھے وہ کہنے لگے کاش ہم کو ایسی ہی چیزیں دی جاتیں جیسی کہ قارون کو دی گئیں بیشک وہ بڑے ہی اچھے نصیبہ والا ہے

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن وعمل صالحاً ولا یلقاھا الا الصابرون فخسفنا بہ وبدارہ الارض فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین (القصص)

اور اس کے بالمقابل، وہ لوگ جن کو علم دیا گیا تھا کہنے لگے افسوس اور ہلاکت تم پر! (تم کیا دنیا پر للچا رہے ہو تمہیں خبر نہیں) اللہ کے یہاں کا ثواب (ہزار درجہ) بہتر ہے (بہ نسبت اس مادی ساز و سامان کی کثرت کے) ہر اس شخص کے لئے جو ایمان لایا اور نیک عمل کئے اور وہ ثواب انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں

پھر ہم نے اس قارون کو دھنسا دیا اس کے محل سمیت۔ سو نہ ہوئی کوئی جماعت ایسی کہ جو مدد کرتی اس کی اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے اور نہ ہی خود وہ اپنے کو بچا سکا۔

ظاہر ہو گیا کہ مادی شوکت و طاقت اور تکوینی امور سے نفع حاصل کرنا قرآن کا مقصد تو کیا ہوتا قرآن تو ان چیزوں میں انہماک ان کی محبت اور ان کی حرص کو منع کرتا ہے۔ تو ان امور کو مقصد قرآن کہنا قرآن کریم کا مذاق بنانا ہے۔ اگر بالفرض یہی معدنی اور مادی ترقیات مقصد نزول کتاب اللہ اور بعثت نبوی کا ہوتا تو تیئیس برس تک کیا ضرورت تھی سلسلہ وحی کے جاری رکھنے کی کہ طرح طرح کے مصائب کے دور سے گذرنے آنحضرت اور صحابہ ناقابل تصور تکالیف اور مصائب کا کفار کی طرف سے نشانہ بنے رہے کیا بس اتنی سی ہی بات تھی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس تمام نظام ہدایت کو قائم و جاری فرمایا اور آخر میں یہ اعلان سنا دیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ اگر معادن ارضیہ اور دفائن جبال اور خزائن بحار سے مستفید ہونے کا نام اتمام نعمت اور تکمیل دین ہے تو قرآن کا یہ اعلان العیاذ باللہ غلط ہوا۔ چونکہ آنحضرت نے صحابہ کو انجن اور مشین تیار کرنے اور معادنِ ارضیہ اور خزائن جبال سے مستفید ہونے کے طریقوں کی تعلیم کے بعد یہ اعلان نہیں فرمایا اور نہ ایسا کوئی مضمون کسی تاریخ سے کوئی سفیہ العقل تلاش کرنے کی فکر کرے گا کہ آنحضرت نے کوئی فیکٹری جہاز سازی کی کھولی اس میں ابو بکر اور عمر داخل ہوئے انھوں نے خوب جہاز بنا لئے حضرت عثمان بھی خوب راکٹ اڑانے لگے۔ حضرت علی نے بڑی ایٹمی چیزیں تیار کیں سعد بن ابی وقاص سعید عبدالرحمن بن عوف۔ ابو الدرداء ابی بن کعب معاذ بن جبل اور ابوذر رضی اللہ عنہم جب خوب ان سائنسی ترقیات میں مہارت حاصل کر چکے۔ اور ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلنے لگے تو اس پر آپ نے ان کو جنتی اور باکمال ہونے کی بشارت سنا کر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کے درمیان یہ اعلان کر دیا ہو کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ یہ حضرات تو ان ترقی یافتہ اقوام کے قریب سے گذرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ان کی زیب و زینت اور شان و شوکت کے سامنے اپنی پھٹی پرانی گدڑیوں اپنی پیوند لگی ہوئی چادروں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے ٹکی ہوئی ازاروں کو ہیروں اور جواہرات سے مرصع ان قالینوں کو دیکھ جن کو روم و ایران کے لوگ اپنے جوتوں سے روندتے تھے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔ اور دنیا کی زیب و زینت سے نفرت کرنے والی ان پاکباز ہستیوں کی زبان سے یہ کلمات نکلتے نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام کہ ہم وہ قوم ہیں جن کو اسلام اور اسلام کے شعائر سے عزت ملی ہے یہ وہ عزت ہے

جس کے سامنے دنیا کے قیمتی سے قیمتی ہیروں اور جواہرات کی کوئی وقعت نہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہی عزت عطا فرمانے کے لئے مبعوث ہوئے اور قرآن اسی عزت کو لیکر دنیا والوں پر اترا۔

مادی طاقتوں کو روحانی قوتوں کے مقابلہ میں فوقیت دینا فرعونی نظریہ ہے کیونکہ فرعون نے اپنے ساز و سامان اور شان و شوکت کو پیغمبر خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خستہ حالی کے بالمقابل نمایاں کر کے یہی کہا تھا ونادیٰ فرعون فی قومہ قال یاقوم الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین (کہ اس ساز و سامان کے ہوتے ہوئے میں بہتر ہوں یا یہ خستہ حال کمبلی اوڑھے ہوئے موسیٰ علیہ السلام)

اہل ایمان ایسے گمراہ کن (زخرف) لوگوں سے پوچھیں کہ بتاؤ تو سہی کہ عملی طور پر اور تعلیم و تربیت کے درجہ میں آخر آنحضرت نے کس چیز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر یہ اعلان فرمایا۔ اس مقصد میں ایران و روم تو کچھ کم نہ تھے اہل عرب کو کہدیا جاتا کہ تم قیصر و کسریٰ کی نقالی کر لو۔ جو چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن نے سکھائی وہ ایمان و تقویٰ خالق کائنات کی معرفت اور اس کی ربوبیت اور شان رحم و کرم اور قہر و عذاب کو پہچان کر اس کی اطاعت و بندگی۔ خوف آخرت احوال جنت و جہنم جزاء و سزا، عمل[1] صالح سعادت و شقاوت کے اصول۔ اصلاح اخلاق و معاشرہ معاملات کی درستگی، عدل و انصاف خدمت خلق، صبر و شکر، قناعت، تزکیہ باطن تھا یعنی عمل اور اخلاق کو ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنا، بے حیائی شہوت پرستی خیانت ظلم زنا چوری شراب، حب دنیا اور حرص و بخل و حسد جیسے ناپاک اور مہلک امراض سے اپنے کو بچانا تو دنیا خوب جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ان امور کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے اور اہل عرب کو ہر عیب سے پاک اور کمالات سے مزین اور آراستہ کر چکے تو اس پر یہ اعلان خداوندی زبان نبوت سے جاری کیا گیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔[2]

---

[1] عمل صالح کا مفہوم صرف چند اخلاقی اور بعض لفظی اور ظاہری تصنع کے طور و طریق اختیار کر لینا نہیں ہے جن کے اختیار کرنے سے مقصد بالعموم اپنی ذاتی وجاہت کا حاصل کرنا ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسے طور و طریق اختیار کرنے سے لوگ ہماری عزت اور تعریف کریں گے اور اگر ان طریقوں کو اختیار نہ کیا گیا تو اونچی سوسائٹیوں میں انھیں کوئی مقام نہ مل سکے گا۔ یا ایسی چند چیزیں چھوڑ دیں کہ جن کے کرنے سے بدنامی اور ذلت کا ڈر لگتا ہے کہ لوگ کہیں عیاش یا ایسا ہی کچھ اور نہ کہنے لگیں تو شریعت کے نزدیک ایسی کوئی چیز عملی زندگی میں نہ عمل صالح کہلاتی ہے اور نہ اس نظریہ سے کسی چیز سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ بلکہ عمل صالح کی وسعت زندگی کے ان تمام ظاہری اور باطنی شعبوں کو حاوی ہے جن کی طرف اشارہ کیا گیا ۱۲ واللہ اعلم

[2] غرض یہ ہے کہ یہ امور مقصد قرآن نہیں ہیں۔ جیسے کہ ہم پہلے لکھ چکے کہ قرآن کا موضوع علوم الٰہیہ ہیں اور یہ سائنسی ترقیات انسانی علوم سے تعلق رکھتے ہیں جس طور پر چاہے کوئی قوم ان چیزوں کو بنائے اس میں ترقی کرے۔ قرآن سائنس اور فلسفہ کے میدان کو تنگ نہیں کرتا بلکہ روحانی علوم اور باطنی ترقیات اور سعادت اخرویہ کے اسباب کو پس پشت ڈالکر مادی ترقیات کو مقصد زندگی بنا لینا اس کو منع کرتا ہے۔

قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن میں کائنات کی مصنوعات یا عجائب تخلیق ملکوت سموات وارض کی عظیم نشانیاں اوران میں گوناگوں پیداوار عناصر و موالید اور ثوابت وسیارات وغیرہ کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ فن سائنس سکھانے کے واسطے نہیں نازل کی گئیں۔ غرض مصنوعات عالم میں مادی تصرف اوران سے نفع اٹھانے کو عملی قرآن سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔ بلکہ صنائع الہٰی میں نظر و فکر کی دعوت دے کر خالق کائنات کی معرفت کا سراغ لگانے کیلئے تاکہ اس معرفت اور ایمان ویقین کی پختگی سے قوت عملیہ مضبوط ہوسکے اور حق تعالےٰ کے اوامر و نواہی کی تعمیل کے لئے ہمہ تن شوق اور مستعد بن کر میدان عمل میں آجائے اور اس طرح سے انسانی قوت نظریہ معرفت و اعتقاد اور یقین کے مرتبہ سے آگے بڑھ کر ہیئت عملیہ اختیار کرلے۔ خوف آخرت احوال جنت وجہنم جزا وسزا اہل طاعت اور نافرمانوں کے نتائج وعواقب کو پیش نظر رکھتے ہوئے تکمیل روحانیت سعادت اور نجات اخروی کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔ ان مصنوعات کو دیکھ کر ہر عقل و فکر والا انسان یہ بات بخوبی جان لے کہ یہ مصنوعات وہی بنا سکتا ہے جس کی قدرت لامحدود ہے ایسے قادر مطلق اور باکمال معبود کی اطاعت و بندگی کے حقوق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا جائے۔ اس کی نافرمانی کے تصور سے کانپنا چاہئے اس کے قہر و عذاب سے ڈرنا چاہئے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ سعادت کے وہ عمل اختیار کئے جائیں جس سے خالق کائنات اوران غیر محدود طاقتوں کا مالک خوش ہو اور انعامات سے سرفراز فرمائے۔ تو انسان کا اپنی عملی زندگی ان آیات و دلائل کے نظریاتی مقصد کے مطابق بنالینا عملی قرآن ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمانے لگیں کہ کان خُلُقُہٗ القران یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ عملی قرآن ہے۔ تو عملی قرآن سائنسی مصنوعات اوران سے استفادہ نہیں بلکہ عملی قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے وہ پاکیزہ نقوش ہیں جو انسان کو ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ مصنوعات عالم عجائب تخلیق عناصر عالم ثوابت وسیارات اور اسی طرح دوسری نشانیوں پر مشتمل آیات کو جہاں بھی کہیں قرآن میں دیکھیں یہی نظر آئے گا کہ خالق کائنات کی اطاعت مبداء و معاد کا یقین تقویٰ عمل صالح خوف آخرت اخروی سعادت کے لئے جدوجہد اور نافرمانی پر دھمکی مقصد بیان ہے۔

مثلاً حٰمٓ السجدہ کے دوسرے رکوع کو دیکھئے جس میں خلق سموات وارض کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس سے ذرا قبل ابتداء سورت سے دیکھ لیجئے کہ مضمون کیا شروع کیا گیا ہے۔

مضمون کا آغاز اس طرح ہے کہ کتاب الہٰی قرآن کریم رحمٰن و رحیم کی طرف سے پیغام ہدایت ہے جو دنیا والوں کو طاعت

ے مناسب ہوگا کہ اس مقام پر قارئین کرام سورۃ حٰمٓ السجدہ کی تمام آیات اول تا آخر ترجمہ و تفسیر کے ساتھ ملاحظہ فرمائے جائیں تاکہ اس سلسلہ میں جو ربط مضامین کی طرف اشارات کئے گئے ان کی پوری توضیح ہو جائے۔

خداوندی اصلاح عمل کی دعوت دیتے ہوئے ان میں سے اہل ایمان کو بشارت انعامات اخروی کی سنانے والا اور نافرمانوں بدعملوں شہوات نفس میں مبتلا ہو کر اپنے رب کے بھلانے والوں کو عذاب خداوندی سے ڈرانے والا ہے آغاز مضمون میں اس امر کو ظاہر کرتے ہوئے فوراً ہی پیغام ہدایت سے اعراض و بے رخی کرنے والوں کا ذکر شروع کر دیا گیا کہ صرف یہی نہیں کہ اس سماوی ہدایت کی طرف سے بے توجہی اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں ۔ بلکہ روحانی ہدایات کے مقابلہ میں وہ یہ صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ

وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ	ہمارے دل اس بات کی طرف سے جس کی جانب اے پیغمبر آپ
وفی اذاننا وقر ومن بیننا وبینک حجاب	دعوت دیتے ہیں پردوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اور ہمارے کانوں
	میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب و کاوٹ ہے ۔

اس لئے آپ اپنے کام میں لگے رہیے ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں (معلوم ہو گیا کہ تاریخ قدیم سے ہی اہل باطل روحانی ہدایات کو ٹھکرا کر اپنا مبلغ علم اور محور جد وجہد مادیات کو بنا چکے اور انھوں نے پیغمبر خدا کے سامنے اپنے نظریات اور طریق عمل کی وضاحت کر دی تھی)

حق تعالے نے اس کو ذکر کرتے ہوئے اپنے پیغمبر کو یہ فرما دیا کہ آپ تو بہر حال صراط مستقیم کی طرف دعوت دیدیجئے ، اور یہ کہ اللہ ہی کے مقرر کردہ طریقوں پر انسانوں کو زندگی گذارنا موجب فلاح ہے مشرکین ونافرمانوں کے لئے ہلاکت و بربادی ہے ۔ ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ دائمی رحمتیں اور کبھی نہ ختم ہونے والا اجر و ثواب ہے ۔

ان الذین امنوا وعملوا الصالحات لھم اجر غیر ممنون جس ذات خداوندی کی اطاعت پر اجر و ثواب بیان کیا جا رہا ہے اس سے متصل اس معبود حقیقی کی عظمت و کبریائی اور دلائل توحید اور قدرت کی نشانیاں بیان کرنے کے واسطے سلسلۂ دلائل یوں شروع کر دیا گیا ۔

قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین	(اے نبی کریم) کہہ دیجئے آپ (ان لوگوں سے) کیا تم انکار کرتے ہو
وتجعلون لہ انداداً ذلک رب العالمین وجعل	اس (خدا کی توحید والوہیت اور طاعت وبندگی) کا جس نے
فیہا رواسی من فوقہا وبارک فیہا وقدر فیہا	زمین کو (باوجود اس کی اس قدر وسعت کے) دو دن میں پیدا
اقواتہا فی اربعۃ ایام سواءً للسائلین ثم	کر دیا اور (تعجب ہے کہ) پھر بھی تم اس کے لئے شریک ٹھیراتے
استوی الی السماء وھی دخان فقال لہا و	ہو یہی (خدا جس کی یہ قدرت معلوم ہو چکی) تو سارے جہانوں کا
للارض ائتیا طوعاً او کرھاً قالتا اتینا طائعین	رب ہے اور رب نے اس زمین پر قائم کئے پہاڑ اس کے اوپر سے

اور اس میں بڑی فائدے کی چیزیں رکھیں اور اسی زمین میں (اس کے رہنے والوں کے لئے) غذائیں تجویز (و پیدا) کر دیں (جو سب کچھ)

چار دن میں (ہوا) پورے ہیں (کیت وکیفیت خلق کی) پوچھنے
والوں کے لئے پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جس وقت کہ وہ دھواں سا تھا تو آسمان اور زمین دونوں کو حکم فرمایا کہ تم دونوں آجاؤ ہمارے
حکم کی طرف یعنی ہر حکم کی تعمیل تمہیں کرنی پڑے گی جیسا میں تصرف چاہوں گا وہی ہوگا خوشی سے یا زبردستی۔ تو دونوں نے عرض کیا ہم
حاضر و تیار ہیں تیری اطاعت کے لئے خوشی کے ساتھ۔ سو دو روز میں اللہ نے اس کے سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے
مناسب حکم بھیجدیا اور مزین کیا ہم نے قریب والے آسمان کو ستاروں سے اور اس کی حفاظت کی یہی تجویز و تقدیر ہے زبردست
طاقت والے واقف الکل کی (جو ہر چیز کا کامل علم رکھنے والا ہے)

خلق سموات وارض اور عجائب تخلیق کے یہ نمونے بطور شواہد و دلائل مخاطبین کو سنا کر ان آیات و دلائل کے اصل مقصد
کی طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ ایمان و تقویٰ اور اطاعت خداوندی ہے۔ اگر کوئی بے عقل قوم قدرت کی ان تمام نشانیوں کو دیکھ کر
بھی خالق کائنات کی طرف رجوع نہیں کرتی تو ایسے نافرمانوں کے حق میں آیات وعید کا ذکر شروع فرمادیا گیا فَإِنْ أَعْرَضُوا الخ
کہ اگر اب بھی وہ اعراض و روگردانی کرتے رہیں گے تو میری جانب سے ان کو اسی قہر و عذاب کی دھمکی ہے جس قہر و عذاب نے
عاد و ثمود جیسی طاقتور قوموں کو ہلاک و تباہ کر ڈالا جن کی سائنسی ترقیات صنعت و حرفت اور تعمیر میں بے مثال فنکاریوں کی کوئی
انتہا نہ تھی سر بفلک عمارتیں اور قوم ثمود کی پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں منزل در منزل تعمیریں ایسی تھیں کہ آج کے
دور ترقی میں انجینیری کا فن اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری ترقیات عذاب خداوندی سے ان کو نہ بچا سکیں
حق تعالیٰ شانہ نے اس وعید و دھمکی کو تاریخی حقائق اور دلائل سے موید کر کے۔ ان کے عبرتناک عواقب و نتائج کو ظاہر فرماتے
ہوئے نافرمانوں کو عذاب آخرت سے ڈرایا کہ سوچنا چاہئے ایسی زبردست قدرت والے رب العالمین (جس کے ایک حکم اور
اشارہ میں پہاڑ سے تراشے ہوئے محفوظ قلعے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اور ایک ہوا کے جھونکے سے پوری کی پوری قوم زمین سے
اکھاڑ کر پھینکے ہوئے درختوں کے مانند ہو جائے) کی نافرمانی کا انجام آخرت میں کیا ہوگا۔ چنانچہ اب اس کے ساتھ ویوم
یحشر اعداء اللہ الی النار فھم یوزعون سے مسلسل دور کوع تک احوال آخرت اور مجرمین کے دردناک
عذاب کی کیفیات اور محشر میں ان کی ذلت و رسوائی کے مناظر بیان کئے جاتے رہے۔

غرض ایک طویل سلسلہ میں نافرمانوں کے لئے دنیا اور آخرت کی تباہی اور ہلاکت اور ہولناک نتائج کے درمیان خداوند
عالم نے اہل ایمان اور مطیعین کے حق میں اپنے انعام و کرم کی ایک جھلک دکھا دینے کے لئے یوں سلسلۂ کلام شروع فرمادیا و من
احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین۔

دعوت الی اللہ کے محاسن انسان کی عملی زندگی میں نیکی اور بدی کا برابر نہ ہونا بیان کرتے ہوئے دواعی عمل اور
جذبات اطاعت کو ابھارنے کیلئے اور زندگی کا رخ خالق کائنات کی طرف پھیر دینے کے لئے اس مقام پر دوبارہ دلائل
قدرت کا ذکر شروع فرمادیا۔

ومن آیاتہ اللیل والنہار والشمس والقمر لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقہن ان کنتم ایاہ تعبدون. یعنی کیا ان تمام حقائق کونیہ اور دلائل قدرت کے مشاہدہ کے باوجود بھی غافلوں کی آنکھوں سے غفلت کے پردے نہیں ہٹتے۔ کائنات کی ان تمام نشانیوں اور قدرت کے یہ عظیم مناظر (جن میں خالق کائنات کی قدرت وطاقت سورج کی روشنی سے زیادہ عیاں اور ظاہر ہے) دیکھ کر بھی کونسا بدبخت انسان ہوگا کہ پھر بھی خالق کائنات کو نہ پہچانے اس کا مبلغ علم یہی مادی چیزیں رہیں اور وہ پہاڑوں کی گھاٹیوں اور سمندروں کے گرداب ہی میں پھنسا رہے۔ ان نشانیوں کو دیکھنے کے بعد تو ہر انسان کو واسجدوا للہ الذی خلقہن کی سراپا تعمیل وتصویر بن جانا چاہئے۔

اگر اہل شقاوت کی بدبختی اس درجہ غالب آچکی ہے کہ اس نے تمام فطری صلاحیتوں اور قبول حق کی استعداد کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ وہ ان آیات کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کو سمجھیں ان کے مقتضیٰ پر عمل کریں اس کے برعکس وہ آیات اللہ اور دلائل قدرت میں ٹیڑھی راہ نکالنا شروع کر دیتے ہیں اور الحاد و تحریف کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ایک عالم کو گمراہ کرنے کی سعی کرنے لگتے ہیں تو ایسے ملحدین اور محرفین کتاب اللہ جو کلام الٰہی کے معانی اور اس کے مقاصد میں تحریف کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان کو تہدید فرمائی گئی۔ اور دھمکی دی گئی کہ

ان الذین یلحدون فی آیاتنا لا یخفون علینا الخ کہ ایسے ملحد ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں خدا خوب دیکھ رہا ہے کہ یہ بدبخت اور مادیت میں غرق انسان ان تمام آیات کو جن میں رب العالمین نے اپنی طاعت وبندگی سعادت دارین اصلاح معاش ومعاد، تکمیل روحانیت اور تزکیۂ باطن کی تعلیم دی انہی کو مادی منفعتیں اور نفسانی اغراض وخواہشات کے حصول کا ذریعہ بلکہ مراد کلام اللہ اور اس کے نزول کا حقیقی منشاء اور مقصد قرار دے رہا ہے۔ اور اس طرح رب العالمین کی بغاوت کے لئے کمربستہ ہیں۔

ان مضامین کو نہایت جامعیت اور دلائل کی قوت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے آگے چل کر قرآن نے عمل کی تقسیم اور صاحب عمل کے لئے اس کے عمل مطابق انجام کا مرتب ہونا بیان کیا۔ اور یہ کہ اعمال کے حقیقی اور ابدی ثمرات ونتائج قیامت کے روز اہل عمل کو دیئے جائیں گے تو اس کے لئے الیہ یرد علم الساعۃ کے عنوان سے قیامت کا ذکر شروع کر دیا گیا۔ اس ضمن میں سعادت اخروی کے حصول میں انسان کی جو فطری کمزوری حائل ومانع بنتی ہے اس کو بھی ظاہر فرمایا

واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبہ الخ کہ انسان اللہ کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے وقت تو اپنے منعم حقیقی کی حق شناسی شکر گذاری اور اطاعت سے اعراض وروگردانی کرتا ہے اور بالکل ہی بے پروا ہو کر دوسرے اپنی کروٹ بدل لیتا ہے اور جب کبھی بھی کوئی تکلیف ومصیبت پیش آتی ہے پھر اسی رب کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر لمبی لمبی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ غرض انسان کی اس طبعی کمزوری اور قصور کو کہ "نہ سختی میں صبر ہے نہ نرمی میں شکر" بیان کرتے ہوئے پھر انسانی افکار کو دلائل قدرت کی طرف متوجہ ہونے کے لئے دعوت دی اور چونکا یا گیا کہ آخر انسان ان تمام

نشانیوں کا ہر آن اور لمحہ مشاہدہ کرتے رہنے کے باوجود بھی کیوں نہیں اپنے رب کی طاعت و بندگی میں مصروف ہوتا۔
سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ اور اس عنوان سے پھر جذبات قلب کو ایمان و تقوی اور خوف آخرت کے لئے ابھارا گیا۔ اور اصل مقصود نجات اخروی کے حصول کے لئے عملی جدوجہد کی تلقین فرمائی
اخیر میں ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں سے خوف آخرت مٹ چکا وہ اپنے اعتقاد و عمل اور طرز زندگی سے یہی ظاہر کر رہے ہیں کہ نہ قیامت ہے اور نہ قیامت کے لئے کسی تیاری کی ضرورت ہے۔ تازیانۂ عبرت کے طور پر فرما دیا گیا کہ

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ۔ خبردار یاد رکھو وہ لوگ تو اپنے رب کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں آگاہ ہو جاؤ کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم کے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ایک ہی مقام کے مبدأ و منتہی کو اور بیان کردہ مضامین کے ربط کو نہایت عجیب اور پاکیزہ انداز میں گویا ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں اور کیسے مؤثر اور بلیغ انداز بیان ٹھوس دلائل اور ناقابل تردد حقائق کے ساتھ مضامین قرآن اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ قرآن کریم میں جس کسی جگہ پر بھی دلائل قدرت کا بیان ہے وہاں آپ اسی طرز پر مضامین قرآن کو مشتمل پائیں گے پورے قرآن میں کوئی ایسا مقام نہیں ملے گا جہاں کائنات عالم اور عجائب تخلیق کے ذکر سے پہلے یا اس کے بعد طاعت خداوندی کا حکم اس کی نافرمانی پر وعید جزا و سزا اور احوال قیامت سے متعلق مضامین نہ بیان کئے گئے ہوں۔ سورہ بقرہ میں

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون لمن چند کلمات میں انسان کی اصل حقیقت اس کے مبدأ و معاد حشر و نشر کو بیان کرتے ہوئے فوراً فرمایا گیا۔ ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسوّاھن سبع سموات وھو بکل شیٔ علیم ان دلائل کونیہ کے اجمالی اس بیان پر مسئلہ استخلاف آدم علیہ السلام شروع کر دیا گیا جس سے مخاطب بخوبی یہ بات جان لے کہ مقصد تخلیق کائنات یہ ہے جس کے لئے آدم کو خلافت الہیہ دی گئی۔ یہی قرآن کا مقصد وحید ہے کہ انسانوں کو ہدایات الہیہ کے ذریعہ حد کمال تک پہنچایا جائے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر کفار کے نتائج ہلاکت ان کے عذاب ابدی اور خدا کی لعنت کے مستحق ہونے کو بیان کرتے ہوئے توحید خداوندی کا اعلان کیا گیا۔ الٰھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم الوہیت و توحید کے اس اعلان کو مدلل کرنے کے لئے خلق سموات و ارض کا ذکر شروع ہو گیا۔ ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء

والارض لآیات لقوم یعقلون (بقرہ پ۲) پھر اس کے بعد ومن الناس من یتخذ سے خدا تعالیٰ سے بے تعلق رہنے والوں کا حسرت ناک انجام ظاہر فرما دیا گیا کہ اب انسان خود سوچ لے میں اپنے لئے کیا چیز اختیار کر رہا ہوں۔

سورۂ آل عمران کے خاتمہ پر بھی نافرمانوں پر وعید کے ساتھ خلق السماوات والارض کا ذکر کیا گیا مصنوعات عالم اور اختلاف لیل ونہار سے فائدہ اٹھانے والے عقلمندوں کا بیان فرمایا کہ کون لوگ دانشمند ہیں اور کائنات عالم میں غور وفکر کا مقصد کیا ہے اس کے لئے فرما دیا الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار۔

جس کے ضمن میں اہل اللہ کے پاکیزہ اوصاف وخصلتیں ان کی کیفیات باطنی ایمان کی پختگی خوف خدا اور آخرت کی تیاری اور ہر آن ولمحہ ان کی زندگی کا رخ رب العالمین کی متوجہ رہنا۔ بیان کرتے ہوئے مادہ پرستوں کا مادی دنیا میں انہماک اسی کے لئے عملی جدوجہد اور اسی کی ترقی کے لئے اقطار عالم میں گشت اور سفر اور مادیات سے انتفاع واستفادہ جن لوگوں کا مقصود زندگی بنا ہوا ہے ان کی فریب کارانہ زندگی سے بچنے کی تاکید فرما دی لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔

سورۂ سبا میں قوم سبا کی دنیوی زندگی کے تمام اسباب عیش وعشرت کا منظر قرآن کریم میں اس طرح بیان کرتے ہوئے کہ ان کے چلنے کے راستوں پر دو طرفہ باغوں کی شادابی اس قوم کے لئے ہر طرح کے دنیوی عیش وراحت کی تکمیل کا سبب بنی ہوئی تھی۔ رزق کی فراوانی اور کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہدیا گیا تھا۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ لیکن متاع دنیا کے دھوکہ میں پڑ کر خدا سے غافل ہو گئے نافرمانی اور خالق کائنات سے غفلت کا یہ انجام ہوا کہ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ عه کہ ہلاکت کے بعد وہ صرف افسانہ اور حکایات ہی رہ گئے اور انکو پارہ پارہ کر دیا

سورۂ زخرف پ۲۵ میں حق تعالیٰ نے خلق سموات وارض اور دنیا کی تمام مادی منفعتوں کا ذکر فرمایا اور فلک وانعام (جہاز وکشتیوں اور سواریوں)، جیسے ساز وسامان سے انسان کو نفع حاصل کرتے ہوئے اس کے معاد اور آخرت میں خدا کے روبرو حاضر ہونے کا سبق ویاد دلایا گیا۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔

غرض سارے قرآن میں دلائل قدرت اور عجائب تخلیق اسی طرز پر دائر ہیں اور اسی مقصد حقیقی پیغام عبدیت

عه اس مقام پر كُلُّ نَفْسٍ ذَآىٕقَةُ الْمَوْتِ آیۃ سے ختم سورت تک آیات ترجمہ وتفسیر کے ساتھ ملاحظ فرمائیں اہل ایمان کے لئے ان پاکیزہ کلمات میں سبحان اللہ ایمان کی کس قدر حلاوت اور طاعت خداوندی کا جذبہ موجود ہے۔

عه سورۂ سبا پ۲۲ میں ان آیات کو ملاحظہ فرمائیں۔

اور فکر آخرت ان تمام آیات کا حقیقی منشا یہی ان کا مبدأ و منتہیٰ ہے۔

اہل باطل نے دھوکہ کا ایک مزین و منقش پردہ حق پر ڈال رکھا ہے۔ امید ہے کہ یہ دو چار مثالیں ان کے دام تزویر کو تار تار کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ دل تو چاہتا تھا کہ اس مقصد کی توضیح و تفہیم کے لئے کچھ اور شواہد اور مثالیں پیش کرتا لیکن اندیشۂ تطویل مانع رہا۔ یہ چند حرف مجھ ناچیز کی طرف سے بضاعتٌ مُزجاۃٌ کے درجہ میں تصور فرماتے ہوئے قارئین کرام قبول فرمائیں۔ ان حضرات سے دریافت کیجئے کہ کیا ان مضامین کے ذیل میں آپ کو کسی جگہ حق تعالیٰ کی بندگی فکر آخرت جزاء و سزاء اور احوال جنت و جہنم یا سعادت و شقاوت اخروی کا کوئی مضمون نہیں نظر آتا۔ قرآن نے ایک سو سترہ مقام پر اصالۃً و مقصوداً قیامت احوال آخرت جزاء و سزاء اور جنت و جہنم کی کیفیات بیان کی ہیں۔ ان میں سے اکثر مقام پر دس دس بیس بیس آیات اور بعض مقام دو دو چار چار رکوع مسلسل اسی موضوع پر چل رہے ہیں۔ کیا ان سیکڑوں آیات سے قرآن کریم کے اس مقصد کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ سات سو آیات میں قرآن نے اقامت صلوٰۃ کا امر فرمایا ہے ان محرفین کتاب اللہ سے پوچھئے کہ کیا اقامت صلوٰۃ نزول قرآن اور بعثت نبوی کا مقصد نہیں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ بعض زائغین یہ کہہ بیٹھیں؎ کہ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع اور استفادہ ہی تو حقیقی دین ہے جس کو لیکر قرآن نازل ہوا۔ تو جب استفادہ نہ ہو تو پھر اقامت صلوٰۃ کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ اقامت صلوٰۃ دین کا مقصود اصلی ہے (العیاذ باللہ) کیا انھیں معلوم نہیں کہ جس مادی انہماک اور اسی انتفاع و استفادہ اور اسی کی ترقی کو حقیقی دین نزول قرآن اور خدا اور عالم کا حقیقی منشاء و مقصد بتایا جا رہا ہے اسی خدا کے کلام میں سیکڑوں جگہ حب دنیا اس میں انہماک اور اسی میں اپنی زندگی ختم کر دینے کی مذمت اور ممانعت نہیں ہے؟ کیا اس قرآن نے دنیا کی زیب و زینت کو ناپائیدار نہیں فرمایا اس کی حرص و طمع میں پڑنے سے انسان کو نہیں باز رکھا گیا؟ کیا انھیں رب العالمین کے کلام میں ذلک متاع الحیوٰۃ الدنیا والاٰخرۃ عند ربک للمتقین وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر الخ۔ المال والبنون زینۃ الحیوٰۃ الدنیا۔ والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا وخیر املا۔ اور واضرب لھم مثل الحیوٰۃ الدنیا جیسی آیات نظر نہیں آئیں۔ کلام الٰہی اگر دیکھتے تو ان کو دین کے یہ مقاصد کلام اللہ میں ضرور نظر آتے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ اور دیکھا ہے جس کو انھوں نے قرآن سمجھا ان کے نزدیک چونکہ قرآن اور انجن سازی کی فیکٹری میں کوئی فرق نہیں اس لئے انھوں نے کلام الٰہی کو انوار نبوت سے سمجھنے کے بجائے کسی مشین کی برقی کلوں اور پرزوں ہی کی حرکتوں سے سیکھا ہے۔

بہرحال ایمان و تقویٰ عمل صالح اصلاح اخلاق و معاش۔ مبدأ و معاد۔ جزاء و سزا کی تفہیم۔ فکر آخرت اور تزکیۂ باطن قرآن اسلام اور بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی منشاء و مقصد ہیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کو آنحضرت

؎ چنانچہ کہہ بیٹھے کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ثبوت کے لئے برق اور ان کے ہمنوا حضرات کی خرمن اسلام پر برق و شرر برسانے والی تحریرات کا ملاحظہ فرمایا جائے ۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے اغراض و مقاصد میں شمار فرماتے ہوئے کمالات سہ گانہ میں ان کا انحصار کر دیا گیا۔ تلاوۃ آیات۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس۔

حق تعالیٰ شانہٗ کتاب ہدایت کو پیغمبر ہادی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار نبوت کے واسطے سے سمجھنے کی توفیق اہل اسلام کو عطا فرمائے جس سے قرآن اور خدا کا صحیح منشا جان سکیں اور ان اصول کو اختیار کر کے اس کی رضا و خوشنودی کے مستحق بنیں۔

یہ تحریر ان اصول و قواعد کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ناچیز قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جن کے ذریعہ تفسیر کتاب اللہ اور تحریف کلام اللہ کا فرق نمایاں ہو سکے اپنی علمی بے بضاعتی قلت فہم اور قصور ہمت کے باعث اس بات کا معترف ہے کہ اصول تفسیر کی عظمت کے پیش نظر میری یہ کوشش جہد المقل دموعہ (کہ ناتواں کی کوشش اس کے چند آنسو ہیں) سے زیادہ کچھ اور حیثیت نہیں رکھتی۔ بارگاہ خداوندی میں اپنی تمام تقصیرات پر اظہار ندامت کے ساتھ اس کے عفو و کرم کا خواہاں ہوتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اس کو میرے لئے ذریعہ نجات و مغفرت بنائے اور مسلمانوں کو اس سے منتفع فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اللّٰھم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعہٗ وارنا
الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہٗ آمین
فالحمد للّٰہ اوّلًا وآخرًا ظاھرًا وباطنًا وصلی
اللّٰہ علٰی سیدنا ومولانا محمدٍ وآلہٖ واصحابہٖ
اجمعین

بندۂ ناچیز محمد مالک کاندھلوی غفرلہٗ

خادم حدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو اللہ یار (مغربی پاکستان)

یوم الجمعۃ بعد الفراغ من صلوٰۃ الجمعۃ ۱۹ ر ذی قعدہ ۱۳۸۰ ہجری